کلیاتِ میر

بترتیبِ جدید

مع مُقدمہ و فرہنگ

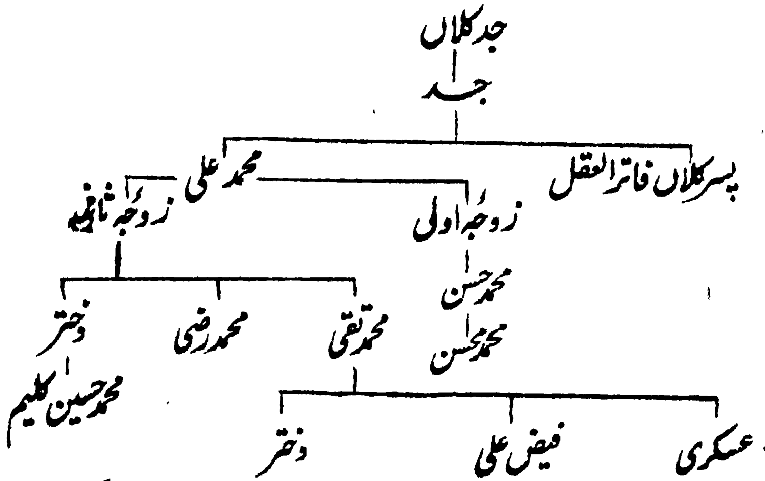
فہرست مضامین کلیاتِ میر تقی میر

مقدمہ

کلیات میر

از مصور درد مولوی عبدالباری صاحب آسی

شجرہ خاندان میر



میر صاحب کے پردادا مع اپنے قبیلہ کے حجاز سے ہندوستان پہونچے اور میر صاحب کے خود نوشتہ تذکرہ ذکر میر کے مطابق پہلے دکن میں ٹھہرے اور پھر کچھ مجبوریوں کی وجہ سے احمد آباد گجرات میں آکر مقیم ہوئے۔ مگر آب ودانہ کی کشش وہاں سے اکبرآباد لے آئی اور اسی سرزمین میں پیوند خاک ہوگئے ان کے دادا اکبرآباد میں فوجدار مقرر ہوئے اور پچاس برس کے سن میں وہ بھی رہنورد فنا ہوئے۔ دو لڑکے ان سے یادگار رہے ایک کو خلل دماغ تھا جن کو جوانامرگی نصیب ہوئی لہذا ان کا ذکر قابل حذف ہے۔ دوسرے میر صاحب کے والد جن کا نام محمد علی۔ یا عبداللہ تھا۔ اور علی متقی ان کے پیر کا بخشا ہوا لقب تھا۔

سیادت میر اُردو کے تذکرہ نویسوں میں میر صاحب کی سیادت کے متعلق اختلافات چلے آتے ہیں لہذا اُس پر جسٹس سر شاہ محمد سلیمان صاحب بالقابہ نے جو کچھ بحث وتمحیص فرمائی ہے میں اُسی کو



کیونکہ ذکر میر میں برابر اپنے والد کو علی متقی ۔ یا درویش یا عزیز مردہ کہکر حوالہ دیا گیا ہے کسی جگہ میر علی متقی مجھے نہیں ملا۔ صرف ایک جگہ میر محمد علی درج ہے۔ حقیقت میں علی متقی جب ان کا لقب تھا تو اسکے پہلے میر لکھنا ہرگز موزوں نہ ہوتا۔ نہ کوئی درویش صفت بزرگ خود اپنے کو ایسا کہلانا پسند کرتا۔ البتہ مضامین کے عنوان جو چھپے ہیں اُن میں میر علی متقی لکھا ہے۔ مگر مولوی عبدالحق نے اپنے مقدمہ میں خود تسلیم کیا ہے کہ یہ عنوان اصل میں موجود نہیں ہے اور وہ خود ان کے اضافہ کیے ہوئے ہیں مولوی مسعود حسن رضوی کے نسخہ میں بھی اس قسم کے عنوان موجود نہیں ہیں۔ اور نہ مولوی محمد شفیع کے نسخے میں ہیں۔

دوسرا دعوی دونوں صاحبوں نے یہ کیا ہے کہ اس کتاب میں میر نے اپنے والد کی زبانی اپنا نام میر محمد تقی لکھا ہے۔ اوّل تو اُن کے والد کی زبانی اسطرح پر خطاب کیا جانا مجھے نہیں ملا۔ دوم یہ کہ اگر ہو بھی تو تعجب خیز بات ہوگی کہ ایک صوفی منش درویش اپنے دس سال کے بیٹے کو میر محمد تقی کہہ کر پکارے۔ یہ صحیح ہے کہ میر نے اپنے کو اور دوسروں کی زبانی بھی میر محمد تقی لکھا ہے۔ مگر واضح رہے کہ یہ کتاب اُنھوں نے ساٹھ سال کی عمر میں لکھی تھی جب وہ خود میر مشہور تھے۔ نہ تو وہ اقوال جو اُنھوں نے اپنے والد یا سید امان اللہ کے نقل کیے ہیں لفظ بہ لفظ اصلی ہو سکتے ہیں۔ نہ اس کی اُمید کی جا سکتی ہے کہ دس سال کی عمر میں جو کچھ اُنھوں نے کانوں سے سُنا اُسے بجنسہ بعد کو قلمبند کیا۔ جب تخلص میر تھا تو میر صاحب مشہور ہو جانا مشکل نہ تھا۔ اور اگر حقیقت میں وہ سید نہ تھے اور سید بن بیٹھے تو ذکر میر میں اپنے کو میر لکھنا بھی کوئی غیر قابل قیاس بات نہیں ہو سکتی۔ لیکن اگر ذکر میر میں جیسا لکھا ہے صحیح ہے کہ میر دس سال کے تھے جب اُنکے والد نے انتقال کیا تو یہ قصہ کہ اُن کے والد نے اُن کو متنبہ کیا تھا کہ میر تخلص کرنے سے سید بنجاؤگے ناقابل یقین ہوگا تحقیق صرف یہاں تک ہے کہ میر اپنے کو سیّد ضرور کہتے تھے اور سیّد مشہور تھے اسی کے ساتھ کچھ لوگوں نے ہجو میں اُن کی سیادت پر شبہ کیا۔ اب اتنے زمانے کے بعد کہ درحقیقت میر سید تھے یا جیسا اکثر لوگوں نے اس زمانے میں کہا سید بن بیٹھے تھے مشکل ہے"

مندرجہ بالا خیالات اور فیصلوں سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ فاضل مضمون نگار کو مولانا آزاد کے خیال یا اُن کی بیان کی ہوئی روایت سے کہ میر صاحب سید نہ تھے ایک حد تک اتفاق ہے پھر بھی مولانا آزاد ہی کا یہ جملہ کہ سیادت میں شبہ نہ کرنا چاہیئے۔ اگر وہ سید نہ ہوتے تو خود کیوں کہتے۔ اُن کے پہلے خیالات کی تردید کے لیے بہت کافی ہے۔ اس پر میر صاحب کا

نقل کیے دیتا ہوں۔ اہل نظر اس سے نتیجہ نکال سکیں گے۔

"ان کے نسب کے متعلق آزاد نے لکھا ہے کہ یہ شرفائے اکبر آباد سے تھے۔ اپنے کو سید کہتے تھے لیکن اُن کے زمانے میں کچھ لوگ اس دعوے پر حرف زن تھے۔ تذکرہ شورش میں ہے کہ خطاب سیادت اُن کو شاعری کی درگاہ سے عطا ہوا۔ اور آبحیات میں آزاد نے لکھا ہے کہ چند کہن سال بزرگوں سے سُنا گیا کہ میر کے والد نے اُن کو متنبہ کیا تھا کہ میر تخلص کرنے سے سید بنجائیں گے۔ اسکے بعد سودا کا ایک شعر آزاد نے نقل کیا ہے جو کلیات میں نہیں پایا جاتا اور وہ میر کی شرافت کی ہجو میں ہے ؎

بیٹھے تنور طبع کو جب گرم کر کے میر — کچھ شیر مال سامنے کچھ نان کچھ پنیر

سودا کا ایک دوسرا شعر جو مشہور ہے اور جس میں میر ہی کے خاندان کی طرف اشارہ ہے یہ ہے۔ ؎

میری کے اب تو سارے مصالح ہیں مستعد — بڈیا تو گندنا بنا اور آپ کو کھمیر

بلا کسی شہرت یا بنیاد کے ذات پر حملہ کرنا ایک تعجب خیز بات تھی۔ زمانہ حال کے تمام نکتہ چین آزاد کے اس شبہ کرنے پر مضحکہ کرتے ہیں اور دلیل میں یہ پیش کرتے ہیں کہ میر ہمیشہ اپنے کو سید کہتے تھے اور ذکر میر میں بھی اپنے کو میر لکھا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کا لقب میر مشہور تھا۔ لکھنؤ میں ان کو سب سید یقین کرتے تھے اور خود میر نے اپنے کو برابر سید لکھا ہے۔

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں — اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی

لیکن مطبوعہ ذکر میر میں بھی میر نے اپنے کو سوائے میر تقی لکھنے کے صاف طور پر سید ہونے کا دعویٰ نہیں کیا ہے۔ اپنے دادا یا پردادا کا نام ظاہر نہیں کیا ہے۔ اپنے والد کو بھی سید نہیں لکھا ہے۔ اور نہ اپنے بھائیوں میں سے کسی کو میر یا سید کے لقب سے یاد کیا ہے۔ بخلاف اس کے غیروں کو مثلاً امان اللہ، تکمل خاں اور سعادت علی خاں کو سید لکھا ہے۔ البتہ مولوی مسعود حسن رضوی کے نسخے میں حقیقت حال مصنف کے زیر عنوان اپنے متعلق یہ لکھا ہے کہ "کسے فقیر و شاعر و متوکل دانستہ بطریق نذر چیزے می فرستد۔ مولوی عبدالحق نے اپنے مقدمہ[۱] میں یہ لکھا ہے کہ میر صاحب نے ذکر میر میں ہر مقام پر اپنے والد کے نام کے ساتھ میر کا لفظ لکھا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ میر صاحب اپنے والد کو ہر جگہ میر علی متقی لکھتے ہیں اسی سے مولوی محمد عسکری نے بھی نقل کیا ہے لیکن ایسا لکھنا نہایت تعجب خیز ہے

---

[۱] مقدمہ ذکر میر

مطابق سنہ ۱۲۰۸ھ عمر قرار پائی ہے اور یہ صحیح بھی ہے۔ مگر اُن کے سنہ ولادت میں بڑے اختلافات ہیں اور ان میں بہت سے قیاسات سے کام لیا گیا ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ اُن کی عمر اور اُنکی مدت حیات واقعی طور پر معلوم نہیں ہو سکی۔ مولانا آزاد مرحوم نے سو برس جس کے رو سے سنہ ۱۱۲۵ھ میں اور تذکرہ جہاں میں اسّی برس عمر بتائی ہے جسکے رو سے سنہ ۱۱۴۵ھ میں ولادت قرار پاتی ہے۔ اسی طرح مصحفی نے اپنا تذکرہ جو سنہ ۱۲۰۹ھ میں لکھا ہے اُن کی عمر اسّی سے متجاوز بتائی ہے۔ اگر بارہ سو نو سے اسّی نکال دیں تو سنہ ۱۱۲۹ھ سنہ ولادت مانا جا سکتا ہے۔ مگر ان سب پر جب ناقدانہ نگاہیں پڑی ہیں تو قیاس صحت اور اصلیت سے زیادہ قریب ہو گیا ہے چنانچہ مولوی عبدالحق نے روایت و درایت کو ملاتے ہوئے سنہ ۱۱۳۷ھ سنہ ولادت قرار دیا ہے۔ مگر اس پر بھی تنقید کی گئی اور سر شاہ سلیمان صاحب نے سنہ ۱۱۳۶ھ کو صحیح مانا ہے۔ مگر اب کہ واقعات صحیح طور پر معلوم ہو گئے ہیں اِن قیاس آرائیوں کی ضرورت نہیں۔ جیسا کہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

عالی جناب راجہ صاحب محمود آباد دام اقبالہ کی لائبریری میں میر صاحب کے ایک دیوان چہارم کا قلمی نسخہ موجود ہے جسکی خصوصیات یہ ہیں۔

(۱) یہ دیوان خود میر صاحب مغفور و مرحوم نے اپنے شاگرد محمد محسن المخاطب بہ زین الدین احمد کو اپنے ہاتھ سے عنایت فرمایا۔

(۲) یہ دیوان میر حسن علی تجلی داماد میر مغفور کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ جو غالباً میر صاحب کے ایماء سے لکھا گیا۔ اور جب میر صاحب نے دیکھا کیونکہ وہ اُن کے پاس نہ ہوتا تو وہ محمد محسن کو کیونکر دیتے۔

(۳) اس دیوان پر میر صاحب کے کچھ سوانح حیات ہیں جن سے بہت سی ایسی باتوں پر روشنی پڑتی ہے جو اب تک تذکرہ نویسوں کی نظر سے مخفی تھیں۔

(۴) اس پر بعض شاہانِ اودھ کی مہریں ہیں جن سے صاف صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ شاہی کتب خانوں کی زینت رہ چکا ہے۔

(۵) اس دیوان میں کچھ غزلیں زیادہ ہیں۔ اور ایک مثنوی بھی ہے جو اب تک کسی دوسرے دیوان میں نظر نہیں آئی۔

اس دیوان کے ٹائیٹل کے صفحہ پر جو سادہ ہے محمد محسن کے ہاتھ کی لکھی ہوئی یہ

بار بار اپنے آپ کو سید بتانا۔

اے غیر میر تجھ کو گر جوتیاں نہ مارے	سید نہ ہووے پھر تو کوئی چمار ہووے
کب اقتدا ہو مجھ سے کسی کی سوائے میر	بندہ ہوں دل سے میں اُسی سیّد امام کا
سیّد ہیں میر صاحب درویش دردمند	سر رکھیے اُنکے پاؤں پہ جائے ادب ہے یہ
ذلیل ذات نہیں عشق میں کہ میر کو دیکھ	ذلیل کیسے ہیں اُن کی ہے گو کہ ذات بڑی
غیرت سے تنگ آئے غیروں سے لڑ مرینگے	آگے بھی میر سید کرتے گئے ہیں ساکا
در پہ سے تیرے اب کے جاؤں گا تو جاؤں گا	یاں پھر اگر آؤں گا سیّد نہ کہاؤں گا
منکر نہیں ہے کوئی سیادت کا میر کی	ذاتِ مقدس اُن کی یہی ذات ہو تو ہو
پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں	اس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی
(معاملاتِ عشق) جانتے تھے کہ ہے یہ دلدادہ	سیدِ خستہ خاک اُفتادہ
(در ہجو نااہل) رکھتی ہے میری شرافت اشتہار	گو یہ نا سید کہے۔ہے۔کیا چمار
(مختار سلطنت کی زبانی) تم بنی فاطمہ ہو ہم ہیں غلام	ہے غلامی تمھاری اپنا کام

اتنی شہادتوں کے علاوہ یہ شہادت بھی ہے کہ جب خواجہ محمد باسط نے ان کو نواب امیر الامرا صمصام الدولہ کے سامنے بغرض ملازمت پیش کیا تو انھوں نے سوال کیا کہ "ایں پسر از کیست" اس پر اُنھوں نے جواب دیا کہ "از میر محمد علی است"۔ مگر ان سب باتوں کے باوجود ہمارے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہے اگر کہنے والا کہہ دے کہ میر صاحب سیادت کے مدعی تھے اور یہ سب باتیں میر صاحب ہی کی بیان کی ہوئی ہیں ان پر اعتماد کیا ہو سکتا ہے۔

مگر ہاں اس بات سے انکار نہیں ہو سکتا کہ میر صاحب کے والد بزرگوار اُس وقت کے ایسے باکمال بزرگوں میں تھے کہ اُن کے ملنے اور اُن کی دست بوسی کرنے کے بڑے بڑے لوگ آرزومند رہتے تھے۔ اُن کے کمال روحانی کے متعلق میر صاحب نے اپنے تذکرہ ذکر میر میں کئی حکایتیں بیان کی ہیں۔ جن کا یہاں ذکر کرنا تطویل کا باعث ہوگا۔ مگر یہ بتا دینا ضروری ہے کہ وہ شاہ کلیم اللہ اکبر آبادی کے مرید تھے۔ اور بیرون شہر متصل عیدگاہ سکونت گزین تھے۔

ولادت میر اسوقت تک میر صاحب کی سوانحعمری کے متعلق جتنے مضمون نکلے ہیں اُن میں ناسخ مرحوم کے اس مصرع تاریخ سے ۵ واویلا مُرد شہ شاعران + تاریخ وفات ۱۲۲۵ھ

سے بھی تائید ہوتی ہے جو اس کتاب کے ایک دوسرے صفحہ پر نوادر الکلا سے نقل کی گئی ہے "کہ
در اواخر یک ہزار و یک صد و سی و پنج ہجری ولادت واقع شدہ"

تربیت میر | میر صاحب نے اپنی تعلیم و تربیت کے متعلق کوئی تفصیلی اور واضح بیان نہیں دیا۔
مگر کچھ واقعات ہیں جن سے پتہ چل جاتا ہے۔ ان کو ذرا پھیلا کر لکھنے کی ضرورت ہے۔

ہم اپنے مضمون میں بیان کر چکے ہیں کہ میر صاحب کے والد ایک باکمال صوفی تھے جن سے
اکثر خرق عادات کی سی باتیں بھی سرزد ہوتی تھیں۔ چنانچہ ان واقعوں میں سے ایک واقعہ
یہ بھی ہے۔

ایک مرتبہ میر صاحب کے والد گھر میں مضطرب و سراسیمہ سے آئے۔ بڑھیا ماما سے کہا
کہ کچھ کھانے کی چیز گھر میں ہو تو لاؤ۔ وہ بولی کہ گھر میں تو کوئی سامان نہیں ہے۔ بازار جاتی ہوں
وہاں سے سودا سلف لاؤں تو کچھ پکاؤں۔ بڑھیا کچھ آٹا دال وغیرہ لے کر پلٹی تو اُنھوں نے
کھانے کے تیار کرنے کے لیے جلدی مچائی۔ بڑھیا بگڑ کر بولی کہ صاحب فقیر ہو تو فقیری کے
انداز سیکھو صبر کرو۔ درویشی کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ بڑھیا کا کہنا تیر کا کام کر گیا۔ اُس
سے تو کچھ نہ کہا۔ لیکن اُٹھے آنسوؤں سے بھیگا ہوا رومال اُٹھایا۔ اور چلنے لگے۔ ماما بیچاری
ڈر گئی۔ دوڑ کے ان سے لپٹ گئی۔ اور پوچھا کہاں چلے۔ بیٹھو۔ اُنھوں نے جواب دیا۔ کچھ حرج
نہیں۔ تم میرے لیے کھانا پکاؤ میں ذرا لاہور میں ایک درویش سے مل آؤں ابھی واپس آتا ہوں۔
بڑھیا نے بہتیرا سمجھایا بجھایا مگر وقت ہاتھ سے نکل چکا تھا اب کیا ہو سکتا تھا۔ مجبور چپ ہو رہی۔
اور یہ چل کھڑے ہوئے۔ نہ پاس ساز نہ سامان۔ نہ زاد راہ۔ نہ روپیہ نہ پیسہ۔ مگر توکل بر اللہ آخر کار
لاہور پہونچ ہی گئے۔ جس درویش کی ملاقات کا شوق کھینچ کر لے گیا تھا۔ اُس سے دریائے راوی
کے کنارے پر ملاقات ہوئی۔ اور اُس سے کچھ صحبت برآر نہ ہوئی تو یہ پلٹ کر دلّی آئے۔
یہاں آ کر میر قمر الدین منت خلف میر عبد الرشید عزّت کے یہاں فروکش ہوئے۔ یہ زائرین
اور معتقدین کے ہجوم کو برداشت نہ کر سکے راتوں رات دلّی سے چل کھڑے ہوئے۔ اور دو
تین روز کے سفر کے بعد بیانہ پہونچے۔ یہاں ایک نوجوان سید زادے پر اُن کی جاذبانہ نگاہ
نے ایسا اثر ڈالا کہ وہ آسیب زدوں کی طرح بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ لوگوں نے یہ حالت
دیکھی تو ان کی منت سماجت کی کہ اس پر مہربانی فرمائیے۔ انھیں بھی کچھ رحم آ گیا۔ تھوڑا سا
پانی لیا۔ اس پر کچھ پڑھ کر دم کیا۔ اس میں سے کچھ منہ پر چھڑکا کچھ پلایا۔ جوان کو ہوش آیا تو مؤدبانہ سامنے

عبارت موجود ہے۔

"بروز جمعہ بستم شعبان المکرم وقت شام ۱۲۲۵ھ یکہزار و دوصد و بست و پنج ہجری بود کہ میر محمد تقی صاحب میر تخلص صاحب این دیوانِ چہارم در شہر لکھنؤ در محلۂ سٹہٹی بعد طے نہ عشرۂ عمر بجوار رحمت ایزدی پیوستند۔ و بروز شنبہ بست و یکم ماہ مذکور سمہ الیہ وقت دوپہر در اکھاڑہ بھیم کہ قبرستان مشہور است نزد قبور اقربائے خویش مدفون شدند و چہار دیوانِ خود را کہ این دیوانِ چہارم ہم از انجملہ است بہ محررِ سطور محمد محسن المخاطب بہ زین الدین احمد تجاوز اللہ عن سیاتہ در حینِ حیاتِ خویش بکمال رغبت بحل کردہ بخشیدند۔ خدایش بیامرزاد"۔

تاریخ وفات نثر میں لکھکر دو قطعۂ تاریخ نظم بھی درج کر دیے ہیں جو ذیل میں درج ہیں۔

قطعۂ تاریخ نمبر ۱

محمد تقی میر شاعر کہ بود | مسلّم ورا تخت و تاجِ سخن
باقلیم معنی ز اربابِ شعر | ستانندہ او بود باجِ سخن
ز مرگش چو بے نور شد شہر سال | نوشتم بمردہ سراجِ سخن

سنہ ۱۲۲۵ھ

(۲) تخرجہ

میر تقی استادِ فنِ شعر | مرد و ز دنیا سوئے عدم شد
گشت چو اشعارش ہمہ بے سر | میر تقی استاد رقم شد

سنہ ۱۲۲۶ھ

بارہ سو چھبیس میں پہلے مصرع کے اشارے گشت چو اشعارش ہمہ بے سر۔ کے مطابق اشعار کا الف نکالنے سے ۱۲۲۵ھ رہجاتے ہیں۔ اس نسخہ کے ایک صفحہ پر نوادر الکملا کی عبارت بھی درج ہے جو آگے چلکر حسب ضرورت نقل کی جائے گی مگر فی الحال سنہ ولادت کے تعین کے جھگڑے کو صاف کر دینا ہے کہ اس عبارت کے دیکھنے کے بعد ہم کو کوئی شبہ باقی نہیں رہتا کہ میر صاحب نے ۹۰ برس کی عمر پائی اور ۱۲۲۵ھ میں سے جب نوے منہا کر دیجیے تو ۱۱۳۵ھ باقی رہے اور یہی سنہ ولادت ہے۔ اور اسی کی ایک دوسری عبارت

می پرورد۔ چنانچہ روز و شب با او میماندم و قرآن شریف بخدمت او میخواندم"
میر صاحب ان بزرگ کے سایۂ عاطفت میں تقریباً تین سال تک رہے۔ جب ان کی عُمر دس برس کی ہوئی تو سید امان اللہ کو حکم قضاؤ قدر نے ان سے ہمیشہ کے لیے جُدا کر دیا۔ اسی لیے قیاس چاہتا ہے کہ جب یہ سات برس کی عمر میں قرآن شریف پڑھتے تھے تو دس برس کی عُمر میں قرآن شریف کے علاوہ رسمی درسیات کی کتابیں بھی پڑھی ہونگی اور کچھ نہ کچھ سیکھ گئے ہونگے۔ اسکے علاوہ چونکہ اپنے عم بزرگوار سید امان اللہ کے ساتھ اکثر کاملین کی صحبت میں جاتے تھے اور انکی باتیں سنتے اور یاد رکھتے تھے تو اس میں شبہ نہیں ہو سکتا کہ اُن کو کچھ ادراک شعور بھی حاصل ہو گیا ہو گا۔ پھر سید امان اللہ کی وفات کے بعد انھیں کچھ نہ کچھ وقت ایسا بھی ملا جسمیں اپنے والد بزرگوار کا فیض تربیت حاصل کیا۔ جیسا کہ اُن کی خود نوشتہ سوانحعمری ذکر میر کی اُن نصیحتوں سے معلوم ہوتا ہے، جو ان کے والد نے تلقین صبر کے لیے کیں۔ بلکہ اُنھیں سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ میر علی متقی اُن کو اسوقت ذی شعور سمجھتے تھے۔ چنانچہ میر صاحب کا بیان ہے کہ میں سیّد امان اللہ کی بیوقت موت سے بہت رنجیدہ رہتا تھا تو میرے والد مجھکو یہ کہکر سمجھاتے تھے۔

"کہ اے پسر من ترا بسیار میخواہم۔ اما ازیں غم می کاہم کہ من نیز بر سر راہم۔ گاہ میگفت کہ ماہ من نہ طفل ہالہ۔ الحمدللہ کہ دہ سالہ۔ چہ بہ کاہش اُفتادۂ آخر درویش زادۂ۔ دل قوی دار۔ خود را بخدا سپار۔"

مگر ان سب باتوں کے باوجود بھی یہ کہنا پڑتا ہے کہ اُن کی تعلیم نامکمل تھی۔ اور وہ ابھی درسیات رسمی تمام نہ کر چکے تھے کہ اُن کے والد کے انتقال کے سبب سے اُن کی جان پر قیامت گزر گئی۔ اُنھوں نے ذکر میر میں اس واقعۂ فاجعہ کو یوں بیان کیا ہے۔

وفات میر علی متقی ایک روز میر علی متقی کو اپنے ہمشیرزادہ محمد باعث کی عیادت کے لیے بیرون شہر پناہ سے شہر کے محلہ عالم گنج تک پیادہ پا دھوپ میں جانا پڑا۔ دن بھر وہاں رہے اور شام کو وہاں سے پلٹ کر اپنی مسجد میں نماز پڑھی۔ فراغت نماز کے بعد بستر استراحت پر دراز ہوئے۔ اتنے میں میر صاحب پہونچے تو فرمایا کہ آج معلوم ہوتا ہے کہ دھوپ کی شدت اور گرمی نے نقصان پہونچایا ہے۔ سر میں درد بھی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ بخار ہو جائے گا۔ اسیوجہ سے شب کو بغیر کچھ کھائے پیے سو گئے۔ صبح کو بہت تیز بخار ہو گیا۔ انکے قدیم معالج ابوالفتح نے علاج کیا مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ بخار ٹھہر گیا۔ اور روزانہ شام کو تیز ہونے لگا۔ ایک مہینہ کے بعد معالج

بیٹھ گیا۔ اور پھر لجاجت کے ساتھ التجا کی کہ چند روز غریب خانے پر قیام فرمائیے۔ اُنھوں نے یہ کہہ کر منظور کر لیا کہ خیر۔ مگر میں مستعد سفر ہوں۔ لوگوں نے کہا کہ جسوقت جو مرضی مبارک ہوگی اُس پر عمل کیا جائے گا۔ بس اتنا ہے کہ چلیے کچھ ماحضر نوش فرمائیے اور عزّت بڑھائیے اُنھوں نے پھر کہا کہ ہم لوگ کبھی کسی سے خوش ہیں کبھی ناخوش ہم سے کوئی متعرض نہ ہو ؎

بگفت احوالِ ما برقِ جہان ست دمے پیدا و دیگر دم نہان ست
گہے بر طارمِ اعلےٰ نشینیم گہے بر پشتِ پائے خود نہ بینیم

سب نے یکزبان ہوکر عرض کیا کہ آپ کیا فرماتے ہیں ہم سب خادم ہیں کبھی ایسا نہ ہوگا غرضکہ عہد لیکر وہاں گئے۔ اتفاق کی بات کہ اسی روز اس نوجوان کی شادی تھی۔ لوگوں نے ان سے بھی شرکت شادی کی درخواست کی اُنھوں نے کہا فقیر کو ان جھگڑوں سے کیا مطلب۔ بعدہ نوجوان سے کچھ تجرد اور ترک ماسوا کی باتیں کیں۔ اُدھر برات گئی۔ اور اودھر یہ رخصت ہوکر اکبرآباد آپہونچے۔ یہ تو چلے ہی آئے۔ مگر اُدھر جب برات واپس آئی تو دولھا کو ان کے چلے جانے کا حال معلوم ہوا۔ دنیا نگاہوں میں تیرہ و تار ہوگئی۔ دل طپاں۔ جذبِ حقیقی دامن کشاں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بیچارے نے گھر پر پانی تک نہ پیا۔ نئی نویلی دولھن کو چھوڑ چھاڑ تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ کئی روز تک جنگلوں میں خاک چھانتا آہ و فریاد کرتا پڑا پھرا۔ ہر شخص سے فقیر کا پتہ پوچھا۔ مگر حاصل کچھ نہ ہوا۔ آخر "خدا خود میر سامان است ارباب توکل را" ایک دن کوئی خضر راہ مل گیا۔ اور اُسکو انتہائی سراسیمہ دیکھ کر رحم کھاکر پوچھا۔ کسے ڈھونڈھتا ہے۔ اُس نے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اپنا مطلب ادا کیا۔ اُس نے کہا جا سیدھا اکبرآباد چلا جا۔ علی متقی وہیں ہیں ڈھونڈھ لے۔ یہ سُنکر غریب پوچھتا پاچھتا اکبرآباد آیا۔ اور منزل مقصود تک پہونچ گیا اُنھوں نے تسلی دیکر وہیں ٹھہرا لیا۔ پھر یہانتک سلسلۂ موانست مستحکم ہوا کہ علی متقی اسکو برادر عزیز کہنے لگے۔ یہی نہیں بلکہ تمام سیاہ و سپید کا اسی کو مالک کر دیا۔ اس شخص کا نام سید امان اللہ تھا۔ جو بعد کو علی متقی کی نظر فیض اثر سے درویشی کے مقام اعلیٰ تک فائز ہوا یہی وہ ذات ہے جو میر صاحب کی تربیت و تعلیم کی اولین ذمہ دار ہے۔ میر صاحب کی عمر اسوقت سات سال کی تھی۔ چنانچہ خود لکھتے ہیں۔

"من دراں ایام ہفت سالہ بودم۔ باخودم مانوس ساخت و درگریبانم انداخت یعنی با مادر و پدرم نہ گزاشت و بفرزندی خویشم برداشت۔ لمحۂ از خود جدایم نمی کرد و بنازم نعیم

امور کا متکفل کر کے خود تلاش معاش میں پھرنا اپنی خودداری اور غیرت کو کام میں لانا اور کسی سے کوئی امداد نہ چاہنا۔ اور مزید براں یہ کہ اپنے عم مرحوم یعنی سید امان اللہ کے ساتھ اکثر درویشوں اور خدا رسیدوں کی صحبت میں جاکر فیض صحبت اٹھانا۔ یہ سب باتیں ایسی نہیں ہیں جو ایک دس بارہ برس کے بچے کے لیے موزوں ہوں۔ سر شاہ سلیمان صاحب کا خیال ہے کہ میر صاحب نے اپنی اُسوقت کی عمر کا اندازہ صحیح نہیں کیا۔ میں بھی اسی کی تائید کرتا ہوں۔ ورنہ پھر ایک اور بھی قباحت پیدا ہوتی ہے کہ میر صاحب ذکر میر میں تحریر فرماتے ہیں۔

"خدائے کریم مرا شرمندۂ احسان کسے نہ کرد۔ و دست نگر برادر کہ سر بہ سر من داشت نساخت۔ نقل ماتم در دلش قسمت ساختم۔ کار را بہ لطفِ خداوند انداختم۔ دم خود را بہ برادر خورد سپردہ بہ تلاش روزگار در اطراف شہر اُستخواں شکستم۔ لیکن طرفے نہ بستم۔ یعنی چارۂ کار در وطن نیافتم۔ ناچار بغربت شتافتم۔ رنج راہ بر خود ہموار کردم شدائد سفر اختیار کردم۔ بہ شاہجہاں آباد دہلی رسیدم۔ بسیار گردیدم شفیقے نہ دیدم۔"

اس عبارت سے صریحی طور پہ یہ بات ثابت ہے کہ یہ رسوم دنیوی موتے کے ادا کرنے کے بعد ہی فوراً اکبر آباد سے چل کھڑے ہوئے۔ یا زیادہ سے زیادہ کچھ دنوں اپنے وطن مالوف میں سرگرم تلاش معاش رہے۔ اس کے بعد دہلی پہونچے۔ حالانکہ درایت و قیاس کبھی اس امر محال کے تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہے کہ ایک دس گیارہ برس کا بچہ اکبر آباد سے دہلی تک کا اس زمانہ میں سفر کرے کہ قافلے لٹتے تھے۔ راستے محفوظ و مصئون نہ تھے۔ قدم قدم پر خون بہائے جاتے تھے۔ پھر یہ سب کچھ بھی ہوتو اسوقت ان کے اعزا و قریب نے کیونکر ان کو اس دور و دراز مسافت طے کرنے کی اجازت دی۔

میرے اس بیان کی تائید اُس تحریر سے بھی ہوتی ہے جو اُس نسخہ کے ایک صفحہ پر لکھی ہے جس کا میں ابھی حوالہ دے چکا ہوں اور جو کسی کتاب نوادر الکلام سے نقل کیگئی ہے۔ "بعد واقعۂ ہائلہ پدر بزرگوار بہ عمر ہفدہ سالگی در دہلی رفت"۔ سترہ نہ سہی تو یہ اپنے والد کے انتقال کے وقت تیرہ چودہ برس کے ضرور تھے۔ کیونکہ جب اُن کا انتقال ہوگیا اور یہ ضروری رسوم سے فراغت حاصل کر چکے تو اُنھوں نے گھر کا کاروبار اپنے چھوٹے بھائی کو سونپا اور خود اکبر آباد یا نواح اکبر آباد میں دو ڈھائی یا تین برس تک تلاش معاش میں پھرتے رہے۔ جب یہاں کوئی صورت نہ نکلی تو دلّی کا رُخ کیا۔ پھر اگر درایت

اس میچے پر پہونچے کہ بخار ہڈیوں میں اثر کر گیا۔ جب مرض نے بہت زیادہ ترقی کی تو غذا بھی چھوٹ گئی۔ اور آخرکار مریض اور تیمارداروں کو اُمید شفا باقی نہ رہی۔ ایک روز میر صاحب اور ان کے بڑے بھائی محمد حسن کو بلایا اور فرمایا کہ میں ایک فقیر ہوں۔ میرے پاس نہ روپیہ نہ پیسہ نہ سامان نہ جائداد۔ البتہ تین سو جلدیں کتابوں کی ہیں۔ لاؤ انھیں کو دونوں بھائیوں میں تقسیم کردوں۔ محمد حسن نے کہا کہ آپ کو معلوم ہے کہ میں طالب علم ہوں اور کتابیں صرف میرے ہی کام آسکتی ہیں۔ محمد تقی سوائے اسکے کہ ضایع کردے اور کیا کریگا۔ انھوں نے مطلب سمجھ لیا۔ اور کہا خیر ہم سمجھ گئے۔ یاد رکھو کہ اللہ غیور ہے اور غیور کو دوست رکھتا ہے۔ محمد تقی تمھارا دست نگر کبھی نہ ہوگا۔ زیادہ ستاؤگے تو اُسکی سزا پاؤ گے۔ وہ تمھیں کیفر کردار کو پہنچا یگا اور سمجھ لو کہ اُسکے سامنے تمھارا چراغ ہرگز ہرگز جل نہیں سکتا ہے۔ اسکے بعد میر صاحب کیطرف متوجہ ہوئے اور کہا کہ میں بازار کے بنیوں کا تین سو روپیہ کا مقروض ہوں۔ جب تک وہ ادا نہ کرو میری تجہیز و تکفین نہ کرنا۔ میر صاحب نے کہا کہ گھر کا اثاثہ تو صرف یہی کتابیں تھیں جو بھائی جان کی ملک میں آگئیں۔ اب ادائے قرض کی مجھ سے کیا سبیل ہوگی۔ انھوں نے کہا کہ گھبراؤ مت۔ خدا کارساز ہے۔ ہنڈی راستہ میں ہے۔ روپیہ آتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ میرے سامنے ہی آجائے۔ مگر موت قریب تر ہے اور فرصت کم لہٰذا خدا حافظ۔

شفیق باپ کے انتقال کے بعد میر صاحب پر جو قیامت گزری اسکا اظہار دوسرے لوگوں کے لیے بھی سامان سوہان روح سے کم نہیں۔ ایک لاوارث مفلس غریب بچہ اور اُسپر قرض خواہوں کا تقاضہ۔ تنہائی۔ اسپر بھائی کی بے اعتنائی۔ غرض مصائب گوناگوں کا ایک سمندر تھا جو موجیں مار رہا تھا۔ مگر یہ اسکی ہمت تھی یہ کسی کے سامنے دست سوال دراز نہیں کیا۔ امداد غیبی کا منتظر رہا۔ اور آخرکار یہ سب ابتدائی مشکلات خدا نے حل کردیں۔

سید امان اللہ کے انتقال کے وقت میر صاحب دس برس کے تھے۔ تو والد کے انتقال کے وقت دس مہینے زیادہ سے زیادہ اور گزر چکے ہوں گے۔ کیونکہ سید امان اللہ عید کے مہینے میں راہی عدم ہوئے اور والد رجب کے مہینے میں عالم باقی کو سدھارے۔ مگر یہاں ایک ایسی گتھی پڑجاتی ہے جو سلجھائے نہیں سلجھتی۔ میر صاحب سے میر صاحب کے والد مرحوم کی باتیں اور وصیتیں اور قرضداروں کا مطالبہ۔ میر صاحب کا رسوم موتے کو ادا کرنا۔ اور تمام معاملات کو طے کرنا۔ اسکے بعد اپنے بھائی کو خانہ داری کے

پیچھا نہیں چھوڑتی۔ ع بہر زمیں کہ رسیدیم آسماں پیداست ،، یہ اطمینان مستقل نہ رہ سکا۔ کوئی ایک ہی برس بعد ۱۱۵۱ھ میں امیر الامرا صمصام الدولہ نادرشاہ کے ہنگامہ و آشوب میں مارے گئے اور یہ پھر بیکار اور پریشان روزگار ہو گئے۔

سر شاہ سلیمان صاحب نے دیباچہ مثنویات میر میں تحریر فرمایا ہے کہ میر صاحب دہلی چلے گئے اور سراج الدین علی خاں آرزو کے ساتھ رہنے لگے۔ میر صاحب کے بیان سے اسکا کوئی پتہ نہیں چلتا۔ پہلی مرتبہ خدا جانے وہاں رہے یا اور کہیں۔ مگر وہ کسی کے مہمان نہ تھے بلکہ اُن کا روزینہ جو مقرر ہو گیا تھا اُسی سے بسر اوقات کرتے تھے۔ جیسا کہ عبارت منقولہٗ بالا سے ظاہر ہے۔

اس انقلاب کے بعد وہ دہلی سے پھر اکبر آباد چلے آئے۔ اور غالباً یہاں کچھ قیام بھی کیا۔ مگر اسوقت ان کے ساتھ کوئی عزیز و قریب دوست و حبیب محبت کے ساتھ پیش نہیں آیا۔ خود کہتے ہیں کہ "کسانیکہ پیش درویش خاکپائے مرا کحل بصری ساختند کیبار از نظرم انداختند"۔ غرض کہ وطن میں اطمینان نصیب نہ ہوا۔ اور پھر دلی کی طرف چلے اور اس مرتبہ اپنے سوتیلے بھائی محمد حسن کے خالو سراج الدین علی خاں آرزو کے ساتھ رہنے لگے۔

میر صاحب کا دہلی میں دوسری مرتبہ قیام

میر صاحب کے والد کے انتقال کو اب عرصہ گزر چکا تھا۔ اور خیال ہے کہ بھائیوں عزیزوں قریبوں کی وہ کاوشیں بھی باقی نہ رہی ہو نگی جو اس تازہ تازہ واقعہ کے بعد خانگی نزاع۔ ترکے وغیرہ کے جھگڑوں کی وجہ سے ہوا کرتی ہے۔ پھر آخر کیا ہوا کہ ایکدم اعزا و اقربا تو جداُن لوگوں نے بھی ان سے آنکھیں پھیریں جو ان کے والد مرحوم کے جاں نثار تھے۔ اور جو کچھ بھی نہیں تو ان کو بڑے باپ کا بیٹا تو ضرور جانتے تھے۔ اگرچہ اُن کو ان کی امداد کرنا چاہیئے تھی۔ مگر امداد نہ کرتے تو کم از کم انکے دشمن تو نہ ہو جاتے۔ اسکے علاوہ یہ بات بھی آسانی سے سمجھ میں آنے والی نہیں کہ ان کے بھائی اگرچہ سوتیلے تھے۔ مگر وہ بھی آخر بزرگ زادے تھے حافظ تھے تعلیم یافتہ تھے۔ یکبارگی انسانیت اور ہمدردی کو چھوڑ کر کیوں ان سے بگڑ بیٹھے۔ اور پھر بگڑے تو ایسے بگڑے کہ دلی تک ان کا پیچھا نہ چھوڑا اور وہاں بھی اپنے خالو سراج الدین علی خاں آرزو کو یہ لکھ بھیجا کہ "میر محمد تقی فتنۂ روزگار است زینہار بہ تربیت او نہ باید پرداخت"۔ یہ ایک ایسی بات ہے جس پر امتداد زمانہ نے ایک نہایت تاریک پردہ ڈال دیا تھا۔ مگر مولوی عبد السلام نے شعر الہند میں تذکرۂ

نوادر الکلما کو صحیح مانئے تو سترہ برس کی عمر بھی ممکن ہے۔

دہلی کا پہلا سفر

میر صاحب ذکر میر میں کہتے ہیں کہ " بہ شاہجہاں آباد دہلی رسیدم بسیار گردیدم شفیقی نہ دیدم"۔ اس عبارت سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ پہلی مرتبہ دہلی جاکر یہ کہاں مقیم ہوئے۔ اتنا البتہ ہوا کہ خواجہ محمد باسط نے جو امیر الامرا صمصام الدولہ کے بھتیجے تھے اُن سے ان سے کسی طرح ملاقات ہوئی اور اُنھوں نے مہربانی کرکے انھیں امیر الامرا کے حضور میں پیش کیا اور امیر الامرا نے خواجہ باسط سے پوچھا کہ یہ لڑکا کون ہے، اُنھوں نے جواب دیا کہ میر محمد علی کے صاحبزادے ہیں۔ میر الامرا سمجھ گئے کہ میر محمد علی مرحوم ہو چکے ہیں۔ فوراً حکم دیا کہ ان کے مرحوم باپ کے بہت سے حقوق میرے ذمہ ہیں۔ ایک روپیہ روزانہ ان کو میری سرکار سے دیا جایا کرے۔ میر صاحب نے عرض کیا کہ جب بندگانِ حضور نے اتنا کرم فرمایا ہے تو اتنی اور عنایت فرمائی جائے کہ میری اس عرضداشت پر دستخط فرما دیے جائیں۔ یہ کہکر جیب سے درخواست نکالی اور پیش کردی۔ عیش پسند امرا کوتاہ قلم کاہل زبان ہوا ہی کرتے ہیں۔ اُنھوں نے ٹالنے کے لئے جواب دیا کہ "وقت قلمدان نیست" میر صاحب کو یہ سُن کر ہنسی آگئی۔ نواب نے متعجب ہوکر دیکھا اور پوچھا۔ کیوں ہنسی کیا ہے۔ ہنسے کیوں۔ انھوں نے بے باکانہ کہدیا کہ میں حضور کے اس فقرہ کا مطلب نہیں سمجھا کہ وقت قلمدان نیست۔ اگر آپ یہ فرماتے کہ دستخط کا وقت نہیں یا قلمدان بردار نہیں تو خیر ایک بات بھی تھی۔ مگر یہ تو عجیب انشاء ہے۔ قلمدان کوئی جاندار تو ہے نہیں وہ تو لکڑی ہے وقت اور غیر وقت کی پابندی اُس پر عائد نہیں ہوتی جس نوکر سے فرما دیجیے وہ لاکر حاضر خدمت کردے۔ بات معقول تھی سُن کے نواب کو بھی ہنسی آگئی اور اُسی وقت دستخط کرکے عرضی حوالے کردی۔ یہیں سے اس نکتہ کو سمجھ لینا چاہیئے کہ نہ خواجہ محمد باسط ایک بچے کی نواب کے سامنے پیش کرنے کی درخواست کرتے۔ نہ میر دس گیارہ برس کے ہوکر اُن کے اس فقرے پر اعتراض کر سکتے تھے۔ لامحالہ اُن کی عمر ضرور سترہ برس کی تھی۔ لیکن غالباً سترھواں برس شروع ہوا تھا۔ جس کا سبب آگے چل کر معلوم ہوگا مگر یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ میر صاحب کی لیاقت علمی اتنی ضرور تھی کہ وہ فارسی کے فصیح و غیر فصیح صحیح و غیر صحیح جملوں کا اندازہ کر سکتے تھے۔ معاش کی طرف سے میر صاحب کو گونہ اطمینان ہو گیا چنانچہ لکھتے ہیں "آں روزینہ می یافتم۔ نان و نمک می خوردم و بسر می بردم" مگر حرماں نصیبی کسی حالت میں

پس از قطعِ رہ لائے دلی میں بخت	بہت کھینچے یاں میں نے آزار سخت
جگر جورِ گردوں سے خوں ہو گیا	مجھے رُکتے رُکتے جنوں ہو گیا
ہوا خبط سے مجھ کو ربطِ تمام	لگی رہنے وحشت مجھے صبح و شام
یہ وہم غلط کاریاں تک کھنچا	کہ کارِ جنون آسمان تک کھنچا
نظر رات کو چاند پر گر پڑے	تو گویا کہ بجلی سی دل پر پڑے
مہِ چاردہ کارِ آتش کرے	ڈروں یاں تلک میں کہ جی غش کرے
نظر آئے اک شکل مہتاب میں	کمی آئے جس سے خور و خواب میں

احباب واعزا نے علاج معالجہ شروع کیا۔ خصوصاً فخر الدین خاں کی بیوی نے جو میر صاحب سے قرابت قریبہ بھی رکھتی تھیں۔ جھاڑ پھونک تعویذ گنڈے بھی کرائے اور اطبا سے بھی رجوع کی آخر کار ان کو صحت کاملہ ہو گئی۔

میر صاحب اور خان آرزو میں کشیدگی بڑھتی گئی۔ اور آخر کار ایک روز یہ اُن سے جُدا ہو گئے مولانا آزاد دہلوی نے آبحیات میں اس جدائی کو مذہبی رنگ دیدیا ہے۔ اور فرما گئے ہیں۔ "چونکہ خان آرزو حنفی مذہب تھے اور میر شیعہ اور نازک مزاج۔ اسی وجہ سے کسی مسئلہ پر بگڑ کر الگ ہو گئے۔" مولانا عبدالحق صاحب اور مولانا عبدالحیٔ مؤلف گل رعنا اس کو قبول نہیں کرتے۔ سر شاہ سلیمان صاحب کو اس کا ایک حد تک یقین ہے۔ اور وہ فرماتے ہیں کوئی خاص وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ اس خیال کو بالضرور غلط قرار دیا جائے۔

ایک شیعہ اور ایک سُنّی کے اختلاف مذہب اور اختلاف خیال سے انکار نہیں۔ ایسا ہوتا رہا ہے اور ایسا ہو سکتا ہے۔ مگر اس جگہ پر چند شبہات پیدا ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ میر صاحب دہلی میں دوسری مرتبہ تقریباً ۱۱۵۲ھ ہجری میں پہونچے ہیں۔ اور تذکرۂ نکات الشعراء ۱۱۶۵ھ میں لکھا ہے۔ جس میں جا بجا خان آرزو کا نہایت ادب سے ذکر کیا ہے۔ چنانچہ مرزا معز فطرت موسوی خاں کے حال میں انھیں استاد و پیر و مرشد بندہ لکھا ہے۔ ایک جگہ لکھا ہے کہ ایسا فاضل ہندوستان میں کوئی نہیں بلکہ ولایت میں بھی شبہ ہے۔ اب خان آرزو کے انتقال کو دیکھیے وہ ۱۱۶۹ھ میں فوت ہوئے۔ ذکر میر کو دیکھیے تو ۱۱۸۷ھ میں وہ تصنیف ہونا شروع ہوئی اور ۱۱۹۷ھ میں مع لطائف وغیرہ ختم ہوئی۔ اب خیال کیجیے کہ ۱۱۵۳ھ سے گیارہ سو ستر تک میر صاحب خان آرزو کی کوئی شکایت نہیں کرتے۔ ۱۱۶۹ھ میں خان موصوف کا انتقال ہو جاتا ہے تو وہ

بہارِ بیخزاں سے یہ عبارت نقل کر کے ایک حد تک اس رازِ سربستہ کو ظاہر کیا ہے۔

"بہ شہرِ خویش با پری تمثالے کہ از عزیزانش بود در پردہ تعشق طبع و میل خاطر داشت۔ آخرہ عشق او خاصیت مشک پیدا کردہ میخواست کہ بخیہ بہ چار سوئے رسوائی کند حسن بے پردہ بہ جلوہ گری در آید۔ از ننگ افشائے راز از وطن و اقربا با دوبے بغل پر دردہ حسرت و حرمان با خاطر ناشاد دست و گریبان۔ قطع رشتہ حبِ وطن ساختہ از اکبر آباد بعد از خانہ برانداز یہا بہ شہر لکھنؤ رسید و ہمیں جا بصد حسرت جانکاہ جلاوطنی و حرماں نصیبی از دیدار یار و دیا جاں بجہاں آفریں داد۔ تا بقید رشتۂ حیات بود طوقِ محبت در گردن و سلسلۂ دیوانگی بپا داشت۔"

اس بیان کو مکمل طریقہ پر نہ بھی مانا جائے تو بھی کئی ایک مفید باتیں سمجھ میں آ جاتی ہیں۔(۱) پہلی مرتبہ دہلی سے واپسی کے بعد میر صاحب کی عمر اتنی تھی کہ وہ تعلق خاطر اور تعشق پیدا کر سکیں (۲) ان کے بڑے بھائی کی ناراضی بیجا نہ تھی۔(۳) سراج الدین علیخاں آرزو جو ایک قدیم وضع کے بزرگ تھے اس آوارگی اور بد چلنی کو پسند نہ کر سکتے تھے۔ اور اس حالت میں اُن کی تلخ نوایانہ نصایح میر صاحب کے دل پر نشتر کا کام دے سکتی تھیں۔ اور یہ بات جدائی فیمابین کا سبب ہو سکتی تھی۔" بہر حال میر صاحب دوبارہ دہلی پہونچے اور اپنے سوتیلے خالو کے مکان پر مقیم ہوئے۔ اور اتنے دن رہے کہ شہر کے بعض کاملین سے اُنھوں نے کچھ کتابیں پڑھیں اور اس قابل ہو گئے کہ کسی پڑھے لکھے آدمی کے مخاطب صحیح ہو سکیں۔

یہ تحصیلِ علوم میں مشغول تھے اور گو کسی جگہ ان کا سلسلۂ معاش مستحکم نہ ہوا تھا کہ ان کے بھائی حافظ میر محمد حسن کا خط اپنے خالو یا ماموں آرزو کے نام پہونچ گیا جس میں انکی شکایتیں تھیں اور وہ اسکو پڑھ کر چراغ پا ہو گئے۔ اور ان پر متشددانہ تنبیہ کرنے لگے۔ عشق و محبت کا داغ بے روزگاری۔ پریشان حالی۔ رنج غربت۔ ان سب چیزوں نے ملکر دل و دماغ پر ایک خاص اثر کیا۔ اور آخر کار یہ مجنون ہو گئے۔ اور ان کو چاند میں ایک صورت نظر آنے لگی جس کا انھوں نے ذکر میر میں بھی مفصل ذکر کیا ہے۔ اور مثنوی خواب و خیال میں بھی وہی افسانہ بکھا گیا ہے مناسبتِ محل کے لحاظ سے ہم کچھ شعر نقل کر کے خود انھیں کی زبان سے آپ کو یہ پر لطف داستان سناتے ہیں۔

چلا اکبر آباد سے جس گھڑی	در و بام پر چشم حسرت پڑی

اورگردوپیش پر نظر ڈالتے ہوئے سرشاہ سلیمان صاحب نے اوائلِ شاعری کو مستثنیٰ کرتے ہوئے ان کے مذہبی معتقدات کے بارے میں یہ فقرے لکھے ہیں "اسی کے ساتھ اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ کم سے کم زمانہ عروج شاعری میں ان کا مذہب اہل تشیع کا تھا" یہ رائے بھی صرف اسی قیاس پر مبنی ہے کہ میر صاحب کی لکھی ہوئی منقبتیں اور مرثیے وغیرہ موجود ہیں۔

تکمیل تعلیم میر

یہ لکھا جا چکا ہے کہ ان کی تعلیم و تربیت کا زمانہ سیّد امان اللہ کے وقت سے شروع ہوا۔ پھر کچھ مدت تک اپنے والد بزرگوار سے فیض تربیت حاصل کیا۔ تا اینکہ دلی میں آئے تو ان کو انشائے فصیح اور غیر فصیح کا احساس تھا۔ مگر قیاس یہ چاہتا ہے کہ اوّل میں خود خانِ آرزو نے ان کی تربیت کی طرف توجہ کی۔ جیساکہ بقول میر اِن کے بھائی کے خط سے واضح ہوتا ہے۔ کہ "میر محمد تقی فتنۂ روزگار است زنہار بہ تربیتِ او نہ باید پرداخت"، دوسرے خود میر صاحب کا اقرار موجود ہے وہ تذکرہ نکات الشعرا میں اُن کو اُستاد و پیر و مرشد لکھتے ہیں۔ مگر جب ذکر میر لکھی جاتی ہے تو اُن کو یاد آتا ہے کہ میر جعفر پٹنے کے رہنے والے اُن کے اُستاد تھے جو روزانہ اُن کو پڑھانے آتے تھے۔ حالانکہ غور کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی خانِ آرزو ہی کے یہاں آتے تھے۔ کیونکہ میر صاحب اس واقعہ کا اسطرح ذکر فرماتے ہیں کہ میں ایک روز بازار میں ایک کتاب کا جز لیے بیٹھا تھا۔ ایک جوان شخص میر جعفر اسطرف سے گزرا مجھے دیکھا۔ اور بیٹھ گیا۔ اور از راہ قیافہ شناسی کہنے لگا کہ معلوم ہوتا ہے تم علم کے شوقین ہو۔ اگر واقعی میرا خیال صحیح ہے تو میں تمھیں پڑھانے کے لیے آیا کروں۔ کیونکہ میں بھی علم دوست ہوں مگر کوئی ہم مذاق اور مخاطب صحیح نہیں ملتا۔ انھوں نے کہا کہ میں مستطیع نہیں ہوں کہ کچھ خدمت کرسکوں تاہم اگر بہ زحمت گوارا فرمایئے تو عنایت ہوگی۔ اُنھوں نے جواب دیا مگر پھر بھی بغیر ناشتے کے کہیں آنا جانا دشوار ہے۔ میر صاحب بولے کہ اگرچہ کچھ میرے پاس بھی نہیں مگر خیر خدا مالک ہے۔ اسکے بعد وہ نہ معلوم کتنی مدت تک کبھی کبھی آتے رہے اور میر صاحب حتی الوسع خدمت کرتے رہے یہاں تک کہ وہ اپنے وطن عظیم آباد کو چلے گئے۔

غور طلب یہ ہے کہ اسقدر افلاس اور بیکاری کا زمانہ سوائے سراج الدین علیخاں آرزو کے یہاں کے قیام کے اور کون سا ہوسکتا ہے۔ یہاں سے میر صاحب کے ایثار کا بھی پتہ چلتا ہے کہ یقینی وہ اُسی ناشتے وغیرہ میں سے جو اُن کے لیے آتا تھا۔ اپنے شفیق اُستاد کی بھی خدمت کرتے ہونگے۔ اور اگر یہ نہیں تو ایسی بیکسی کا اظہار ممکن نہ تھا۔ اور نہ زمانۂ ملازمت کے بعد

بیس برس پہلے کا دکھڑا بیان کرتے ہیں۔ یہ ایسی بوالعجبی ہے جو سمجھ میں نہیں آتی۔ دو باتیں ہیں یا تو وہ خان آرزو کی زندگی میں کوئی ایسی بات کہنا ہی نہ چاہتے تھے کہ وہ ناراض ہوں ورنہ اُن کا راز ظاہر ہونے پر خانِ موصوف کوئی معقول جواب دیں یا پھر ادنی ادنی باتوں کو اُن کے انتقال کے بعد بڑھا چڑھا کر بیان کر دیا۔ یہ بات بھی غور کرنے کے قابل ہے کہ خان آرزو اگر دراصل اسقدر اوچھے خیالات کے آدمی تھے تو انھوں نے اتنے طویل زمانے تک کہ میر صاحب نے تعلیم بھی حاصل کی کسی قابل بھی ہوئے۔ ملازم بھی ہو گئے۔ اپنے یہاں ٹھہرنے کی اجازت ہی کیوں دی۔ اور کیونکر اتنی بڑی مدت تک ضبط کیے رہے۔ اور کیوں اُن کی تعلیم و تربیت کے کفیل ہوئے۔ ان سب کو چھوڑ کر خان آرزو کے اخلاق و عادات کو لیجیے تو کوئی تذکرہ اُن کے معاصرین کا ایسا نہیں ملتا۔ جن میں اُن کے محاسن نہ شمار کرائے گئے ہوں۔ ایک فرد بھی ایسا نہیں کہ میر صاحب کی طرح اُن کی تنک مزاجی کا ذکر کرتا ہو۔ بہر حال یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ میر صاحب نے یہ واقعات سراسر غلط لکھے ہیں۔ مگر کچھ نہ کچھ خلط مبحث ضرور ہوا۔ معلوم نہیں کب ان کے بھائی کا خط آیا کن اسباب کی بنا پر انھوں نے ایسا لکھا۔ اور کیوں خان موصوف بگڑ بیٹھے۔ اور کب جدائی ہوئی۔ پھر لطف یہ کہ میر صاحب بھی باوجود ان شکایتوں اور حکایتوں کے لکھتے ہیں" کہ آں عزیز دنیا دار واقعی بود۔ نظر بر خصومت ہمشیر زادۂ خود بدمن اندشید،، سبحان اللہ کیا دنیا داری ہے کہ ذراسی بات پر ظاہر داری کو ترک کر کے ماتھے پر کلنگ کا ٹیکا لگانے کو تیار ہو گئے۔ ان سب کے علاوہ اسی قلمی نسخے میں جسکا ہم نے ذکر کیا ہے نوادر الکملا سے جو عبارت نقل کی ہے۔ اُس میں یہ فقرے بھی ہیں۔

"بخانۂ سراج الدین علی خاں آرزو اقامت ورزیدہ تکمیل علوم عقلی و نقلی نمودہ۔ بعد مرور دہور کہ جدائی فیما بین واقع شد۔ بہ رؤسائے عظام در خورد و برخورد۔"

مرور دہور کے معنے سب جانتے ہیں مگر پھر بھی اس مدت طویل کی صراحت نہیں ہے۔ آزاد کے اس فقرے پر کہ یہ شیعہ تھے اور آرزو حنفی ایک بات اور بھی غور کرنے کے قابل ہے۔ وہ یہ کہ میر صاحب کے اعزا و اقربا آبا و اجداد سنی المذہب تھے۔ سید امان اللہ ایک صوفی وسیع المشرب سُنی تھے۔ اُن کے انتقال کو اُسوقت تک کہ یہ دوبارہ دہلی گئے کوئی بڑا زمانہ نہیں گزرا تھا پھر مولانا آزاد کو یہ کہاں سے متحقق ہوا کہ یہ اسوقت شیعہ مذہب تھے۔ شاید انھیں اسباب

واسطے ان کے مشیر نے ان کو اپنی زبان میں شعر کہنے کی ہدایت کی - رہی شاگردی یہ بالکل طے شدہ بات ہے - کہ گو اپنی ذاتی رنجشوں کی وجہ سے میر صاحب نے ذکر میر میں آرزو کو اپنا اُستاد نہیں بتایا ہے - مگر اس کی تصنیف سے بہت پہلے وہ اُن کی شاگردی کا اقرار کر چکے ہیں - علاوہ اس کے دوسرے شواہد بھی موجود ہیں جو میر صاحب کے معاصرین کے ہیں اور جن کو جھٹلایا نہیں جا سکتا -

میر حسن اپنے تذکرہ شعرائے اُردو میں لکھتے ہیں "برادرزادہ سراج الدین علی خاں آرزو وہم از شاگردان اوست" اسی طرح قائم اپنے تذکرہ مخزنِ نکات میں کہتے ہیں "محمد تقی المتخلص میر - اصل ومنشائے وے دار الخلافت اکبرآباد است - در خدمت خان آرزو کہ خالوے او بود - لختے دانش اندوختہ" یہاں تک تو کوئی نئی بات نہیں ہے - مگر حکیم قدرت اللہ قاسم نے معلومات میں اضافہ کر کے اس راز کو فاش کرتے ہوئے ہمارے اس خیال کو یقین کا درجہ بخشدیا ہے - چنانچہ اپنے تذکرہ مجموعہ نغز میں میر کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں " پسر شوہر ہمشیرہ سخن پرداز بدیہہ گو سراج الدین علی خاں آرزوست - نسبت تلمذ ہم بجناب افادت انتساب خان مشار الیہ دارد - اما بنا بر نخوتے کہ در سرش جا گرفتہ ازیں امر کہ فی الحقیقت فخر وے است ابائے کلی بمیان آرد" یہیں سے یہ گمان بھی پیدا ہوتا ہے کہ مخزن نکات یعنی تذکرہ قائم ۱۱۷۵ھ میں لکھا گیا - اور تذکرہ شعرائے اُردو میر حسن کہ ۱۱۹۳ھ میں تمام ہوا یہاں تک میر کے متعلق ان دونوں معاصرین کو گمان بھی نہیں کہ وہ خان موصوف کی شاگردی سے منکر ہونگے یا منکر ہیں اور نہ خود میر صاحب کو اسوقت تک کوئی انکار معلوم ہوتا ہے - مگر ذکر میر جو ۱۱۹۷ھ میں ختم ہوئی وہ ان دونوں تذکروں کے بعد کی تصنیف ہے - اور اسی میں اُنھوں نے خان آرزو کی شاگردی کو ختم کر کے اُن کی شکایت کی ہے - یہ خبر مشہور ہوئی ہے اور تذکرہ قاسم میں حکیم قدرت اللہ قاسم نے اس قضیۂ نامرضیہ کو صاف بھی کر دیا - کیونکہ یہ تذکرہ ۱۲۲۱ھ میں تمام ہوا جب کہ میر صاحب زندہ و سلامت موجود تھے -

خان آرزو کا فیض صحبت

میر صاحب کی مشق سخن بڑھی اور تمام خوش گویانِ شہر اُن کے کمال فن کے معرف ہو گئے بلکہ یوں کہئے کہ اُن کا ایک رنگ خاص قرار پا گیا - جس کے متعلق اُن کے کلام پر رائے دیتے ہوئے ہم ذرا تفصیل کے ساتھ بحث کرینگے - اسوقت صرف اتنا کہنا ہے کہ جیسے وہ بیان و اظہار جذبات کے لحاظ سے اپنے

اُن کو تعلیم کی ضرورت باقی رہی ہوگی - یہ امر بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہے کہ اُن کا زمانۂ ملازمت اور فراغت معیشت اُن کی شاعری کے بعد شروع ہوا اور یہاں تک وہ نہ شاعری کا ذکر کرتے ہیں اور نہ خود شاعر ہونے کے مدعی ہیں - بہرحال تصانیف سے پتہ چلتا ہے کہ اُنھوں نے فارسی میں ایک ادیب کامل کا درجہ حاصل کیا - اور عربی میں مطول تک استعداد بہم پہونچا نا خود اُن کی تحریر سے ظاہر ہے - ممکن ہے کہ اسکے علاوہ اور درسیات عربیہ پر بھی عبور حاصل کیا ہو جیسا کہ اُن کے کلام کے بعض جملے اور الفاظ مستعمل پتہ دیتے ہیں -

ذوق شعر اور شاگردی

اس بات میں کوئی شک وشبہ کی گنجایش نہیں ہے کہ میر فطری شاعر پیدا ہوئے تھے - اُن کے دل میں ذوق شعر ازلی تھا - اُن کے متعلق کئی بزرگوں کی پیشین گوئیاں تھیں کہ یہ بہترین شاعر ہونگے - چنانچہ پہلے اُنکے والد بزرگوار ہی کو لیجیے - میر صاحب فرماتے ہیں کہ "ہر گاہ مرا در بغل کشیدے - و بنظر شفقت رنگ کاہی مرا دیدے - گفتے - کہ اے سرمایۂ جان ایں چہ آتشے است کہ در دلت نہان است - و چہ سوز یست کہ ترا با جان است"

ایک مرتبہ سیّد امان اللہ کے ساتھ احسان اللہ درویش کے یہاں جاتے ہیں تو وہ فرماتے ہیں - "ایں بچہ ہنوز سوزن بال است - اما چنیں معلوم میشود کہ اگر بخوبی پر برآرد بیک پرواز آنطرف آسمان خواہد رفت"

اسی طرح خواجہ ناصر عندلیب نے خود میر صاحب سے فرمایا تھا - کہ "اے میر تو میر مجلس خواہی شد"

ایک باخدا کی تعلیم و تربیت اور متفرق درویشوں کے فیض صحبت نے اُن کے دل میں سوز و گداز بھر دیا تھا - اُس کی تحریک کی ضرورت تھی جس کے لیے غیب سے یہ سامان ہوا کہ میر صاحب کی ایک شخص سیّد سعادت علی نامی امروہوی سے ملاقات ہوئی اُنھوں نے شعر ریختہ کہنے کی ترغیب دی اور میر صاحب مشق سخن کرنے لگے - اور چند روز میں وہ ترقی کی کہ شعرائے دہلی ان کو نہ صرف خوش گو بلکہ مستند ماننے لگے -

اس واقعے سے یہ دھوکا نہ کھانا چاہیے کہ میر صاحب سید سعادت علی کے شاگرد ہو گئے بلکہ واقعہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب اس سے پہلے شاید فارسی میں شعر کہنے لگے تھے مگر چونکہ کلام فارسی میں کوئی خاص وزن نہ تھا - اور اسکے علاوہ ریختے کا رواج عام ہو رہا تھا - اسی

کہ آپ نے کیونکر پہچانا ۔ وہ کہنے لگا کہ آپ کی حرکات مجنونانہ کی تو شہر بھر میں دھوم ہے۔ خیر گزارش یہ ہے کہ اعتماد الدولہ قمر الدین کے داماد آپ کی ملاقات کے بڑے مشتاق ہیں اگر میرے ساتھ تشریف لےچلیے تو ملاقات بھی ہو جائے گی ۔ اور اس بہانے سے میرا سلام بھی ہو جائے گا ۔ میر صاحب نے منظور کر لیا اور ساتھ ہو لیے ۔ پہونچے ۔ علیم اللہ نے ملایا۔ رعایت خاں بڑے تپاک سے پیش آیا ۔ اور زمرۂ مصاحبین میں ملازم رکھ لیا ۔ اور اب ذرا فراغت کے ساتھ زندگی گزرنے لگی ۔

میر صاحب کی زندگی کا انقلابی دور تو اُسوقت شروع ہوا تھا جبکہ اُن کے والد ماجد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا ۔ اور وہ ایک حد تک بے یار و مددگار رہ گئے تھے ۔ مگر اس مصاحبت کی ملازمت کو بھی دورنگی زمانہ کا سنگِ بنیاد کہہ دیا جائے تو شاید غلط نہ ہو ۔ یہیں سے اُنھیں زمانۂ بوقلموں کے وہ وہ رنگ اور وہ سرد و گرم دیکھنے پڑے جنھوں نے ہمیشہ کیلیے اُن کے دل پر ایسا نقش عبرت بٹھا دیا جس سے زندگی اور زندگی کے عروج علو مدارج اور عیش و عشرت کی اُن کی نگاہ میں ہوا کے جھونکوں اور بچوں کے گھروندوں سے زیادہ وقعت نہیں رہی ۔ درویشوں اور خدا پرستوں کی تربیت سے دل پہلے ہی گداز تھا۔ ان چیزوں نے اور بھی موم بنا دیا ۔ وہی آج ہیں کہ محفل امرا میں میر مجلس ہیں ۔ جملہ اسباب طرب اور سامان راحت کے مالک ہیں ۔ وہی دوسرے دن ہیں کہ نان شبینہ کو محتاج ہیں نہ کوئی دوست ہے نہ پرسان حال ۔ دہلی جو مدتوں سے امن و امان کا گہوارہ بنی ہوئی تھی روز کی خانہ جنگیوں اور طوائف الملوکی سے مرکز گردش و انقلاب ہو گئی ؎

چور اُچکّے سکھ مرہٹے شاہ و گدا سب خواہاں ہیں
چین سے ہیں جو کچھ نہیں رکھتے فقر بھی اک دولت ہے یہاں

غرضکہ سکون اور راحت و عیش تو در کنار ۔ زندگیوں ۔ آبروؤں کے لالے پڑ گئے ۔ یہ بھی اُسی انقلاب روزگار کے ساتھ صبح و شام کی دورنگیوں کا مطالعہ کرتے رہے ۔ یعنی عافیت کے ساتھ چند ہی روز گزرے تھے کہ درّانیوں کا حملہ ہوا ۔ رعایت خاں کے ساتھ میر صاحب کو بھی جانا پڑا ۔ محمد شاہ کا دور حیات ختم ہوا ۔ احمد شاہ کو تخت پر بٹھایا گیا ۔ جاوید خاں خواجہ سرا کا دور دورہ ہوا ۔ مرہٹوں کی شورش ہوئی سانبھر کے قریب مرہٹوں سے جنگ ہوئی ۔ جس میں رعایت خاں کے ساتھ یہ بھی تھے

رنگ کے بلا شرکت غیرے مالک ہیں۔ اسی صورت سے اُن کے یہاں الفاظ اور الفاظ میں بھی فارسی کی ترکیبیں اور فارسی کے اکثر الفاظ اس قسم کے ہیں کہ اردو شاعری کے شروع سے اسوقت تک کسی شاعر ریختہ گو کے یہاں نہیں ہیں۔ اور اگر کہیں ہیں تو وہ شاذ ہیں جو معدوم کا درجہ رکھتے ہیں۔ مثال کے لیے ذیل کے چند الفاظ وترکیبات ملاحظہ ہوں۔

آتش مال۔ استخواں شکنی۔ برخویش چیدہ۔ بزآویزی۔ بزگیری۔ بےتہ۔ بےہیچ۔ ترسل۔ جناغ۔ جیغہ جیغہ ابرو۔ خایہ گزک۔ درونہ۔ دریائے لنگردار۔ دل زدہ۔ زنجیرہ۔ زنخ زن۔ زیادہ سری۔ سجادۂ محرابی۔ سرنشین۔ شیرہ خانہ۔ شیشہ جان۔ صورت باز۔ طفلان تہ بازار۔ غنچہ پیشانی۔ کل مکل۔ ماہ ماہ کہنا۔ نرگسی زن۔ یادبود۔ یال وگوپال۔ اور اسی قسم کے بہت سے الفاظ انکی تصانیف اُردو فارسی میں موجود ہیں۔ مگر آپ کو سنکر تعجب ہوگا کہ یہ سب وہ لفظ ہیں جو آرزو نے اپنے لغت چراغ ہدایت میں اس دعوے کے ساتھ لکھے ہیں۔

"کہ داخل ہیچ کتاب لغت مثل فرہنگ جہانگیری وسروری وبرہان قاطع وغیرہا نیست وسبب تالیف آنست کہ چوں اکثر ہمم مصروف مطالعہ وخواندن کتب جدید وقدیمہ فارسی دیدم ومعنی بعضے از الفاظ واکثر اصطلاح درکتب مذکورہ نیافتم۔ بر ہرچہ اطلاع دست بہم داد بہ اسناد آن از اشعار اُستاداں دریں نسخہ درج کردم مگر بعض کہ از محاورہ دانان بہ تحقیق پیوستہ وسند آن در اشعار بزرگاں بہم نہ رسیدہ۔"

پھر جب مشہور لغات اور بڑے بڑے محاورہ دانوں کے کلام میں بھی یہ الفاظ نہیں تو میر صاحب کے یہاں انکے پائے جانے کو سوائے اسکے کہ خان آرزو کا فیض صحبت ہو اور کیا کہا جائے۔ اور کیا خیال کیا جاسکتا ہے۔ میں تو جب میر صاحب کی نثر فارسی یا نظم اُردو کو دیکھتا ہوں تو خان آرزو کی کوششوں کی ایک مجسم تصویر نگاہ میں پھر جاتی ہے۔

ان تمام توجیہات کا ماحصل یہ نکلتا ہے کہ میر صاحب مدت تک خان آرزو کے یہاں رہکر کسب کمال کرتے رہے۔ ایک روز یہ اتفاق ہوا کہ اُنھوں نے میر صاحب کو کھانے پر بلایا۔ اور اُنکی زبان سے کوئی بات نکل گئی جسکو یہ برداشت نہ کرسکے اور بغیر کھانا کھائے ہوئے گھر سے باہر چلے گئے۔ ارادہ تھا کہ جامع مسجد جائیں اور وقت گزاریں۔ مگر اتفاق سے راستہ بھول کر حوض قاضی پر جانکلے۔ اور پانی لینے لگے۔ اتنے میں ایک شخص علیم اللہ نامی آگے بڑھا ان سے مل کر پوچھا کہ کیا جناب کا نام میر محمد تقی میر ہے۔ انھوں نے پوچھا

درماہہ ضرور مقرر کردیا جو ایک سال تک اُن کو ملتا رہا اور پھر خود راجہ نے بھی ایک سال کی تنخواہ دلوادی۔ اس سے کچھ نہ کچھ کام چل گیا اور اسکے بعد بھی میر صاحب وقتاً فوقتاً ان سے کچھ نہ کچھ متمتع ہوتے رہے۔ اِس دوران میں راجہ ترقی کرکے نائب وزیر ہوئے۔ عمدۃ الملک خطاب پایا۔ مگر ہنوز میر صاحب کو کوئی فائدہ پہونچنے نہیں پایا تھا کہ ناگاہ نادر شاہ درانی کا دوسرا حملہ شروع ہوا۔ راجہ ناگرمل کو بھی دلّی چھوڑنا پڑی اور اپنے متعلقین و متوسلین کو لےکر سورج جاٹ کے قلعوں میں جاکر پناہ گزین ہوگئے۔ میر صاحب بھی ساتھ ساتھ تھے۔ دلّی میں ایک ہنگامہ برپا ہوگیا۔ نالیوں میں خون بہنے لگا۔ اور شہر کا شہر زیر وزبر ہوکر رہ گیا۔

اُدھر دُرّانی دلّی کو تاراج کرکے عالمگیر ثانی کو تخت سلطنت پر بٹھا کر متھرا کو زیر وزبر کرتا اکبرآباد پہونچا۔ اُدھر سردار جھنکو کی سرکردگی میں دکن کی فوج نے پھر دلی کو جولانگاہ بنادیا دھوکے سے انتظام الدولہ اور عالمگیر ثانی کو بھی قتل کیا گیا۔ اور اسی دوران میں دُرّانیوں اور دکنیوں میں جھڑپ ہوگئی غریب دلی پھر لوٹی گئی۔ اور ایکبار ایسی تباہ ہوئی جس کی تاریخ میں نظیر نہیں ملتی۔ اُدھر میر صاحب راجہ ناگرمل سے معافی مانگ کر طرح طرح کی سختیاں اُٹھاتے مع متعلقین برسانہ پہونچے اور وہاں سے کُمھیر گئے۔ یہاں بہادر سنگھ پسر راو دھاکشن خزانچی صفدر جنگ نے ان کی بڑی دلدہی کی اور بےانتہا آدمیت سے پیش آیا۔ مگر پھر بھی اذیتیں اُٹھانا پڑیں۔ کچھ عرصہ کے بعد جب دکنیوں اور دُرّانیوں کی فیصلہ کن جنگ ہوچکی تو راجہ ناگرمل کمھیر پہونچے۔ راجہ کے صاجزادے رائے بشن سنگھ نے میر صاحب کو ٹھہرا لیا تھا اور کچھ درماہہ بھی مقرر کردیا تھا۔ مگر یہ بددل تھے۔ چنانچہ اُنھوں نے راجہ سے عرض کیا کہ اب تک حضور کا انتظار تھا۔ ورنہ مجھے یہاں رہنے کی تاب نہیں۔ اجازت عطا فرمائی جائے کہ بندہ رخصت ہو۔ راجہ نے کہا کہ میر صاحب کچھ خیر ہے یہ آپ فرما کیا رہے ہیں۔ ایسے پرآشوب زمانے میں میں آپ کو جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ اسکے بعد تنخواہ مقرر کردی اور کچھ زرنقد سے امداد بھی کی۔ مجبوراً ان کو پھر وہیں قیام کرنا پڑا۔ اور یہ قیام قریب قریب مستقل رہا۔ جب دکنیوں نے شکست فاش کھائی اور دُرّانیوں کا پورا پورا تسلط ہوگیا۔ تو دلّی میں ذرا پھر سکون و اطمینان کی لہر دوڑی اور کوئی خوف و خطر باقی نہ رہا۔ تمام سرداران قدیم کے پتہ پر فرمان بھیجکر عزت و احترام کے ساتھ اُن کو طلب کیا گیا۔ اسی دوران میں راجہ ناگرمل کے نام بھی پیام پہونچا۔ چنانچہ یہ دلی آئے اور میر صاحب کی بھی واپسی ہوئی

اور یہیں سے خواجہ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کے مزار سراپا انوار کی زیارت کو گئے وہاں سے دہلی واپس آئے تو پھر بیکار ہو گئے - چندے تکلیف اُٹھاکر نواب بہادر کی مصاحبت میں رہے - کچھ سانسیں اطمینان وراحت سے لیں - عربی کی تعلیم کی تکمیل کا خیال ہوا مطول پڑھنا شروع کیا - ایکا ایکی پھر ہوا بدل گئی - صفدر جنگ نے نواب بہادر کو دغا سے مروا ڈالا - اور انکو پھر بیکاری سے سابقہ پڑا - مگر چونکہ اب مشہور ہو چکے تھے اسواسطے جلد ہی ایک صورت نکل آئی - نجم الدین سلام کے ذریعے سے مہانرائن دیوان نے ان کو بلایا اور زمرۂ متوسلین میں شامل کرلیا - کچھ دن پھر فراغت سے گزرے - اتنے میں وزیر اور بادشاہ میں صف آرائی ہوئی اور باقاعدہ جنگ شروع ہوگئی - یہ بغاوت اور عداوت کوئی چھ مہینے تک جاری رہی - میر صاحب چونکہ وزیر کے متوسلین میں سے تھے اسلیے سخت پریشان رہے، اسی زمانہ میں شماتت ہمسایہ کے خوف سے خان آرزو کے یہاں سے بالکل علیحدہ ہوکر امیر خاں انجام کی حویلی میں جا رہے - مگر زمانہ جو پلٹا تو واقعات کو کہیں سے کہیں لے پہونچا - صفدر جنگ کا انتقال ہوا اور اُن کی جگہ شجاع الدولہ صوبہ دار اودھ بنائے گئے - خان آرزو اس اُمید پر کہ اسحاق خاں مرحوم کے بھائی جوان کے مربی اور محسن ہیں وہیں ہیں اودھ پہونچے اور وہیں انتقال ہوگیا - بعد کو اُنکی وصیت کے مطابق لاش دہلی میں لائی گئی -

میر صاحب کے عروج شاعری کا یہی زمانہ تھا - بڑے بڑے لوگ ان کے علو خیالات اوران کے اچھوتے جذبات کے قدردان پیدا ہو گئے تھے - دلی ان کے کمالات سے گونج رہی تھی - ہر شخص ان کی ملاقات کا شائق تھا - چنانچہ اسی دوران میں ایک روز راجہ جگل کشور نے انھیں اپنے مکان پر بلایا - کچھ سُنا سُنایا اور اپنا کلام اصلاح کے لیے پیش کیا میر صاحب کا دل ودماغ بھلا ان مزخرفات کے دیکھنے کی کب تاب لاسکتا تھا - اُنھوں نے دنیاداری بھی نہ برتی - اور جبین بر جبین ہوکر تمام کلام پر چھری پھیر دی - ایسی حالت میں کیا صحبت دگر ہوسکتی تھی - نتیجہ یہی ہوا کہ وہی ابتری اور پریشان حالی جو دامنگیر حال تھی دامن گیر رہی اور راجہ سے انھیں کوئی فائدہ نہ پہونچ سکا - اتنا ضرور ہوا کہ انکے ذریعہ سے راجہ ناگر مل تک پہونچ گئے - یہ اُسوقت دیوان خالصہ تھے - یہاں بھی میر صاحب کے کلام کی تو بڑی حد تک تعریف ہوتی رہی - مگر بدقسمتی سے اُن کے جود وسخا سے متمتع ہونے کا ان کو ذرا بھی موقع نہ ملا - مگر اتنا ہوا کہ راجہ کے لڑکے نے خواجہ غالب کی سفارش سے میر صاحب کا کچھ

اور جاٹوں کی شورش بیجا نے پھر زور پکڑا - راجہ ناگرمل کو کامان جانا پڑا یہ ایک سرحدی مقام تھا - اور راجہ مادھو سنگھ کے لڑکے پرتھی سنگھ کے قبضہ میں تھا - میر صاحب بھی راجہ کے ساتھ وہاں گئے اور کچھ دن قیام کرنا پڑا - راجہ نے میر صاحب کو بادشاہ سے صفائی کرانے کے لیے بھیجا - اور یہ حسام الدین خاں سے ملکر تمام معاملات طے کرآئے - مگر راجہ پھر چھوٹے لڑکے کے کہنے سے دکنیوں سے جا ملا - میر صاحب کو بڑا رنج ہوا - اگرچہ یہ پھر بھی راجہ کے ساتھ رہے - مگر نہایت شرمندہ اور بددل رہے - آخر دہلی آئے - متعلقین کو عرب سرائے میں چھوڑا اور آپ تلاش معاش میں گھومتے رہے - لیکن کامیاب نہ ہوئے - نہایت پریشان تھے - لشکر میں ایک ایک کے سامنے ضرورتوں کا اظہار کیا کسی نے نہ سنی - بہزار دقت وجیہ الدین خاں برادر حسام الدولہ نے کچھ مقرر کیا جس سے خوش وناخوش زندگی گزر رہی تھی -

مگر باایں ہمہ مصائب دلی میں ان کا دل زندہ تھا - وہ اپنے یہاں مشاعرے بھی کرتے تھے اور اس پابندی کے ساتھ کہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ اسی شغل کے لیے مخصوص تھی اپنے خاص دوستوں سے اُن کی ہم جلیسی میں کوئی فرق نہ آیا تھا - ہنستے بولتے تھے بذلہ سنجی کرتے تھے - باہم گپیں تک مارتے تھے - احباب سے ملنا جلنا - لوگوں کا ان کے پاس آنا - اور اُن کا دوسروں کے یہاں جانا جاری تھا - شہر میں جابجا چطارحے اور مشاعرے کی محفلیں ہوتی تھیں وہ اُن میں شریک ہوتے تھے - خواجہ میر درد - میر سجاد - میر علی نقی کافر کے یہاں کی صحبت شعر خوانی کا اُنھوں نے خود پتہ دیا ہے اور عجب نہیں کہ میاں مصحفی کے یہاں بھی کبھی تشریف لے جاتے ہوں -

اُن کی شعر و شاعری کا عروج دہلی ہی میں شروع ہو چکا تھا - اور نہ صرف شروع ہوا تھا بلکہ وہ اس حد تک پہونچ گیا تھا کہ لوگ اُن کے شعروں پر سر دُھنتے تھے - جابجا اُن کی غزلوں کی نقلیں لی جاتی تھیں - اسکی گواہی وہ خود دیتے اور فرماتے ہیں -

کس نے سن شعر میر یہ نہ کہا	کہیو پھر ہائے کیا کہا صاحب
اگرچہ گوشہ گزیں ہوں میں شاعروں میں میر	پہ میرے شعر نے روئے زمیں تمام لیا
یہ میر ستم کشتہ کسی وقت جواں تھا	انداز سخن کا سبب شور و فغاں تھا
جادو کی پڑی پرچۂ ابیات تھا اس کا	منھ تکتے غزل پڑھتے عجب سحر بیاں تھا

اس مرتبہ دلی کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ نہ وہ مکان نہ وہ مکین۔ نہ وہ محلے نہ بازار۔ ہر طرف وحشت ہر طرف ویرانی نہ دوست نہ آشنا۔ میر صاحب کے قلب پر بڑا گہرا اثر پڑا۔ اس بات کی طرف اُن کے بعض شعر بھی اشارہ کرتے ہیں ؎

دلی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انھیں	تھا کل تلک دماغ جنھیں تخت و تاج کا
دلی میں اب کے آکر اُن یاروں کو نہ دیکھا	کچھ وے گئے شتابی کچھ ہم بدیر آئے
منزل نہ کر جہاں کو کہ ہم نے سفر سے آ	جس کا لیا سراغ سُنا وے گزر گئے
شہاں کہ کحل جواہر تھی خاک پا اُن کی	اُنھیں کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھیں

اسی دوران میں راجہ ناگر مل کو شجاع الدولہ کے پاس اس لیے بھیجا گیا کہ درّانیوں سے وزیر الممالک کی صفائی ہو جائے۔ میر صاحب بھی اس سفر میں ساتھ رہے۔

سورج مل جاٹ کی بغاوت کی ابتدا ہوئی اور وہ اکبر آباد پر متصرف ہو گیا۔ خود بادشاہ کو اُسکی گوشمالی کے لیے جانا پڑا۔ سورج مل نے ناگر مل سے امداد چاہی کہ کسی طرح وہ آڑے آئے۔ اسی لیے ناگر مل کو اکبر آباد جانا پڑا۔ میر صاحب بھی اسی تقریب سے تیس برس کے بعد اپنے وطن مالوف پہونچے اور اپنے بزرگوں کے مزاروں پر فاتحہ پڑھنے اور عزیزوں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ مگر چونکہ زمانہ کی آب و ہوا کے ساتھ ساتھ اکبر آباد بھی بدل گیا تھا اس لیے کچھ جی نہ لگا۔ پھر بھی چار مہینے رہے۔ بعدہ پھر راجہ کے ساتھ ہی سورج مل کے قلعوں میں واپس آگئے۔

اسی طرح ایک مرتبہ اسکے بعد جب رگھوناتھ راؤ دکھنی کی فوج نے ملک میں فتنہ و فساد پھیلا رکھا تھا اور سورج مل جاٹ کے لڑکے جواہر سنگھ سے اُن کی آویزش کا خوف تھا۔ درّانیوں کے جدید حملے کی خبریں اُڑ رہی تھیں تو ناگر مل کو پھر آگرہ سے جانا پڑا میر صاحب ہمراہ رکاب تھے اس لیے وہ بھی دوبارہ وطن کی ہوا کھا آئے۔ مگر صرف پندرہ روز قیام کر کے واپس آگئے۔

زمانہ بدلتا رہا۔ تازہ واقعات ہوتے رہے۔ مگر اس سانحے کو میر صاحب نے سانحۂ عظیم لکھا ہے کہ سورج مل جاٹ کا لڑکا کسی معمولی آدمی کے ہاتھ سے اکبر آباد میں قتل ہو گیا۔ اسکے بھائی راؤ رتن سنگھ کو ریاست ملی وہ شرابی اور بدکردار تھا کسی نے اُس کا بھی خاتمہ کر دیا۔ اور پھر کھیری سنگھ اُسکے لڑکے کو گدی ملی اور سورج مل کا جو تھا لڑکا نول سنگھ سرپرست قرار پایا۔

قدردانی کے بعد بھی میر صاحب سمجھتے تھے کہ میرے کمال کی صحیح داد نہیں دی جاتی۔ اور جیسے جواہر ہیں اُن کے مطابق کوئی خریدار نہیں ملتا۔ وہ رسمی داد کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتے تھے بلکہ اسکو فن کی ایک توہین جانتے تھے۔ ذیل کے شعر دیکھئے۔

فکر کو نازک خیالوں کی کہاں پہونچے ہیں یار
ورنہ ہر مصرع میں یاں معشوق شوخ و شنگ ہے

سرسری کچھ سُن لیا پھر واہ وا کر اُٹھ گئے
شعر یہ کم فہم سمجھے ہیں خیال بنگ ہے

ان کا احساس کمال بڑھ رہا تھا اور اسی احساس کی وجہ سے ان کی شاعرانہ نازک مزاجی کی حد یہاں تک پہونچی تھی کہ وہ معاصرین کو ہیچ و پوچ ناقابل مہمل گو وغیرہ سبھی کچھ سمجھ کر اپنی غزلوں میں اُن پر صاف صاف چوٹیں کرنے لگے تھے۔

کہاں عاجز سخن قادر سخن ہوں
ہمیں ہے شبہ یاروں کے سخن میں

کس کا ہے قماش ایسا گودڑ بھرے ہیں سارے
دیکھو نہ جو لوگوں کے دیوان نکلتے ہیں

دعوے کو یار آگے معیوب کر چکے ہیں
اس ریختے کو ورنہ ہم خوب کر چکے ہیں

خیروں نے ریختہ کو دول ریختہ بنایا
جوان دنوں ہیں بارے لڑکوں کی بالیاں ہیں

بات بنا نا مشکل سا ہے شعر سبھی یاں کہتے ہیں
فکر بلند سے یاروں کو اک ایسی غزل کہہ لانے دو

اُستاد ماننا دوسری بات ہے اور ان باتوں کا تحمل دوسری شئے۔ معاصرین ان کو مغرور کہنے لگے۔ میر صاحب نے یہ اور غضب کیا کہ ایک نظم اژدر نامے کے نام سے لکھ ڈالی اور ستم بالائے ستم یہ کہ سر مشاعرہ سُنانے بیٹھ گئے۔ اس میں تمام معاصر شعرا کو چھوٹے سانپ سنپولیوں اور دوسرے کیڑے مکوڑوں سے تشبیہ دی ہے۔ اور اپنے آپ کو ایک اژدہا بتایا ہے۔ بھلا ٹھنڈے دل سے کون اس کو سُن سکتا۔ چنانچہ محمد امان نثار نے سر مشاعرہ اس کے جواب میں غزل پڑھی اس کا مقطع یہ ہے۔

حیدر کرار نے وہ زور بخشا ہے **نثار**
ایک دم میں دو کروں اژدر کے کلے چیر کر

لوگوں نے یہ غزل سُن کر نثار کی خوب خوب تعریفیں کی۔ اور میر صاحب کو خفیف ہونا پڑا۔

ایک تو فن شعر میں یہ خاص بات ہے کہ خوش گو کے لوگ خواہ مخواہ دشمن ہو جایا کرتے ہیں۔ اس پر جب اُسکی طرف سے کوئی خاص مظاہرہ ہو تو مخالفت دونی ہو جاتی ہے۔ یہی ہوا کہ میر صاحب کے مخالفین کی تعداد بڑھ گئی۔ بقا نے بھی شاید اسی وجہ سے یہ شعر کہا ؎

پگڑی اپنی سنبھالیے گا **میر**
اور بستی نہیں یہ دلّی ہے

جس راہ سے وہ دلزدہ دلی میں نکلتا
ساتھ اس کے قیامت کا سا ہنگامہ رواں تھا

افسردہ نہ تھا ایسا کہ جوں آب زدہ خاک
آندھی تھا بلا تھا کوئی آشوب جہاں تھا

میر دریا ہے سنے شعر زبانی اس کی
اللہ اللہ رے طبیعت کی روانی اس کی

ایک ہے عہد میں اپنے وہ پراگندہ مزاج
اپنی آنکھوں میں نہ آیا کوئی ثانی اس کی

مرثیے دل کے کئی کہکے دیے لوگوں کو
شہر دلی میں ہے سب پاس نشانی اس کی

پھر یہی نہیں کہ دلی اُن کے کمالات کی جولانگاہ تھی بلکہ اُنھوں نے بیان کیا ہے کہ

سرسبز ملک ہند میں ایسا ہوا کہ میر
یہ ریختہ لکھا ہوا تیرا دکن گیا

سرسبز ہند ہی میں نہیں کچھ یہ ریختہ
ہے دھوم میرے شعر کی سارے دکن تلک

کچھ ہند ہی میں میر نہیں لوگ جیب چاک
ہے میرے ریختوں کا دوانا دکن تمام

دور تک رسوا ہوا ہوں شہروں شہروں ملک ملک
میرے شعر و شاعری کا تذکرہ گھر گھر ہے اب

ملکوں ملکوں شہروں شہروں قریہ قصبہ دیہہ دیار
شعر و بیت و غزل پر اپنی ہنگامہ ہے گھر گھر آج

شعر ہمارے عالم کے ہر چار طرف گیا دوڑے ہیں
کس وادی آبادی میں یہ حرف و سخن مشہور نہیں

ہر چند شعر میر کا دل معتقد نہ تھا
پر اس غزل کو ہم نے بھی سنکر لکھا رکھا

ذوق سخن ہوا ہے اب تو بہت ہمیں بھی
لکھ لیں گے میر جی کے اشعار چیدہ چیدہ

اشعار میر سب نے چن چن کے لکھ لیے ہیں
رکھینگے یاد ہم بھی کچھ بیتیں چیدہ چیدہ

امرا کی محفلوں میں ان کی غزلوں کی داد دی جاتی تھی۔ اور لوگ ان سے محظوظ ہوتے تھے۔
صوفیا کی خانقاہوں میں اہل دل کو ان پر وجد و حال آتا تھا۔

مطرب سے غزل میر کی کل ہم نے پڑھائی
اللہ رے اثر سب کے تئیں رفتگی آئی

جس شعر پر سماع تھا کل خانقاہ میں
وہ آج میں سنا تو ہے میر کا کہا ہوا

مطرب نے پڑھی تھی غزل اک میر کی شب کو
مجلس میں بہت وجد کی حالت رہی سب کو

ہے مری ہر اک غزل پر اجتماع
خانقہ میں کرتے ہیں صوفی سماع

وجد میں رہتا ہے اہل شعر کو
میرے شعر و شاعری کا استماع

ان اشعار کو میر کی تعلی شاعرانہ سمجھنا غلطی ہوگی۔ ذکر میر دیکھنے کے بعد فوراً یقین ہو جاتا ہے کہ عوام و خواص امیر و فقیر۔ شاہ و گدا ہر ایک سے تقرب کی وجہ میر کے لیے صرف شاعری تھی ورنہ اور کوئی چیز ایسی نہ تھی کہ وہ ان جگہوں میں رسائی حاصل کر سکتے۔ یہ اور بات ہے کہ اتنی

تھے۔ میر صاحب بھی اس مجمع میں تھے۔ یکایک نواب کی نظر ان پر پڑی اور فوراً بشرے سے معلوم کر کے پوچھا کیا تم میر محمد تقی ہو۔ انھوں نے مؤدبانہ سلام کیا۔ نواب سراپا اخلاق سراسر تہذیب۔ ہمہ تن محبت تھے۔ بغلگیر ہوئے۔ اور اپنے نشستگاہ خاص تک لے گئے۔ کچھ کلام سنایا۔ میر صاحب نے جی کھول کر دادِ سخن دی۔ نواب نے ازراہ قدردانی ان سے بھی پڑھنے کے لیے کہا۔ انھوں نے بھی کچھ سُنایا۔ نواب سالار جنگ نے اسیوقت عرض کیا کہ اب یہ حسب الحکم حاضر ہو گئے ہیں کوئی مناسب جگہ ان کے لیے تجویز کر دی جائے۔ اس پر ارشاد ہوا کہ عنقریب کچھ مقرر کر کے اطلاع دی جائیگی۔ دو تین روز بعد پھر یہ طلب کیے گئے۔ اور انھوں نے ایک قصیدہ مدحیہ پیش کیا جس کا مطلع یہ بتایا جاتا ہے۔

سیہ ہے کاغذ مشقی کے رنگ لوحِ ضمیر ہوا کیے ہیں زبس شکوہ فلک تحریر

اسکے بعد بقول آزاد دو سو روپیہ اور بقول میر لطف تین سو روپیہ ماہوار مقرر ہو گئے۔ اور اب میر صاحب فارغ البالی کے ساتھ لکھنؤ میں رہنے لگے۔ یا بالفاظ دیگر اُن کو اپنے اظہار کمال کیلیے وہ وقت مل گیا جو اب تک نہ مل سکا تھا۔

لکھنؤ کا قیام میر صاحب کے بعض معاصرین میر صاحب سے پہلے لکھنؤ آ چکے تھے۔ چنانچہ ان میں مرزا سودا اور میر سوز خاص طریقہ سے ذکر کے قابل ہیں۔ یہاں ان لوگوں کے کمال کا سکہ اتنا بیٹھ گیا تھا کہ خود نواب آصف الدولہ میر سوز کے شاگرد ہو گئے تھے میر صاحب کا ذکر خیر بھی ادبی مجلسوں اور علمی محفلوں میں برابر آتا رہا ہوگا۔ یہ اور بات ہے کہ اہالیان لکھنؤ اُن کے روشناس نہ تھے۔ مگر غائبانہ سب کے سب ان کے کمال کے معرف تھے۔ یہاں پہونچنے پر اُن کی وہی قدر و منزلت ہوئی جو ہونا چاہیئے تھی۔ اور اُسی طرح اُن کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ جس کی اُمید کی جا سکتی تھی۔ دربار آصفی میں ان کی بڑی عزت تھی۔ اور وزیر الممالک ان کو اتنا عزیز رکھتے تھے کہ سفر و حضر میں کہیں جدا نہ کرتے تھے۔ جشن شادی اور کھیل تماشوں کی محفلیں تک ان سے خالی نہ ہوتی تھیں۔ میر صاحب کے لکھے ہوئے شکارنامے۔ ہولی نامہ۔ مثنوی کدخدائی آصف الدولہ وغیرہ اس کی گواہ ہیں۔ مگر بعض تذکرہ نویسوں کا بیان ہے کہ وہ اپنی گرفتہ مزاجی کے سبب سے دربار میں کم جاتے تھے۔ بلکہ یہ لطیفہ بھی لکھا گیا ہے۔ کہ ایک مرتبہ میر صاحب غزل پڑھ رہے تھے نواب سُن رہے تھے۔ مگر اس حالت میں بھی نواب اپنی چھڑی سے مچھلیوں کے ساتھ کھیلتے جاتے تھے۔ میر صاحب غزل پڑھتے پڑھتے رُک گئے۔ اور عرض کیا کہ جب حضور متوجہ

میر صاحب کی روانگی لکھنؤ

ہمعصروں کی مخالفت دہلی کی تباہی و بربادی معیشت کی فکر احبار و اعزا کی جدائی۔ آئے دن کی مصیبت نے میر صاحب کو نہ صرف دل برداشتہ بلکہ عزلت گزین اور صحیح معنی میں گوشہ نشین بنا دیا تھا ؎

میر صاحب کو دیکھیے جو بنے	اب بہت گھر سے کم نکلتے ہیں
کیا کہیں میر جی ہم تم سے معاش اپنی غرض	غم کو کھا یا کریں ہیں لوہو پیا کرتے ہیں

ان کو سوائے شاعری کے کسی سے تعلق خاطر باقی نہ رہا تھا۔ بار بار دلی چھوڑنے کا ارادہ بھی کرتے تھے۔ مگر بے سروسامانی کے ہاتھوں مجبور تھے کرتے تو کیا کرتے اور جاتے تو کہاں جاتے۔

اس کو میر صاحب کی خوش قسمتی کہیے یا حسن اتفاق سے تعبیر کیجیے کہ وزیر الممالک نواب آصف الدولہ بہادر کو کسی طرح سے اُن کا خیال آیا۔ اور نواب سالار جنگ خلف اسحاق خاں مؤتمن الدولہ اور اُن کے برادر خرد اسحاق خاں نجم الدولہ سے میر صاحب کا ذکر کیا۔ اور فرمایا اگر میر محمد تقی یہاں آجائیں تو اچھا ہے۔ یہ لوگ چونکہ خان آرزو کے مربی اور قدردان تھے اور انھیں کی وجہ سے میر صاحب سے بھی تعلقات تھے۔ لہذا اس موقع کو میر صاحب کے لیے فال مبارک خیال کرکے زادِ راہ سرکار سے لیکر ان کو خط لکھدیا کہ صورت حال یہ ہے۔ فوراً لکھنؤ پہونچو۔ دلی کی خانہ جنگیوں، بدامنیوں نے میر صاحب کو مدتوں سے نہ صرف دلتنگ بلکہ برداشتہ خاطر بنا رکھا تھا۔ اور وہ اگرچہ دلی کو جان سے پیارا جانتے تھے۔ مگر با اینہمہ اُسکے چھوڑ دینے پر آمادہ بیٹھے تھے خط اور زادِ راہ پاتے ہی ع رخصت اے اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں + کہتے اور فرخ آباد کیطرف سے قطع منازل کرتے ہوئے لکھنؤ پہونچے۔ ہر چند کہ فرخ آباد کے رئیس اعظم مظفر جنگ نے چند روز ٹھہرنے کے لیے ان سے اصرار بھی کیا۔ مگر اُنھوں نے منظور نہ کیا۔

لکھنؤ پہونچ کر نواب سالار جنگ خلف اسحاق خاں مرحوم کے یہاں فروکش ہوئے۔ اور وہ بڑی تواضع کے ساتھ پیش آئے۔ اور اسکے بعد موقع محل دیکھ کر وزیر الممالک کے حضور میں بھی عرض کر دیا کہ میر صاحب یہاں پہونچ چکے ہیں۔

اُس زمانے میں لکھنؤ میں مرغ بازی کا بڑا چرچا تھا۔ گلی کوچوں میں مرغوں کی پالیاں ہوتی تھیں۔ چنانچہ خود نواب کو بھی اس کا ایک ذوق تھا۔ اور اسی تقریب سے میر صاحب کو شرف باریابی نصیب ہوا۔ مرغ لڑ رہے تھے۔ وزیر الممالک نواب آصف الدولہ مصروف تماشا

ایک جگہ نہایت دردانگیز لہجے میں ہوا کے ہاتھوں دلّی والوں کو پیام بھیجتے ہیں اور کہتے ہیں۔

اے صبا گر شہر کے لوگوں میں ہو تیرا گزار
کہیو ہم صحرانوردوں کا تمامی حال زار

خاکِ دہلی سے جدا ہم کو کیا یکبارگی
آسماں کو تھی کدورت سو نکالا یوں غبار

منصب بلبل غزلخوانی تھا سو تو ہے اسیر
شاعری زاغ و زغن کا ہو نہ ہووے اب شعار

اس نظم میں ۳۲ شعر ہیں اور سب کے سب میں نہایت دردانگیز انداز میں اگلی صحبتوں کو یاد کیا گیا ہے۔ پھر یہی نہیں ہے بلکہ معلوم یہ ہوتا ہے کہ لکھنؤ سے ان کو ایک خاص تنفر تھا جیسا کہ ان شعروں سے معلوم ہوتا ہے۔

خرابہ دلی کا وہ چند بہتر لکھنؤ سے تھا
وہیں میں کاش مرجاتا سراسیمہ نہ آتا یہاں

برسوں سے لکھنؤ میں اقامت ہے مجھکو لیک
یہاں کے چلن سے رکھتا ہوں عزم سفر ہنوز

آباد اُجڑا لکھنؤ چغدوں سے اب ہوا
مشکل ہے اس خرابے میں آدم کی بود و باش

اس تنفر کی وجہ کہیں کہیں ظاہر بھی ہو گئی ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ لکھنؤ میں میرے کلام کے سمجھنے والے نہیں ہیں۔ اگر قدردانی بھی ہوتی ہے تو وہ صرف تحسین ناشناس کا درجہ رکھتی ہے۔ فرماتے ہیں۔

رہی نہ گفتہ مرے دل میں داستاں میری
نہ اس دیار میں سمجھا کوئی زباں میری

کس کس ادا سے ریختے میں نے کہے ولے
سمجھا نہ کوئی میری زباں اس دیار میں

مربوط کیسے کیسے کہے ریختے ولے
سمجھا نہ کوئی میری زباں اس دیار میں

بہت کچھ کہا ہے کرو میرؔ بس
کہ اللہ بس اور باقی ہوس

جواہر تو کیا کیا دکھایا گیا
خریدار لیکن نہ پایا گیا

متاعِ ہنر پھیر کر لے چلو
بہت لکھنؤ میں رہے مگر چلو

گو لکھنؤ ویران ہو ہم اور آبادی میں جا
مقسوم اپنا لائیں گے خلق خدا ملک خدا

کیا قدر ہے ریختہ کی گو میں
اس فن میں نظیری کا بدل تھا

غرض وہ آخر وقت تک لکھنؤ میں رہے مگر دلی کو کبھی نہ بھولے۔ اور جب دلّی کو نہیں بھولے تو شاید لکھنؤ میں خوش بھی نہیں رہے۔

میر صاحب کے اخلاق و عادات

میر صاحب کو اُن کے تمام معاصرین جنھوں نے شعرا کے تذکرے لکھے ہیں نہایت تنک مزاج

ہونگے تو عرض کرونگا۔ نواب نے جواب دیا کہ شعر خود متوجہ کریگا۔ میر صاحب نے غزل پڑھنا بند کردی اور اپنے گھر چلے آئے۔ چند روز بعد نواب بازار سے گزرے تو میر صاحب کو کہیں دیکھا اور ارشاد فرمایا کہ میر صاحب اب آپ دربار میں تشریف نہیں لاتے۔ میر صاحب نے عذرِ گناہ بدتر از گناہ کی مصداق یہ جواب دیدیا کہ بازار میں باتیں کرنا شرفا کا دستور نہیں ہے۔

نواب آصف الدولہ کے انتقال کے بعد بھی یہ دربار سے وابستہ تو رہے مگر صحبت درگیر ہونے کے باعث دربار کا آنا جانا بند تھا۔ ایک روز نواب سعادت علی خاں کی سواری چوک میں تحسین کی مسجد کے سامنے سے ہوکر گزری۔ عوام و خواص تعظیماً سروقد کھڑے ہو گئے۔ مگر میر صاحب ٹس سے مس نہ ہوئے جیسے بیٹھے تھے بیٹھے رہے۔ انشاء ساتھ تھے اُنھوں نے بتایا کہ یہ میر تھے۔ نواب کے حُسنِ اخلاق کو دیکھیے کہ اُنھوں نے جاتے ہی میر صاحب کے لیے خلعت بحالی اور ایک ہزار روپیہ نقد روانہ کیا۔ مگر اتنا ضرور ہوا کہ ایک ملازم کے ہاتھ روانہ کیا گیا۔ اور یہی وجہ ہوئی کہ میر صاحب نے اسکو واپس کردیا۔ مگر بعد کو میر انشاء اللہ خاں انشاء گئے میر صاحب کو سمجھایا بجھایا۔ اور نواب کا عطیہ قبول کرنے پر مجبور کیا۔ کبھی کبھی یہ دربار جانے لگے۔ مگر اس سے یہ نتیجہ نہ نکالنا چاہیئے کہ وہ مشاعروں وغیرہ سے دست بردار ہو گئے۔ بلکہ وہ ادبی صحبتوں میں ہمیشہ شریک ہوتے رہے اور لوگ ان کے کلام کو دل میں جگہ دیتے رہے۔ سب نے اُنکو اُستاد مانا۔ اور مسلکِ شاعری کا پیشوا جانا۔ مگر انسان طبعاً اور فطرتاً ماضی پرست واقع ہوا ہے۔ میر صاحب اس قدردانی کے باوجود بھی دلی کو ہمیشہ لکھنؤ پر ترجیح دیتے تھے۔ اور برابر اُسکو یاد کرتے رہتے تھے۔ ذیل کے اشعار اُن کے اُس کرب کو ظاہر کرتے ہیں۔ اُن کے یہ خیال شاعرانہ نہیں بلکہ اس اشتیاق نے اُن کو دعائیں مانگنے پر مجبور کردیا تھا۔ چنانچہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی تعریف میں قصیدہ لکھتے ہوئے آخر میں کہتے ہیں۔

گرمی کرے تنک بھی اعانت تری تو پھر یعنی کہ دیکھوں حضرتِ دلی کی پھر نواح	آجائے پختگی پہ مرا یہ خیالِ خام معلوم ہے سوائے ترے حاصلِ کلام
ہفت اقلیم ہر گلی ہے کہیں	دلی سے بھی دیار ہوتے ہیں
دلی کے نہ تھے کوچے اوراقِ مصور تھے	جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی
ہر روز نیا ایک تماشا دیکھا دلی تھی طلسمات کہ ہر جاگہ میر	ہر کوچے میں سو جوان رعنا دیکھا ان آنکھوں سے آہ ہم نے کیا کیا دیکھا

اور قناعت اور توکل استغنا ایک خاص چیز ہے۔ دنیا اور اہل دنیا اُن کی نگاہ میں بے وقعت۔ چھوٹے اور بڑے اُن کے نزدیک یکساں۔ بادشاہ اور فقیر ایک درجہ رکھنے والے ہیں۔ پھر اگر اور کچھ نہیں تو میر صاحب کیا اتنے بے لاگ اور صاف گو بھی نہ ہوتے کہ لوگ اُن کو مغرور سمجھ لیں۔ میر صاحب کے اخلاق وعادات پر نوادر الکلام میں بڑی گہری روشنی ڈالی گئی ہے۔ جسکی یہ عبارت اُس دیوان کے نسخے پر درج ہے جسکا میں ذکر کر چکا ہوں۔ میرے خیال میں اس عبارت کے دیکھنے پر انکے حالات آئینہ ہو جاتے ہیں اور ایک حد تک وہ اس جرم سے بھی بری ہو جاتے ہیں جو غرور وتکبر کی وجہ سے اُن پر لگایا جاتا ہے۔

"مرحوم مردے بود متوکل۔ سپاہی پیشہ۔ رقیق القلب۔ پابند وضع۔ جہاندیدہ۔ سرد وگرم زمانہ چشیدہ سرآمد سخنوران ماضی وحال۔ در سخن سنجی بے مثال۔ کم اختلاط۔ وبا دوستاں سراپا ارتباط۔ سنجیدہ۔ از حرص و ہوائے دنیا آزاد۔ وکسے راکہ نیاز روے۔ ہرگز حملہ براں نیاوردے۔ کسے را بدنمی گفت۔ وبد نمی شنفت۔ استغنائے بیش از بیش۔ بہ تعظیم ہر کہ ومہ پیشا پیش"

یہ چیزیں ہمارے لیے بادی النظر میں نئی معلوم ہوتی ہیں اور خیال ہوتا ہے کہ میر صاحب انسانیت کے بہتر جواہر سے آراستہ تھے یا وقایع نگار نے انکا صحیح حال بیان کرنے میں کوتاہی سے کام لیا۔ پھر بھی پابند وضع کم اختلاط۔ بدنمی شنفت۔ استغنائے بیش از بیش۔ ہمارے سامنے وہی مفہوم پیش کر دیتے ہیں۔ جسکے سب تذکرے گواہ ہیں۔ اور یہی چند فقرے نہیں بلکہ مندرجۂ بالا عبارت کا ہر لفظ اُن کے ایک حال اور ایک صفت پر پوری پوری روشنی ڈالتا ہے۔ جسکی اُن کے حالات اور اُن کی تصانیف سے پوری پوری تائید ہوتی ہے۔

غرضکہ جہاں میر صاحب نہایت خوددار۔ غیور۔ سنجیدہ۔ ظریف۔ دوست اور دوستوں کے قدردان تھے وہاں وہ ہر کس وناکس سے اختلاط بھی نہ بڑھاتے تھے اور دیر آشنائی کے باعث مغرور معلوم ہوتے تھے۔ مگر اُن کے تذکرے اور دوسری تصانیف سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے دوستوں کے لیے حاضر وغائب یکساں تھے۔ اور ہمیشہ اُن کے مداح رہتے تھے۔ معقول بات کے ماننے میں اُن کو کوئی دریغ نہ تھا۔ اسی سے وہ اپنے اس شعر کی زندہ مثال اور بولتی تصویر تھے ؎

حرف وحکایت شکر وشکایت ہے اک وضع وطیرہ پر
میر کو جاکر ہم نے دیکھا ہے مرد معقول کوئی

مغرور و متکبر لکھا ہے۔ اور مولانا آزاد دہلوی نے تو آبحیات میں اسکے متعلق کچھ حکایات ایسی لکھی ہیں جن سے اُن کی بد دماغی جنون و وحشت کی حد تک پہونچتی ہے۔ اگرچہ اسکی بعض محققین نے مخالفت کی ہے۔ مگر اس کو کیا کیا جائے کہ خود میر صاحب ہی کے کلام سے اس کا کافی ثبوت ملتا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

ہے نام مجلسوں میں مرا میرؔ بے دماغ	از بسکہ کم دماغی نے پایا ہے اشتہار
میرؔ کی گرمی تم سے اچنبہ ہے	کس سے ملتا ہے وہ دماغ جلا
جیسی عزت مرے دیوان میں امیروں کی ہوئی	ویسی ہی اُن کی بھی ہوگی مرے دیوان کے بیچ
نازک مزاج آپ قیامت ہیں میرؔ جی	جوں شیشہ میرے منھ نہ لگو میں نشے میں ہوں
تری چال ٹیڑھی تری بات روکھی	تجھے میرؔ سمجھا ہے یاں کم کسو نے
صحبت کسی سے رکھنے کا اسکو نہ تھا دماغ	تھا میرؔ بے دماغ کو بھی کیا ملا دماغ
باتیں کرے برشتگی دل کی پر کہاں	کرتا ہے اس دماغ جلے کا وفا دماغ
دو حرف زیرِ لب کہے پھر ہو گیا خموش	یعنی کہ بات کرنے کا کسکو رہا دماغ
شیریں لباں جہاں کے نہیں چھوٹ جانتے	ہیں گو کہ میر صاحب و قبلہ کم اختلاط

اس کج خلقی۔ بیدماغی۔ نازکمزاجی۔ غرور۔ تکبر کی کئی وجہیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ زمانے کے پے درپے مصائب۔ آئے دن کی مصیبت۔ فاقہ کشی۔ نامرادی نے اُن کو چڑچڑا بنا دیا تھا۔ اور چونکہ وہ دنیا و اہلِ دنیا سے مایوس ہو گئے تھے۔ لہذا بغیر کسی رو و رعایت کے ہر شخص سے وہ باتیں کہہ دیتے تھے جو اُن کے جی میں آتی تھیں۔ اس میں کسی کو بُری بھلی معلوم ہوتی تو وہ اُس کی پروا نہیں کرتے تھے۔ جیسا کہ فرماتے ہیں ؎

کہنا جس سے جو کچھ ہوگا سامنے میرؔ کہا ہوگا	بات نہ دل میں پھر گئی ہوگی منھ پر میرے آئی ہوئی

دوسرے اُن کو اپنے اوائلِ شباب میں جنون ہو چکا تھا۔ اور گو وہ علاج ہونے پر اس سے صحتیاب ہو گئے تھے مگر پھر بھی کسی قدر اس کا اثر باقی تھا۔ جس نے اُن کو بد دماغ مشہور کر دیا تھا تیسری سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اُن کو اپنے کمال کا احساس اسدرجہ بڑھ گیا تھا کہ وہ کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ اور اس میں یہ امتیاز بھی باقی نہ رہا تھا کہ کم از کم اُن ہی لوگوں سے ایسی باتیں کریں جو شعر و سخن سے دلچسپی رکھتے ہوں۔ بلکہ برعکس اس کے وہ ہر شخص سے یکساں پیش آتے تھے۔ (اچھوتے) وہ اُن ہاتھوں اور اُن گودوں کے پرورش یافتہ تھے جن کے نزدیک ریا ایک جرم ہے

مردوں کی ستھئی سی ہے لگ جاتی + یہ مجھ بڑھیا کا کاتا ہے جوانوں کا تماشا ہے ۔ میں نے بعض سن رسیدہ حضرات سے اس کے متعلق دریافت کیا تو اتنا پتہ چلا کہ یہ ایک محلہ تھا جو گومتی کے جنوبی کنارے پر آباد تھا۔ میر صاحب کے بعد بھی عرصہ تک یہ آباد رہا۔ چنانچہ سنا ہے کہ میر آیا کا مکان بھی اسی محلہ میں تھا۔ یہ ممکن ہے کہ میری اس تحقیق میں کمی ہو۔ مگر اس مقام کے ہونے میں شک نہیں۔ بہر حال میر صاحب آخر عمر میں یہیں رہتے تھے۔ اور اگرچہ بعض امراض مزمنہ اور ضعف بصر وغیرہ کی شکایت اُن کو پہلے ہی سے شروع ہو گئی تھی۔ تاہم نہ وہ معذور تھے اور نہ مجبور۔ اپنے تمام فرائض زندگی آسانی سے ادا کرتے تھے۔ اور شعر و سخن میں بھی برابر حصّہ لیتے تھے۔ کہ یکایک آسمان نے نیا دور شروع کیا۔ تین برس اُن کے لیے تین حشر آفریں ہنگامے تھے جنکی وہ تاب نہ لا سکے۔ ایک سال میں اُنکی لڑکی کا انتقال ہوا اور دوسرے میں ایک لڑکے کا۔ اور تیسرے میں اُن کی اہلیہ کا۔ ان حوادث سے وہ نہایت پست اور دل شکستہ ہو گئے۔ اُن کے ہوش و حواس میں ایک وارفتگی سی آگئی۔ اور ایک حد تک گوشہ نشین ہو گئے مشاعروں اور دوسری رنگین مجلسوں میں جانا چھوڑ دیا۔ اور جیسا کہ اوائل حال میں انھوں نے اپنی دہلی والی رنگین معاشرت کا ذکر میر کے ان فقروں میں بیان کیا ہے کہ :-

"ناگاہ در محلہ رسیدم کہ در آنجا می ماندم۔ صحبت میداشتم۔ شعر میخواندم۔ عاشقانہ می زیستم۔ شبہا میگریستم۔ عشق با خوش قداں می باختم۔ ایشاں را بلند می انداختم۔ با سلسلہ مویاں می بودم۔ پرستش نکویاں می نمودم۔ اگر دمے بے ایشاں می نشستم تمنا بر تمنا می شکستم۔ بزم می آراستم۔ خوبان را می خواستم۔ مہمانی می کردم۔ زندگانی میکردم۔"

اُن کا قریب قریب رد عمل ہو گیا۔ اور کیا عجب ہے کہ اس عالم میں وہ شعر و شاعری سے بھی دست کش ہو گئے ہوں۔ اور کچھ بھی نہیں تو وہ ذوق و شوق اور وہ ہنگامی خروش اُن میں رہ گیا ہو۔ جس کے وہ عمر بھر خوگر رہے۔ ذیل کے شعر اُنکے جذبات کے خزینہ دار اور شعر سے بیزاری کے آئینہ دار ہیں۔

لطف سخن بھی پیری میں رہتا نہیں ہے میر	اب شعر ہم پڑھیں ہیں تو وہ شد و مد نہیں
کر فکر اپنی طاقت فکری جو ہو ضعیف	اب شعر و شاعری کی طرف کم لگا دماغ
کس کو دماغ شعر و سخن ضعف میں کہ میر	اپنا رہے ہے اب تو ہمیں بیشتر خیال
بس بہت وقت کیا شعر کے فن میں ضایع	میر اب پیر ہوئے ترک خیالات کرو

اُن میں جیسے حُسن پرستی کا مادہ ودیعت کیا گیا تھا۔ اسی طرح سے درویش مزاجی اور درویشی پسندی اُن کی طبیعت ثانیہ بن گئی تھی۔ ذکرِ میر اور فیضِ میر اسکی شاہد عادل ہیں۔
وہ اپنے اشعار میں اپنی ہمہ دانی کے زعم میں معاصرین پر چوٹیں کرتے رہے ہیں۔ اُنھوں نے اپنے آپ کو نہایت بلند رتبہ شاعر مانا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی ان کی منصف مزاجی۔ ان کی انسانیت۔ اُن کے انکسار نفس کے جوہر بھی کہیں کہیں نمایاں ہو گئے ہیں۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں ؎

نقصان ہوگا اس میں نہ ظاہر کہاں تلک	ہوویں گے جس زمانے میں صاحب کمال ہم
مستعدوں پر سخن ہے آج کل	شعر اپنا فن سو کس قابل ہے میاں
گئی عمر در بند فکر سخن	سو اس فن کو ایسا بڑا کر چلے

ان کے مزاج میں استغنا حد سے زیادہ تھا۔ وہ اپنی خودداری کے سامنے بڑی سے بڑی دولت کو ٹھوکر مار دیتے تھے۔ وہ امرا کی مجالس میں اپنی شان اور اپنی آن بان کو کبھی ہاتھ سے نہ دیتے تھے اور دم کے دم میں اس تاج دولت کو زمین پر ٹپک دیتے تھے جہاں ان کی عزت پر ذرا سا دھبہ لگتا تھا۔ ذکرِ میر میں کئی واقعے اسی قسم کے درج ہیں۔
ان کی وضع سپاہیانہ تھی۔ اور اسی وجہ سے وہ ہر افتاد کو مردانہ برداشت کرتے تھے۔ وہ فقر و فاقے میں بسر کرنا پسند کرتے تھے مگر کسی کے سامنے دست سوال دراز کرنا اُن کے لیے انتہائی مشکل کا سامنا تھا۔ اُن کا لباس۔ اُن کی قطع وضع سپاہیانہ تھی۔ مگر جیسے جیسے ان کا سن بڑھتا گیا۔ ویسے ہی دنیا سے نفرت بھی بڑھتی رہی۔ اور آخر کار وہ دُنیا سے نہایت متنفر ہو گئے تھے۔ اُن کے لیے یہ فیصلہ کرنا کہ وہ متکبر تھے یکطرفہ فیصلہ ہے۔ اُن کی مختصر تعریف یہ ہے کہ وہ انسان تھے اور کامل انسان۔

میر کی وفات

تذکروں سے یہ تو معلوم ہو چکا ہے کہ میر صاحب کا ۱۲۲۵ھ میں لکھنؤ میں انتقال ہوا۔ لیکن اسکے ماسوا تمام تر حالات تاریکی میں تھے۔ مگر نسخہ مذکورہ دیوان میر جلد چہارم قلمی سے وہ تمام باتیں معلوم ہو گئیں۔ جن سے اُن کے حالات کی تکمیل قرار واقعی ہوتی ہے۔ میر صاحب اپنی عمر کے حصۂ آخر میں لکھنؤ کے محلہ سٹھی میں رہتے تھے گو یہ جگہ آج نہیں ہے اور اکثر لوگ اب اس سے بیخبر ہیں۔ مگر یہ محلہ تھا اور اس وقت میں کافی آبادی تھی۔ جان صاحب اپنے ایک شعر میں اس نام کو لائے ہیں ؎ جہاں جاتی ہے

توصیف میں رطب اللسان ہے۔ مگر ہم ان سب سے زیادہ خود میر صاحب پر بھروسہ کرتے ہیں وہ باکمال شاعر ہی نہیں۔ کامل نقاد بھی ہیں۔ اُنکی اپنے کلام کی بابتہ جو رائے اور جو احساس ہے اُسکو بجنسہٖ پیش کیے دیتے ہیں۔ اسکے بعد دوسروں کی تنقید و تحسین۔ تقریظ و آفرین کی گنجایش ہی نہیں رہتی۔ اُنھوں نے بارہا اپنے کلام پر غائر نظر ڈالی۔ اور کچھ نہ کچھ کہہ گئے سنیئے فرماتے ہیں۔

ریختہ رتبے کو پہونچایا ہوا اُس کا ہے
معتقد کون نہیں میر کی اُستادی کا

نکتہ دانانِ رفتہ کی نہ کہو
بات وہ ہے جو ہووے اُنکی بات

جو دیکھو مرے شعرِ تر کی طرف
تو مایل نہ ہو پھر گہر کی طرف

میر گم کردہ چمن زمزمہ پرواز ہے ایک
جسکی لے دام سے تا گوشِ گل آواز ہے ایک

پڑھتے پھریں گے گلیوں میں ان ریختوں کو لوگ
مدت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں

ریختہ خوب ہی کہتا ہے جو انصاف کرو
چاہیئے اہلِ سخن میر کو استاد کریں

ہو طرف مجھ پہلواں شاعر کا کب عاجز سخن
سامنے ہونے کو صاحب فن کے قدرت چاہیئے

نہ رکھو کان نظمِ شاعرانِ حال پر اتنے
چلو ٹک میر کو سُننے کہ موتی سے پروتا ہے

مری خلق محوِ کلام سب تھے چھوڑتے ہیں خموش کب
مرا حرف رشکِ کتاب ہے مری بات لکھنے کا باب ہے

دل کسطرح نہ کھینچیں اشعار ریختے کے
بہتر کیا ہے میں نے اس عیب کو ہنر سے

تربتِ میر پر ہیں اہلِ سخن
ہر طرف حرف ہے حکایت ہے

تو بھی تقریب فاتحہ سے چل
بخدا واجب الزیارت ہے

اس فن میں کوئی بے تہ کیا ہو مرا معارض
اوّل تو میں سند ہوں پھر یہ مری زباں ہے

نکتہ مشتاق و یار ہے اپنا
شاعری تو شعار ہے اپنا

اس زمیں میں غزل اک اور بھی موزوں کر میر
پاتے ہیں زور ہی لذت تری گفتار کے بیچ

مرغِ چمن نے زور رُلایا سبھوں کے تئیں
میری غزل پڑھی تھی سب اک زمزمہ خواں کیطرح

یک پرچۂ اشعار سے مُنھ باندھے سبھوں کے
جادو تھا مرے خامے کی گویا کہ زباں میں

ہر چند ہے سخن کو تشبیہ دُر سے لیکن
باتیں مری سُنو تم پھینکو دو گہر کو

اشعار میر پر ہے اب ہائے وائے ہر سو
کچھ سحر تو نہیں ہے لیکن ہوا تو دیکھو

سحر ہی ہے جو کہتے ہیں شعرِ میر ہے سحر
زبان خلق کو کسطرح کوئی بند کرے

بہت ہرزہ گوئی کی یہاں میر صاحب	کر وہاں کے کچھ منھ دکھانے کی باتیں

وہ ایک مدت تک اسی عالم میں بسر کرتے رہے۔ انقباض مزاج کے ساتھ ساتھ نظام صحت میں اختلال پیدا ہو گیا۔ عوارض مزمنہ نے ترقی شروع کی۔ دو مرض قدیمی انیس جلیس تھے۔ اُن میں زیادتی ہونے لگی۔ چنانچہ وجع مفاصل اور درد قولنج میں ترقی ہونا شروع ہوئی۔ اور اواخر ماہ ربیع الآخر ہی میں اُنھوں نے امراض مہلک کی صورت اختیار کر لی۔ تمام شاہی طبیب اور مشہور معالج میر صاحب کے شناسا اور دوست تھے۔ علاج معالجے شروع کیے اور سب کی یہ رائے ہوئی کہ لگ کر اور جم کر علاج کرنا چاہیے۔ اور فی الحال الیسی وا دینا چاہیے کہ قبض نہ رہنے پائے۔ اسکے بعد ایک تلئین دی گئی۔ اور اُس نے سم قاتل کا کام کیا۔ اطلاق بطن شروع ہو گیا۔ اور ایک ایک دن میں ڈیڑھ ڈیڑھ سو دست آگئے۔ آخر کار مرض موت سے جا ملا۔ اور ۲۰ شعبان المکرم ۱۲۲۵ھ وقت شام نوّے سال عمر پوری کرکے دنیائے فانی کو خیر باد کہا۔ اور ۲۱ شعبان ۱۲۲۵ھ روز شنبہ دوپہر کے وقت اکھاڑہ بھیم میں جو ایک مشہور قبرستان تھا اپنے اعزا و اقربا کی قبروں کے پاس سپرد خاک کیے گئے۔ قریب قریب چار سو آدمیوں نے اُن کے جنازے کی نماز پڑھی اور بہت سے عقیدتمندوں نے غائبانہ اس فریضہ کو ادا کیا۔ اور بعض شعرا نے تاریخیں کہیں۔ جن میں سے دو تاریخیں ہم نقل کر چکے ہیں۔ اور ناسخ کی تاریخ ؎ واویلا مرد شہ شاعراں + مشہور ہے۔ ۱۲۲۵ھ

میر صاحب اگرچہ شعر و شاعری کی محفلوں کو مدت سے الوداع کہہ چکے تھے۔ مگر اُن کا ذوق سخن آخر وقت تک جاری تھا۔ اور کچھ نہ کچھ فرماتے ہی رہتے تھے۔ چنانچہ آخر وقت میں اُنھوں نے یہ شعر نظم کیا تھا ؎

ساز بسیج آمادہ ہے سب قافلے کی تیاری ہے
مجنوں ہم سے پہلے گیا ہے اب کے ہماری باری ہے

میر بحیثیت شاعر

کوئی نقاد کوئی محقق کوئی تذکرہ نویس۔ کوئی وجدان صحیح کا مالک ایسا نہیں ہے جس نے میر صاحب کی جناب میں ہدیۂ عقیدت اور گلہائے تحسین و آفرین پیش کیے ہوں۔ بندگان شعر نے خوشی کے ساتھ اُن کو خدائے سخن مانا۔ اور اُن کی ہر صدائے الست پر بلے کہا۔ شیفتہ گلشن بیخار میں انکو اشعر شعرا۔ میر حسن افصح فصحائے زماں قائم شمع انجمن عشقبازاں شفیق میر میدان سخنوری کہتے ہیں۔ اور اسی طرح ہر ایک شخص انکی

(۳) شعر میں زبان اور روزمرہ نہایت صاف ہو۔ روانی کو کسی صورت میں ہاتھ سے نہ دینا چاہیئے۔ رکیک خیالات اور عوام کے جذبات وعادات یا گفتگو سے شعر کو کوئی لگاؤ نہ ہو۔ نکات الشعرا میں قدر کے متعلق فرماتے ہیں کہ "زبان او بہ زبان لوطیاں می ماند"۔

گفتگو ریختے میں ہم سے نہ کر
یہ ہماری زبان ہے پیارے

حسن تو ہے ہی کرو لطف زباں بھی پیدا
میر کو دیکھو کہ سب لوگ بھلا کہتے ہیں

دیکھو تو کس روانی سے کہتے ہیں شعر میر
دُر سے ہزار چند ہے اُنکے سخن میں آب

(۴) شعر میں کوئی خاص انداز بیان اور کوئی نادر بات ہونا چاہیئے۔

کچھ ہوا سے مرغ قفس لطف نہ جاؤ اُس سے
نوحہ یا نالہ ہر اک بات کا انداز ہے ایک

میر شاعر بھی زور تھا کوئی
دیکھتے ہو نہ بات کا اُسلوب

لطف سا پیچدار ہے ہر شعر
ہے سخن میر کا عجب ڈھب کا

شعر میرے ہیں سب خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

سمجھے انداز شعر کو میرے
میر کا سا اگر کمال رکھے

(۵) شعر میں وہی ترکیب فارسی لانا جائز ہے جو زباں پہ بار نہ ہو۔ اس فرق کو غیر شاعر نہیں سمجھ سکتا۔ اور جو ترکیب زبان ریختہ سے مانوس نہ ہو اس کا استعمال معیوب ہے اس بات کا سمجھنا بھی سلیقۂ شاعری پر موقوف ہے۔

(۶) متقدمین میں ایہام کا بڑا رواج تھا اور اب اساتذہ اس کو پسند نہیں کرتے۔ مگر جبکہ نہایت شستگی اور رفتگی سے اسکا استعمال کیا جائے۔ ایک جگہ میاں احسن اللہ کے ذکر میں نکات الشعرا میں کہا ہے "مائل بایہام بود۔ ازیں جہت شعر او بے رتبہ ماند"

کیا جانے دل کو کھینچیں ہیں کیوں شعر میر کے
کچھ طرز ایسی بھی نہیں ایہام بھی نہیں

(۷) تنافر سے کلام کو پاک کرنے کی کوشش ضروری ہے۔

فہم حرفوں کے تنافر کا بھی یاروں کو نہیں
اس پہ رکھتے ہیں شعر سب مری صحبت سے یہاں

(۸) شاعر کو محاورے میں تصرف کرنا جائز نہیں۔ چنانچہ میر سجاد کے اس شعر پر اُنھوں نے اعتراض کیا ہے ؎

میرا جلا ہوا دل مژگاں کے کب ہے لائق
اس آبلے کو کیوں تم کانٹوں میں اینچتے ہو

(۹) جو طرز کلام اور انداز شعر گوئی میر صاحب نے خود اختیار کیا تھا وہ تمام

ریختہ کا ہے کو تھا اس رتبۂ اعلیٰ میں میر
جو زمیں نکلی اُسے تا آسماں میں لے گیا

فنِ اشعار میں ہوں پہلواں میر
مجھے ہے یاد اس کشتی کا ہر بند

سخن کے ملک کا میں مستقل امیر ہوں میر
ہزار مدعی بھی مجھ کو دو ولا نہ کریں

اے میر شعر کہنا کیا ہے کمالِ انساں
یہ بھی خیال سا کچھ خاطر میں آگیا ہے

شاعر نہیں جو دیکھا تو ہے کوئی ساحر
دو چار شعر کہہ کر سب کو رجھا گیا ہے

ہر ورق ہر صفحے میں اک شعر شور انگیز ہے
عرصۂ محشر کا عرصہ ہے مرے دیوان کا

رونق آبادی ملکِ سخن ہے اس تلک
ہوں ہزاروں دم الٰہی میر کے اک دم کے بیچ

نہ ہوئے ہم نظیری سے یوں تو
شعر کے فن میں بے نظیر ہوئے

میر صاحب کے اصول شاعری

شاعر اور خصوصاً ایک کامل الفن اور ماہر شاعر کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے اوپر کچھ ایسے قیود عائد کرے اور کچھ ایسے قواعد اور کلیے مقرر کر لے جو اسکے کلام کو دوسرے شعرا سے اچھا نہ بنا سکیں تو متمیز کر دیں۔ میر صاحب بھی چند باتوں کو پسند کرتے تھے اور چند کو ناپسند۔

(۱) اُن کا خیال ہے کہ شاعری اک فنِ شریف ہے۔ اور شریف ہی اس فن کو اختیار کرتے تھے۔ اجلاف کا اس کوچے میں گزر نہیں۔

صحبتیں جب تھیں تو یہ فنِ شریف
کسب کرتے جنکی طبعیں تھیں لطیف

تھے میز درمیاں انصاف تھا
خار و خس سے کیا یہ عرصہ صاف تھا

دخل اس فن میں نہ تھا اجلاف کو
کچھ بتاتے بھی تھے سو اشراف کو

تھے جو اُس ایام میں اُستادِ فن
ناکسوں سے وے نہ کرتے تھے سخن

ہم تلک بھی تھی وہی رسمِ قدیم
یعنی جن کے ہوتے تھے ذہن سلیم

پیار کرتے تھے اُنھیں اُستادِ فن
اُن کے ہوتے رہبرِ راہِ سخن

جلف داں زنہار پاتے تھے نہ بار
شاعری کا ہے کو تھا ان کا شعار

نکتہ پردازی سے اجلافوں کو کیا
شعر سے بزازوں ندافوں کو کیا

(۲) شعر کے لیے علمی قابلیت اور معلومات فن کا ہونا از بس ضروری ہے۔ چنانچہ اسی بارہ میں مثنوی تنبیہ الجہال میں اُنھوں نے وزیر اصفہان اور ملالی کا قصہ بیان کیا ہے۔[1]

[1] مثنوی تنبیہ الجہال ۱۲

ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا	نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب

یہ دیکھ کر قدرتاً سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسکی وجہ کیا ہے کہ وہ بغیر شرکت احدے اس جذبہ حزنیہ۔ اور اس واردات قلبیہ کے مالک ہیں۔ اور اسکے جواب میں یہ بات بھی آسانی سے کہی جا سکتی ہے کہ ؎ قبول خاطر و لطف سخن خداداد است + مگر ساتھ ساتھ اُنکی عاشق مزاجی، اُنکی فطرت حسن پرست۔ اور اُن کے تلخ تجربات۔ اُنکی نامرادانہ زندگی۔ اُنکے انقلاب انگیز احول کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جنکی وجہ سے یہی درد و اثر۔ برشتگی و شیفتگی۔ حرمان و مایوسی۔ اضطراب و قلق فطرت ثانیہ بن کر اُن کے تغزل کا وہ نمایاں جوہر بن گئے کہ آج دیکھنے والوں کی سب سے پہلی نظر اسی خوبی پر پڑتی ہے۔ کوئی اسکو بہتر نشتر سے تعبیر کرتا ہے۔ اور کوئی کہتا ہے کہ وہ اسی کے لیے پیدا ہوئے تھے چنانچہ خود بھی کہتے ہیں ؎

درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا	ہم کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب ہم نے

پھر اگر زندگی کی واردات۔ عشق کے واقعات کو ایک سادہ اور پُر کیف زبان میں نہ بیان کیا جائے تو اس کا دوسروں پر اس درجہ اثر پڑنا غیر ممکن ہے۔ ہزاروں بلکہ لاکھوں شاعر ہوا کیے ہیں جنھوں نے عمر بھر یہی رونا رویا۔ ہجر و فراق کے مصائب بیان کر کے وحشت جنون بیاباں گردی۔ ناصح کی ملامت۔ رقیبوں کی شرارت کے نقشے کھینچتے رہے۔ مگر دنیا نے اُن کو آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ کہ کون ہے اور کیا کہہ رہا ہے۔ لا محالہ ضرورت ہوئی کہ اس چیز کو تجزیہ کر کے بتایا جائے جو میر کے کلام میں پوشیدہ ہے۔ مگر دشواری اور بڑی دشواری یہ ہے کہ فنون لطیفہ خواہ وہ شاعری ہو۔ خواہ مصوری۔ خواہ موسیقی تجزیہ کے بار کی متحمل نہیں ہو سکتے ہے۔ اور فنون لطیفہ کیا میں تو یہ کہتا ہوں کہ کوئی حسن نہ تجزیہ کا بار اُٹھا سکتا ہے اور نہ کوئی عشق تجزیہ کا خواستگار ہو سکتا ہے۔ کیا عجب ہے کہ میر نے ایسے ہی موقع پر کہا ہو ؎

کچھ ایسی طرز بھی نہیں ایہام بھی نہیں	کیا جانوں دل کو کھینچیں ہیں کیوں شعر میر کے

پھر بھی جہانتک غور کیا جاتا ہے اُن کے انھیں جذبات میں کئی چیزیں شامل ہیں اور ان کی شمولیت روح و جسم۔ آب و رنگ کی شمولیت ہے جس کا جدا کرنا اور جدا ہونا محال ہے ؎

ایک خانہ خراب ہیں دونوں	یہ جو چشم پُر آب ہیں دونوں

صنایع بدایع کا حاوی اور حامی تھا۔ تجنیس۔ ترصیع۔ تشبیہ۔ صفائے گفتگو۔ فصاحت۔ بلاغت۔ ادا بندی۔ خیال اُس میں سب پائی جاتی تھیں۔ اور یہی اُن کو پسند بھی تھا۔ اس لیے کہ زمانہ کی روش یہی تھی۔ مگر ان سب چیزوں سے صرف شعر کے خارجی پہلو پر روشنی پڑتی ہے داخلی اوصاف کے متعلق بھی اُن کے یہ خیال ہیں۔

(۱۰) شعر جذبات دل کا آئینہ ہونا چاہیئے۔ اور جو کچھ کہ کہا جائے اُسے تاثیر و تاثر کے ساتھ روح و جسم کا سا قرب حاصل ہو۔ خواہ وہ استعارہ ہی کیوں نہو۔

کیا تھا ریختہ پردہ سخن کا	سو ٹھہرا ہے یہی اب فن ہمارا
اس پردے میں غم دل کہتا ہے میر اپنا	کیا شعر و شاعری ہے یارو شعار عاشق
مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے	درد و غم کتنے کیے جمع سو دیوان کیا
بے سوز دل کنھوں نے کہا ریختہ تو کیا	گفتار خام پیش عزیزاں سند نہیں

(۱۱) شاعری کو صرف گل و بلبل کے افسانوں تک محدود نہ ہونا چاہیئے۔ بلکہ وہ اس سے بہت وسیع چیز ہے۔ اسی بنا پر اُنھوں نے تاباں کی روش پر نکات الشعرا میں یہ کہکر اعتراض کیا ہے۔ "ہر چند عرصہ سخن او ہمیں در لفظہائے گل و بلبل تمام است۔ امابیار بہ تمکین میگفت"۔

یہ سب چیزیں وہ ہیں جن کا میر صاحب کے اشعار اور نکات الشعرا سے پتہ چلتا ہے۔ مگر اُن کے کلام میں جو چیزیں پائی جاتی ہیں۔ اجمالی طور پر ہم اُنکو بیان کرتے ہیں۔

میر کے کلام پر ایک مجمل تبصرہ

متقدمین کی شاعری کے متعلق نقادین کی عام رائے ہے کہ وہ شاعری کے داخلی پہلو کے مقابلہ میں کبھی خارجی پہلو کو نہیں لیتے۔ لباس۔ زیور۔ حتی کہ سراپا وغیرہ کی کوئی پروا نہیں۔ بلکہ اس کی جگہ جذبات عشقیہ۔ سوز و گداز۔ ناکامی کے بیان۔ محاکات۔ معاملہ بندی وغیرہ کو ترجیح دیتے ہیں۔ میر صاحب بھی انھیں لوگوں میں سے ہیں۔ وہ بھی حزن والم کی ایک تصویر ہیں۔ برشتگی اور دردمندانہ خیالات اُن کے رنگ تغزل کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اور بلا مبالغہ اپنے معاصرین اپنے متقدمین۔ اپنے متاخرین سب سے بڑھے ہوئے ہیں۔ اور اتنے بڑھے ہوئے کہ اُنکے بعد کے بڑے بڑے باکمالوں نے اُن کے نقش قدم پر چلنے کا ارادہ کیا اور سخت سے سخت کاوشوں اور کوششوں کے بعد بھی اُن تک نہ پہونچنے پر اپنی ناکامی کا نہایت ہمت شکن الفاظ میں اعتراف کیا جیسے (ذوق)

اُنھیں کا مقلد سمجھنا چاہیئے۔ باوجود اسکے یہ بھی امر واقعہ ہے کہ اکثر مثنویات جس میں کتے، بلی بکری اور مرغ وغیرہ کے قصے درج ہیں نہایت گری ہوئی ہیں۔ بعض مثنویوں میں ہندی کے ٹھیٹھ اور ثقیل الفاظ ہیں۔ بعض میں محض قصے نظم ہیں۔"

اسی طرح میرے دوست مجنوں گورکھپوری نے رسالہ ایوان جنوری ۳۵ء میں میرصاحب کی مثنویات کی بابتہ یہ رائے دی ہے۔ "غزل کے بعد میر اگر کسی صنف میں ممتاز ہو سکتے ہیں تو وہ مثنوی بالخصوص عشقیہ مثنوی ہے۔ اور وہ اس لیے کہ عشقیہ میں تغزل کا رنگ بڑی حد تک نباہا جا سکتا ہے۔"

میرے نزدیک جیسے یہ رائیں نہایت سرسری ہیں اُسی طرح میرحسن اور نواب مرزا شوق کو میر صاحب کا مقلد قرار دینا محل تامل ہے۔ کیونکہ میر صاحب کی عشقیہ مثنویاں نہایت صاف۔ رواں۔ آورد سے پاک وصاف ہیں۔ اُن کے بیان کی سلاست اور روانی سے صاف صاف معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے قصداً کسی چیز کے بیان کا اہتمام نہیں کیا ہے۔ بلکہ بے تکلفانہ جو قلم سے نکلتا گیا اُس کو لکھتے چلے گئے۔ اسی واسطے اگر تجزیہ کیا جائے تو اکثر مواقع پر اُن کے بیانوں میں کمی نہیں بلکہ ایک تشنگی سی محسوس ہوتی ہے۔ بخلاف اسکے میرحسن نے اپنی تلاش اور جستجو سے ہر منظر اور ہر محل کے مطابق اُس محل کی ضروریات کو قصداً جمع کرکے بیان کیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اُنکی زبان کی گھلاوٹ اور روانی کہیں بھی اس بات کو ظاہر نہیں ہونے دیتی کہ یہاں آورد کا جال بچھا ہوا ہے۔ یہی حال شوق کا ہے کہ وہ زبان کی شستگی اور محاورات کے پھیر میں گم ہو جاتے ہیں۔ اور چونکہ وارداتِ قلبی کو بھی نہایت ملائم الفاظ میں محاورات اور روزمرہ کا زیور پہنا کر لاتے ہیں۔ اس واسطے پتہ نہیں چلتا کہ یہ آمد ہے یا آورد۔ بہرنوع میر صاحب کی عشقیہ مثنویاں نہایت صاف اور ان باتوں سے بری ہیں۔ اور پھر مثنوی کے لیے جو چیزیں ضروری ہیں وہ بھی اُن کے ہاتھ سے نہیں جاتیں۔ تسلسل کا سررشتہ نہایت مضبوط ہے۔ مبالغہ سے پاک اغراق اور غلو سے مُبرّا ہیں۔ تشبیہیں کم ہیں۔ مگر جہاں کہیں ہیں وہ بہت بلند ہیں۔ پھر بھی اس بات سے انکار نہیں کہ وہ مثنوی کے موجد ہیں اور اس قسم کے قصوں کو شاید اُردو میں پہلے انھوں نے ہی نظم کیا ہے اگرچہ اُن کے دورِ حیات ہی میں اس کی کثرت ہوئی اور اُنکے اکثر معاصرین نے مثنویاں لکھیں جسکے بعد میر کی اُستادی کے احترام کے سوائے کوئی خاص امتیازی شان ان میں باقی نہیں رہی۔

کہنے والے حکیم عمر خیام۔ فریدالدین عطارؒ۔ ابوسعید ابوالخیرؒ۔ سحابی وغیرہم کے یہاں برابر یہی روش اور یہی انداز کارفرما ہے۔ مگر ریختہ گویوں نے اسکی زیادہ پابندی نہیں کی۔ میر صاحب نے بھی سو سوا رباعیاں کہیں۔ مگر اُن کے مصرف صحیح کے پابند نہ رہنے کی وجہ سے اُنکی رباعیاں اس درجہ پہونچ سکیں۔ البتہ خواجہ میر دردؒ نے اُردو اور فارسی میں جسقدر رباعیاں کہیں وہ اسو قت کے لحاظ سے بہترین نمونہ ہیں۔ دور موجودہ میں اُردو میں چند رباعی کے کہنے والے ایسے پیدا ہو گئے ہیں جنکے سامنے پچھلے لوگوں کی رباعیاں دیکھنے کو جی بھی نہیں چاہتا۔

مخمس و مسدس ترکیب بند ترجیع بند مخمس۔ مسدس۔ ترجیع بند میں سے اکثر کو اُنھوں نے اپنے معتقدات مذہبی کے لیے مخصوص کیا ہے۔ چنانچہ ایک ہفت بند۔ ایک ترجیع بند۔ دس مخمس۔ تین مسدس میں صرف منقبت کہی گئی ہے۔ اور ایک مسدس میں نعت ہے۔ اور اس سے اُن کے خلوص عقیدت کا پتہ چلتا ہے۔ تین مخمس ایسے ہیں جن میں اپنی یا دوسروں کی غزلوں کی تضمین ہے۔ دو ترکیب بند عاشقانہ ہیں اور خوب ہیں کچھ مثلث ہیں جنھیں بھی صرف تضمینیں ہیں۔ اور چار مخمسات میں ہجویات ہیں جن کا ذکر ہجویات میں مناسب ہوگا۔

واسوخت واسوخت کا میر صاحب کو موجد بتایا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو۔ مگر اس قسم کی نظمیں بعض پہلے بھی کہی گئی تھیں۔ اور اُسکے نمونے اُردو فارسی میں موجود ہیں میر صاحب کے واسوختوں میں اُن کے متبعین کا ساز ورنہیں ہے۔ مگر اَلْفَضْلُ لِلْمُتَقَدِّم کے بموجب وہ قابل مبارکباد ضرور ہیں کہ اُنھوں نے ایک ایسا راستہ نکالا جسپر متاخرین بڑی آسانی سے گام زن ہو سکے۔

ہفت بند۔ ممکن ہے کہ اُردو میں نئی چیز ہو۔ اسکو دیکھ کر ملا محتشم کاشی کا ہفت بند یاد آجاتا ہے۔ پھر بھی میر صاحب کی کوشش رائگاں نہیں ہے۔ اور اگرچہ وہ منقبت کے لیے مخصوص رکھا گیا ہے مگر نہایت عُمدہ ہے۔

مثنویات۔ غزل کے بعد سب سے زیادہ یہی چیز میر صاحب کے یہاں قابل ذکر ہے بعض محققین کا خیال ہے کہ وہ غزل کی طرح مثنوی کے اُستاد نہیں۔ بلکہ مثنوی میں اُن کا کوئی خاص درجہ نہیں یہ رائے پایۂ تحقیق اور درجۂ اعتبار سے ساقط ہے۔ سر شاہ سلیمان صاحب نے انتخاب مثنویات میر میں مولوی عبدالسلام صاحب مصنف شعر الہند کا یہ قول نقل کیا ہے۔ وہ مثنویات کے موجد اور عمدہ نمونہ ہیں۔ اسمیں قدرتی انداز ہے۔ انھیں کی بدولت مثنوی کو ترقی ہوئی۔ میر حسن اور شوق کو

مدحیات میر ابنائے ملوک۔ اُمرا۔ اور اہلِ دول کی مدحیات میں میر صاحب کا رتبہ سودا سے زیادہ بلند نہیں ہے اور اسکی وجہ اُنکی فطری کبیدگی۔ افسردہ خاطری۔ استغنا۔ خودداری سے زیادہ نہیں۔ وہ خوشامد۔ درباردار ی اور اُسکے نشیب و فراز سے یا واقف ہی نہ تھے۔ یا واقف تھے تو ان کا تحمل اُنکی نازک دماغی سے ہو نہ سکتا تھا۔ اسی وجہ سے اُن کو اس قسم کی مدحیات میں جو زیادہ تر قصیدوں سے وابستہ ہوتی ہیں۔ دوسرے حریفوں کی طرح کامیابی تو نہ ہوئی۔ مگر اسکے یہ معنی بھی نہیں ہیں کہ ان کا اس چیز میں کوئی درجہ ہی نہیں۔ بلکہ پختگی کلام۔ معلومات فن۔ تخئیل کی کارپردازی وغیرہ یہ تو سب کچھ ہے۔ اگر نہیں ہے تو شان نیازمندی کا وہ جوش اور ممدوح کی جا و بیجا حمایت کا وہ خروش نہیں جو قصیدے کی جان اور قصیدہ نگار کی ارفع و اعلیٰ شان ہے۔

ہجویات میر قبل اسکے کہ ہجویات پر کوئی غائر نگاہ ڈالی جائے۔ یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ کسی ہجو کرنے والے کو ہجو کی ضرورت کئی وجہوں سے ہوتی ہے۔ یا ذاتی مخاصمت کی بنا پر خواہ اُسکے وجوہات کچھ بھی کیوں نہ ہوں۔ یا کسی فعل کسی رسم کو قبیح سمجھنے پر۔ یا کسی دور کی سوسائٹی کی مختلف خرابیوں پر۔ یا کسی جماعت یا اس جماعت کے کسی فرد کے اخلاق و عادات کو بُرا جاننے پر۔ یا فطرتاً اور طبعاً کسی شئے سے تنفر کرنے اور اُسکو مکروہ سمجھنے پر۔ یا کسی شخص اور کسی چیز سے اذیت اُٹھانے پر۔ یا صرف تمسخر اور تضحیک کی نیت سے۔ یا حکومت و ارکان حکومت کی خامیوں پر۔ یا مذہب اور رسم و رواج کے تعصب پر۔ غرض ایسی ہی چیزیں ہیں جو ہجو کی بانی ہوتی ہیں۔

ہجو میں طعن۔ طنز۔ تشنیع۔ پھبتی۔ ظرافت۔ تمسخر وغیرہ سبھی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور کبھی محض ایک چیز ہی پر پوری ہجو کا انحصار ہوتا ہے۔ اسی طرح ذاتیات کو بھی ہجو میں پورا دخل ہوتا ہے۔ مگر وہ ہجو بدترین ہجو ہے جسمیں ذاتیات کے جھگڑوں کو بروئے کار لایا گیا ہو۔ یا اس میں مذہبی تعصبات کو دخل دیا گیا ہو۔ یا فواحش سے زبان قلم کو آلودہ کیا گیا ہو۔ یہ بات سودا کے یہاں بہت زیادہ ہے۔ بخلاف اسکے میر صاحب کا دامن زیادہ تر ان الواث سے پاک و صاف ہے۔ اُنھوں نے نہ کہیں مذہبیات کی طرف رُخ کیا ہے۔ اور نہ اختلاف مذہب کے سبب سے حریفوں کو بُرا کہا ہے۔ نہ سودا کی طرح کسی کی بہو بیٹیوں کو گالیاں دیکر تمسخر کیا ہے۔ بلکہ اُن کی تمامتر ہجویات کوئی نہ کوئی اصلاحی پہلو لیے ہوئے ہیں۔ چنانچہ میرے نزدیک سب سے زیادہ ہجو بلا سس راسے کی ہے جس میں میر صاحب کچھ نہ کچھ اپنی حدود مقررہ سے بڑھ گئے ہیں

اب اُن مثنویوں کو دیکھنا بھی نہایت ضروری ہے جن کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ بہت گری ہوئی ہیں۔ سب سے پہلے یہ بات ملحوظ رہنا چاہیئے کہ عشقیہ مثنویاں جو اُردو میں شروع ہوئیں وہ صرف فارسی کا اتباع ہیں۔ اور یہ بات چھپی ہوئی نہیں ہے کہ فارسی میں بہتر سے بہتر رزمیہ اور بزمیہ مثنویاں ہیں جو شاعری کی داخلی اور خارجی خوبیوں سے بھری ہوئی ہیں۔ مناظر کے نقشے۔ محاکات کی خوبیاں۔ زبان کی لطافت۔ بیان کی صفائی۔ سبھی کچھ اُنمیں موجود ہے پھر اگر اُن کو دیکھتے ہوئے زبان اُردو میں بھی اس قسم کی چند مثنویاں پیش کی گئیں تو کچھ زیادہ نئی بات نہیں۔ بخلاف اس کے ایسی چیزیں جن پر میر صاحب نے قلم اُٹھایا ہے فارسی میں بھی بہت کم ہیں اُردو میں تو اُن سے پہلے ہونے کا کوئی ذکر ہی نہیں۔ دنیا۔ جھوٹ۔ ہولی۔ اژدر نامہ۔ تنبیہ الجہال۔ تعریف آغا رشید۔ مذمت آئینہ دار۔ کتّے کے پالنے والے کی ہجو۔ ہجو کول مرغ بازی۔ غم نداری بُز بخر۔ بوزنہ۔ موہنی بلّی۔ کتّے بلّی کی دوستی۔ خروس وغیرہ۔ یہ سب ندرت سے خالی نہیں ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ شاعر کے لیے نہ ان میں بیان کی وسعت کی گنجائش ہے۔ نہ تخئیل کی بلندی کا امکان ہے۔ نہ مناظر ہیں۔ نہ مراحل ہیں۔ نہ باغ ہے جس میں روشوں درختوں اور پھولوں کی تعریف کی جائے۔ نہ آبجو ہے۔ نہ ساقی و شراب ہے۔ نہ مغنی و رباب ہے۔ پھر بھی اپنے زورِ بیان کی عظمت کو بہترین الفاظ۔ برجستہ محاورات کے برمحل استعمال سے قائم رکھنا اور وہ سب چیزیں جو بڑے قصّوں کی مثنویوں میں ہوتی ہیں اسی میں لے آنا کس قدر دشوار چیز ہے۔ پھر جب یہ سب چیزیں اُنکی اس قسم کی مثنویوں میں موجود ہیں تو اُنکو نظرانداز کرنا زیادتی کے مترادف نہیں تو اور کیا ہے۔

اب ذرا اُن مثنویوں کو بھی دیکھیے جن میں اُن کو تفصیل کی گنجائش مل گئی ہے۔ اپنے گھر کا حال۔ برسات کی شکایت۔ وہ سفر جو برسات کے زمانہ میں کیا تھا اور جو نسنگ نامے کے نام سے موسوم ہے۔ کتخدائی آصف الدولہ۔ دونوں شکارنامے۔ یہ وہ چیزیں ہیں جن میں مناظر۔ قدرتِ بیان۔ کثرتِ الفاظ۔ محاکات۔ حُسنِ بیان۔ ربط و تسلسل وغیرہ اس حد تک ہیں کہ اُن کو دیکھ کر اقرار کرنا پڑتا ہے کہ وہ مثنوی کے بلاشرکتِ غیرے مالک ہیں۔ اور گو عشقیہ مثنویوں میں اُن کے حریف بھی ہیں۔ مگر ان میں ان کا کوئی جواب نہیں دے سکا۔ اور یہ ایسے شاہکار ادب ہیں جو زبانِ اُردو کے سرمایہ کے لیے باعثِ ناز ہیں۔

اُن کی ہجویات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہجو تو ضرور کر رہے ہیں۔ مگر دل کے بُرے نہیں وہ زبان سے سب کچھ کہتے جاتے ہیں۔ مگر عداوت کے غبار سے ان کا دل پاک ہے۔
اُن کی ہجویات پتہ دیتی ہیں کہ وہ مجبوراً زمانے کی روش سے تنگ آکر کچھ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ورنہ اُن کو کسی سے عداوت ذاتی نہیں۔ ہجویات میں اُن کا مدمقابل اُن کا معاصر سودا ہے۔ اور اسکو اس فن خاص میں اُن سے بہت آگے بتایا جاتا ہے۔ اگر بیباکی۔ شوخ طبعی تمسخر۔ تلخ گوئی۔ فحاشی ہی کا نام ہجو ہے تو بیشک یہ خیال درست ہے۔ ورنہ اصل یہ ہے کہ میر طنز و تعریض کے لیے پیدا ہوئے تھے۔ چنانچہ صرف ہجو ہی نہیں اُن کے متین کلام میں بھی طنزیات اس درجہ کے ہیں کہ جنکا کہیں جواب نہیں۔ اور ہجو تو طنز کی اتنی محتاج ہے کہ جتنی دوسری چیز کی نہیں پھر ان کی ہجویات پر دوسروں کی ہجویات کو ترجیح دیدینا بے سوچے سمجھے ایک بات کہدینا ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ اُن کی طنزیات کہیں بھی حاسدانہ اور مخاصمانہ انداز کی نہیں ہیں۔ بلکہ ہر جگہ معلوم ہوتا ہے کہ طنز کرنے والا ایک پُرسوز دل رکھتا ہے۔ وہ جس آگ سے خود جلا ہے اس سے دوسرے کو بھی جلانا چاہتا ہے اور بس۔

تصانیف میر (۱) کلیات نظم اُردو جس میں غزلیات کے چھ دیوان۔ مثنویاں۔ تضمینیں۔ قطعات۔ رباعیات۔ ترکیب بند۔ ترجیع بند۔ واسوخت۔ قصاید۔ وغیرہ سبھی چیزیں شامل ہیں۔ اور جن میں سے ہر صنف کلام کے متعلق علیحدہ علیحدہ اظہار خیال کیا گیا ہے۔

(۲) **نکات الشعرا**۔ یہ اُردو کے قدیم شعرا کا تذکرہ ہے۔ جو فارسی زبان میں لکھا ہے اور ریختہ گویوں کا سب سے پہلا تذکرہ ہونے کا اس کو شرف حاصل ہے۔ اگرچہ اس میں شعرا کے حالات بہت مختصر ہیں۔ مگر جو کچھ ہیں وہ بہت غنیمت ہیں۔ میر صاحب نے اس میں کہیں کہیں کسی شاعر پر اعتراض بھی کیے ہیں۔ اور بہت سی جگہ دل کھول کر داد بھی دی ہے۔ جس سے ہلکی سی تنقید کی جھلک دکھائی دے جاتی ہے۔ اس تذکرہ کی عبارت نہایت سلیس اور بامحاورہ ہے سنہ تصنیف ۱۱۶۵ھ مطابق ۱۷۵۲ء

(۳) **ذکر میر**۔ یہ میر صاحب کے واقعات اور سوانحعمری کا مجموعہ ہے۔ اگرچہ اس میں شاعرانہ حالات اور واقعات نہیں ہیں مگر پھر بھی تاریخی حیثیت سے نہایت کارآمد ہے۔ سلطنت مغلیہ کے آخری دور کی کمزوریوں اور شریف گردیوں کا عبرتناک مرقع ہے۔ اس کی فارسی عبارت بے انتہا چست ہے۔ کہیں کہیں مقفیٰ بھی ہے۔ مگر اس سے عام درسی

مگر پھر بھی ہجو کا اصل منشا دہلی شریف گردی کا نقشہ کھینچنا۔ اور کم مایہ کم پایہ لوگوں کا عروج دکھانا ہے۔ دوسری ہجو۔ ہجو لشکر میں سلطنت مغلیہ کے آخری دور کی ابتری۔ بے زری اور امرا کی بے پرواہی کی ایک مکمل تصویر پیش کرنا۔ تیسری ہجو خواجہ سراے کو ایک خاص انداز میں لکھا گیا ہے یعنی صرف ایک حکایت کہکر کنایتہً تعریضی پردے میں یہ نصیحت کی گئی ہے کہ ہر یکے را بہر کارے ساختند۔ آدمی کو چاہیئے کہ اپنے رتبے اور اپنے عہدے سے زیادہ باتیں نہ بنائے۔ مثنوی ہجو مرغبازاں میں لکھنؤ کی سوسائٹی کی کمزوریاں اور خرابیاں بیان کی ہیں۔ اسی طرح اپنے گھر کی مذمت میں دو مثنویاں کہی ہیں۔ مگر اُن میں محاکات اور تفصیل کا کمال دکھایا ہے۔ انکو پڑھکر آج تک میر صاحب کی مجبوری معذوری افلاس ادبار کی افسردہ تصویریں سامنے آجاتی ہیں۔ برسات کی ہجو مناظر نگاری کا بہترین نمونہ ہے۔ ہجو نااہل میں اپنے آپکو اپنے مدمقابل کے مقابلہ میں اعلےٰ و افضل ثابت کرنے کی مکمل کوشش اور اُسی کے ساتھ اُس کو حقیقی نا اہل ثابت کرنے کی سعی ہے۔ کتے پالنے والے کی مثنوی ایک ناصحانہ کارنامہ ہے۔ تنبیہ الجہال جاہلوں کے واسطے تازیانۂ عبرت ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ فن نظم کا بڑا درجہ ہے۔ اور ہر عامی اسکو اختیار نہیں کرسکتا۔ اژدر نامہ میں اپنے معاصرین کو صرف شاعرانہ انداز میں برا کہہ کر اپنے آپ کو بڑھایا ہے۔ اور اسکے مجرم صرف وہی نہیں ہیں بلکہ مہذبانہ پیرائے میں بہت سے نام آور بھی کرچکے ہیں۔ مذمت آئینہ دار سے دلی نفرت کا اظہار ہوتا ہے۔ میر صاحب کی وضعداری اور اجلاف واشراف میں فرق کرنے کا انداز اس سے معلوم ہوتا ہے۔ مثنوی مذمت کذب میں طنز و کنایہ اور آپ بیتی داستان ہے۔ جس کو سُنکر لطف آتا ہے۔ ہجو اکول کی بنا صرف تمسخر اور مزاح پر ہے اس سے زیادہ نہیں۔

اُن کی ہجویات کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ الفاظِ مناسب کو اس طرح سے صرف کرتے ہیں کہ نہ صرف نظم کا بلکہ ہجو کا زور چہار چند ہو جاتا ہے۔ وہ اس فن میں معلومات کے دریا بہاتے چلے جاتے ہیں۔ اور باآنکہ ہجو سب سے بُری چیز ہے۔ مگر سب سے اچھی معلوم ہوتی ہے۔

اُن کی ہجویات میں بے باکی۔ اور اوباشی کا کوئی نام ونشان نہیں۔ بلکہ معلوم یہ ہوتا ہے کہ ایک جہاندیدہ گرم و سرد زمانہ چشیدہ کچھ نصیحتیں کر رہا ہے۔ اور کہیں کہیں وہ اپنے انداز کلام میں ظرافت اور زہر خند کو بھی شامل کر لیتا ہے۔

مگر جو اصل حقیقت اور قدر و قیمت ہے وہ میر صاحب کے اشعار سے معلوم کرنا چاہیئے۔

اے ز انعامِ تو وا شد غنچۂ امکانِ ما
آب در جو دارد از لطفِ تو باغِ جانِ ما

با کرم گر کار افتد جرم ما را نیست قدر
یک پرِ کاہ است کوہ شاخِ عصیانِ ما

دیدۂ تر کے تسلی بخش عاشق می شود
منبعِ طوفاں شود یارب سرِ مژگانِ ما

ایں نہ پنداری کہ مردن موجبِ آسودگیست
مرگ ہم یک منزل ست از راہِ پایانِ ما

میر اگر این ست جوشِ گریہ در ہجرانِ یار
ابر خواہد برد آب از دیدۂ گریانِ ما

چہ انشکند کز ازل بودہ است
سرے با شکستن بسوئے مرا

بمردن تسلی شدم ورنہ میر
نہایت نبود آرزوئے مرا

زنی تا چشم برہم مہر رنگ کینہ میگیرد
مروت آشنائی نیست ہرگز خوش نگاہاں را

بیاراں میروم دہ پانزدہ بیتم عنایت کن
رہ آورد نیست میر اشعار تو اہلِ صفاہاں را

اشک گرمم ہمہ درد است خدا را دریاب
از رہِ دورِ دل ایں قاصد زود آمدہ را

گرچہ موجود نہ گشتیم و لے سہل مگیر
ایں غلط کاری وہم بہ نمود آمدہ را

از ما حکایتِ غمِ دل میتواں شنید
ما خوب میکنیم بیاں ایں مقالہ را

یکرہ تو ہم بپرس ز و اے نسیمِ صبح
من خود نیافتم سببِ داغ لالہ را

غافل ز دل مشو کہ غنیمت شمردہ اند
اہلِ نظر معاملۂ ایں رسالہ را

سینہ صافیہائے من از گریۂ دیرینہ است
سیلہا جاروب کش بودہ است ایں ویرانہ را

طالعِ آنکہ بہ نخچیر گہِ عشق رسید
سرِ ہر صید نہ بندند بہ فتراک آنجا

آنکہ داری سرِ آں کوچہ اگر خواہی رفت
یادگاریست ز ما ہم دلِ صد چاک آنجا

میر جائے کہ بہ نیرانِ محبت میسوخت
صبح دیدیم بجا ماندہ کفِ خاک آنجا

شدہ تیغے بلند و گشتہ شدیم
ماندہ دیدیم روئے قاتل را

سر کن اشعار ماتمِ دلِ میر
برنخواں واقعاتِ مقبل را

کے مطابق مطلب و مقصد کو کوئی نقصان نہیں پہونچتا۔

(۴) **فیضِ میر**۔ یہ فارسی زبان میں ایک چھوٹا سا رسالہ ہے جسے اُنھوں نے اپنے صاحبزادے فیض علی کے لیے لکھا۔ اس میں درویشوں کے پانچ قصے۔ اور میر صاحب کی عقیدتمندی کا بیان ہے۔ آخر میں کچھ فحش لطیفے بھی تھے۔ مگر اُن کو حذف کر کے مولوی مسعود حسن صاحب رضوی ادیب اُردو لیکچرار یونیورسٹی لکھنؤ نے معہ ترجمہ شایع کر دیا ہے۔

(۵) **مجموعہِ مراثی**۔ اگرچہ مجھے اسکے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا لیکن اُس کا وجود یقینی تھا۔ معلوم ہوا کہ مولانا مسعود حسن صاحب رضوی ادیب کے کتبخانہ میں یہ موجود ہے اور ضخامت میں بھی اچھا خاصہ ہے لہذا میں نے ایک نظر اُسکو دیکھا۔ چونکہ پورے طور پر پڑھا نہیں اسلیے میں میر صاحب کی مرثیہ گوئی کے متعلق کوئی رائے نہیں رکھتا۔ یہ مجموعہ قلمی $\frac{1}{27}$ پیمانہ پر ۱۲۰ صفحہ میں ہے۔

(۶) **دیوان فارسی**۔ یہ ہنوز مکمل طور پر طبع نہیں ہوا مگر میں نے مکمل دیوان قلمی دو مرتبہ دیکھا۔ مقدمہ لکھنے کے بعد مولوی سید مسعود حسن صاحب رضوی کے کتبخانہ کا موجودہ نسخہ بھی نگاہ سے گزرا یہ تقریباً دو سو صفحہ $\frac{22}{29}$ $\frac{1}{8}$ پر ہے۔ میر صاحب کی فارسی نثر نہایت بہتر ہے۔ اگرچہ مادری زبان نہ ہونے کی وجہ سے فارسی کے بعض محاورات میں اُن سے لغزشیں ہوئی ہیں۔ مگر اسکے باوجود بھی اُن کی طرز خاص۔ روانی۔ اور شگفتگی عبارت داد کے قابل ضرور ہے۔ اور کیا تعجب ہے اگر فارسی دیوان میں بھی وہی دلکشی وہی خاص ترکیبیں اور محاورات وہی سوز و گداز۔ وہی میر کی ریختہ گوئی کا انداز موجود ہو۔ اسی وجہ سے نہایت صفائی کے ساتھ یہ کہدینا چاہیئے کہ وہ اگرچہ صرف میر کے انداز ریختہ گوئی سے کچھ گرا ہوا ہے لیکن دیکھنے والے کے لیے جاذب توجہ ضرور ثابت ہوتا ہے اور اسی لیے اگرچہ میر صاحب کو ہندوستان کے بعض مشاق فارسی گویوں کی صفِ اعلیٰ میں جگہ نہیں دی جاسکتی۔ پھر بھی وہ قابل ذکر ضرور ہیں۔ گو میر صاحب اپنے کلام فارسی کو قابل اعتنا نہ جانتے تھے اور جانتے کیونکر۔ شاعری جذباتِ قلبیہ کے ہیجان کا نتیجہ ہے۔ مگر جب شعر صرف تفنن طبع کی نیت سے کہا جائے تو پھر اس کا کوئی خاص درجہ نہیں رہتا۔ میر صاحب نے بھی یہ دیوان خانہ پری کے لیے کہا تھا۔ چنانچہ مصحفی نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے "دعوئ شعر فارسی ندارد۔ مگر فارسیش ہم کم از ریختہ نیست۔ میگفت کہ سالے ریختہ موقوف کردہ بودم دراں حال دو ہزار شعر گفتہ مدون کردم"۔ اگرچہ مصحفی کی رائے ان کے فارسی کلام کے بارہ میں سراسر ہماری تائید کرتی ہے

حیف در شورہ زار عالم میر
سبز ناگشتہ سوخت دانۂ ما

ماکہ سیر عالم تنزیہ عمرے کردہ ایم خرمی معلوم شد لفظِ زبانِ دیگر است	وسعت اینجا نمی آید بچشم تنگ ما ایں لغت جائے نمی یابد در فرہنگ ما

میر صاحب کے وہ دوست جو شاعر تھے

میر صاحب کی اُفتادِ طبیعت - خودداری - عزلت پسندی استغنا کی وجہ سے کس کو گمان ہو سکتا ہے کہ اُن کے کچھ شاعر دوست بھی ہونگے - مگر ایسا نہیں ہے - وہ خوددار سہی - خود بیں سہی - مگر ان کی خودداری اور خود بینی نااہلوں کے ساتھ تھی - وہ گردن بلندوں کے سامنے سر نیاز نہیں جھکاتے تھے - اور اُن سے ہچشمی اور مساوات کا برتاؤ رکھتے تھے - جیساکہ اُن کے اکثر واقعات سے ظاہر ہوتا ہے - مگر اپنے دوستوں کے ساتھ سراپا ارتباط اور سراسر اختلاط تھے - اور جب اُنکی دیر آشنائی ختم ہوکر دوستی و محبت کا رنگ بدلتی تھی - پھر اس میں کبھی فرق نہ آتا تھا - چنانچہ نجم الدین علیخاں سلام - خلف شرف الدین علیخاں پیام اُن کے ہر وقت کے دمساز اور رفیق - حریف ظریف اور خالص دوست تھے - ان کے ساتھ برابر مشق سخن سنجی بھی ہوتی تھی - اور کہیں بھی لڑائی جاتی تھیں (۲) خواجہ میر درد یہ بھی میر صاحب کے مخلص دوست تھے اور میر صاحب خود بھی ان سے خلوص برتتے تھے - ان کے یہاں جو ہر مہینے کی پندرہ تاریخ کو مشاعرہ ہوتا تھا - میر صاحب اس میں برابر شریک ہوتے تھے - اور آخر میں انھیں کے ایما سے یہ مشاعرہ میر صاحب کے مکان پر منعقد ہونے لگا تھا - (۳) میر سجاد - یہ اکبر آباد کے باشندے تھے مگر قیام ان کا بھی شاہجہاں آباد میں تھا - انکے یہاں بھی مشاعرہ ہوتا تھا اور میر صاحب التزاماً اس میں شریک ہوتے تھے - ان کے ساتھ میر صاحب کو اخلاص تھا - (۴) میر ولایت علیخاں برادر محتشم علیخاں حشمت - (۵) اشرف علیخاں فغاں (۶) محمد اسماعیل بیتاب (۷) انعام اللہ خاں یقین (۸) میاں شہاب الدین ثاقب (۹) سید عبدالولی عزلت (۱۰) میر عبدالحی تاباں (۱۱) حسن علی شوق (۱۲) قائم چاندپوری - (۱۳) فضل علی داناؔ (۱۴) میر حسن (۱۵) ہدایت اللہ ہدایت (۱۶) محمد عارف عارف (۱۷) بیدار (۱۸) لالہ ٹیک چند بہار (۱۹) میر عبدالرسول نثار (۲۰) محمد امان اللہ غریب (۲۱) محمد محسن محسن - (۲۲) ضیاء الدین ضیاء (۲۳) میاں ابراہیم (۲۴) میر گھاسی میر علی نقی (ان کے یہاں بھی مشاعرہ ہوتا تھا -

بجمع ماتمیاں حرفِ من اثر دارد		بہ بزمِ عیش نداند کسے زبانِ مرا

ز ضعفِ میر بچشمِ کسے نمی آیم
لطافتے است چو جاں جسمِ ناتوانِ مرا

بحقِ دیدۂ نمناک ساغرِ مے ناب		ببخش بارِ خدایا شراب خواراں را
زبازپرسِ قیامت چہ غم کہ بس باشد		وسیلۂ سرِ زلفش سیاہ کاراں را

بحثِ دل ہر شب بدانانم نمی دانم چرا		ہر سحر سر در گریبانم نمی دانم چرا
باب لطفش نیستم لیکن چو از رہ میرسم		بر درِ او دیر میمانم نمی دانم چرا
چارۂ من دلربایاں جملہ میدانند لیک		کس نمیگوید کہ میدانم نمی دانم چرا
او غرورِ حسن دارد زاں سبب پرواش نیست		منکہ ضبطِ خویش نتوانم نمی دانم چرا

مدتے شد میر مژگانم ز من برگشتہ است
خار خارش ہست با جانم نمی دانم چرا

دل کہ در سینہ می تپید مرا		ایں زماں از مژہ چکید مرا

دست ہر دم بہ تیغ بردنِ او
میر در خاکِ و خوں کشید مرا

گہ گہ چو آفتاب بسر می رسیدہ باش		افتادگانِ سایۂ دیوارِ خویش را
جور و جفاست کارِ تو و من ز سادگی		موقوفِ رحم داشتہ ام کارِ خویش را

سودائے ماست میر بہ عیار پیشۂ
کو بارہا فروخت خریدار خویش را

بہ یک دید چمن از دور دل خوش میکنیم		بر نہ تابد منتِ گل گوشۂ دستارِ ما
من بخاکِ رہ برابر گشتم و یکرہ نگفت		بود خاک افتادۂ در سایۂ دیوارِ ما

کاروانِ گریہ ایم و نیز از دل می رسیم
نیست چیزے میر غیر از درد و غم در بارِ ما

بیا بہ طوفِ شہیدِ نگاہ خوباں را		بہ بیں مروتِ چشمِ سیاہ خوباں را
ملک اگر ہمہ عمرش می برد لیکن		جگر کجا کہ نویسد گناہ خوباں را

عمرِ من بر درِ کسے بگزشت		کہ نیاید یکے بجانبِ ما

یا خدا میر کی آنکھوں کو دوا پہ کر دے	اور بینی کا یہ عالم ہو کہ تر بینی ہو

سودا۔ اگرچہ میر اِن کو اور یہ میر کو اُستادِ فن جانتے تھے۔ پھر بھی دونوں کے دیوانوں میں ایسے شعر موجود ہیں جن میں ایک دوسرے پر چوٹیں کی گئی ہیں۔ اِن لوگوں کے علاوہ بھی بہت سے ایسے لوگ ہیں جنکے لیے میر صاحب کے قلم سے توصیفی جملے نکلے ہیں یا انکی مذمت کی گئی ہے، مگر ہر ایک کو انتخاب کرنا فرصت چاہتا ہے۔

میر صاحب کے اخلاف و اعزا میر صاحب کے دو بیٹے تھے۔ ایک میر عسکری عرف میر کلو عرش۔ مگر نساخ کا قول ہے کہ یہ زار تخلص کرتے تھے۔ دوسرے میر فیض علی فیض۔ جو اکثر مواقع پر میر صاحب کے ساتھ رہے۔ بعض تذکرہ نویسوں کا بیان ہے کہ ان میں بھی باپ ہی کی طرح عجب و تکبر پایا جاتا تھا۔

تذکرہ شمیم سخن کی روایت ہے کہ میر صاحب کی ایک لڑکی بھی شاعرہ تھیں اور بیگم تخلص کرتی تھیں۔ ان کے نام سے دو شعر بھی نقل کیے گئے ہیں۔ میر محمد رضی ان کے حقیقی اور محمد حسن اور محمد محسن ان کے سوتیلے بھائی تھے۔ خان آرزو اُن کے سوتیلے ماموں یا خالو تھے۔ محمد حسین کلیم میر صاحب کے عزیز قریب اور بہنوئی تھے۔ یہ دلّی کے باشندے اسحاق خاں شہید کے بھائی اور مرزا محمد علی کے متوسلین میں تھے۔ میر قمر الدین منت وغیرہ بھی اُن کے عزیز تھے۔ تجلی اُن کے بھانجے اور داماد تھے۔ اور محمد محسن خود بقول میر صاحب اُن کے برادر زادے تھے۔ اور نہ معلوم کتنی ایسی ہی رشتہ داریاں ہونگی جنکی تفصیل لکھنا اور ڈھونڈھنا بیکار ہے۔

کلیّاتِ میر بصورتِ موجودہ

کلیات میر کے ایڈیشن متعدد مرتبہ شایع ہو چکے ہیں۔ اور سب سے پہلا چھپا ہوا وہ نسخہ ہے جو کلکتہ فورٹ ولیم سے کاظم علی جوان وغیرہ کی تصحیح و نظر ثانی کے بعد غالباً میر صاحب کی زندگی ہی میں شایع ہو گیا تھا۔ یا شایع ہونا شروع ہوا تھا۔ یہ نسخہ دوسرے مطبوعہ نسخوں سے زیادہ صحیح ہے۔ مگر ایسا نہیں ہے کہ اسکو معتمد علیہ سمجھا جائے اس میں اکثر جگہ قبیح غلطیاں رہ گئی ہیں۔ یہ نسخہ تصحیح کے وقت ہمارے پیش نظر تھا۔ اسکے علاوہ دوسرا وہ نسخہ جو نولکشور پریس ہی سے ۱۸۶۷ء میں بغیر حاشیہ کے چھپا تھا۔ اسکے بعد بھی جو اور اڈیشن یہاں سے چھپے وہ بھی موجود تھے

میر صاحب کے شاگرد میر ایسی طبیعت کے لوگوں کی شاگردی کو نباہنا بڑا مشکل کام ہے۔ پتھر کا کلیجہ فولاد کا دل ہوتا تو یہ صحبت برآر ہوتی۔ اسی لیے بہت سے لوگ اُن کی تنک مزاجی سے عاجز آکر دوسروں کے شاگرد ہو گئے۔ اور اب صحیح طور پر پتہ نہیں چلتا کہ کتنے لوگ ایسے تھے جنکو اُنکے تلمذ کا شرف حاصل تھا۔ پھر بھی سر شاہ سلیمان صاحب نے انتخاب مثنویاتِ میر میں یہ نام گنائے ہیں۔ سخن۔ عشق۔ آرزو۔ آبرو۔ راسخ۔ تجلی۔ ان کے علاوہ۔ نثار۔ جگن۔ محمد محسن۔ مجنوں۔ شکیبا بھی اس زمرہ میں داخل ہوئے۔ مگر افسوس ہے کہ اتنے بڑے کامل الفن کو کوئی ایسا **شاگرد** نہ ملا جو اُن کے نام کو زندہ رکھتا۔

میر صاحب کے حریف (۱) خاکسار۔ اُنھوں نے سید الشعرا اپنے لیے خطاب تجویز کیا تھا۔ جو غالباً تخلص میر کا جواب تھا۔ میر صاحب کے تذکرے نکات الشعراء کے جواب میں ایک تذکرہ لکھا تھا۔ جو ہمیشہ نایاب رہا اور اب بھی نایاب ہے۔ میر صاحب نے ان کے کلام پر اعتراض بھی کیا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اُن سے اُن کو ان سے ایک قسم کی مخاصمت تھی۔ (۲) عاجز یہ بھی میر صاحب کے حریف تھے اور میر صاحب نے ان کے کلام پر اعتراض بھی کیے ہیں (۳) بقا یہ میر و سودا دونوں کے حریف تھے اور دونوں استادوں کے کمالات فن کے قائل نہ تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ میر صاحب کے لیے کہا ؎

پگڑی اپنی سنبھالیے گا میر	اور بستی نہیں یہ دلی ہے

ایک مرتبہ یہ کہہ کر دونوں کو لے ڈالا ؎

میر و مرزا کی شعر خوانی نے	بسکہ عالم میں دھوم ڈالی تھی
کھول دیوان دونوں صاحب کے	اے بقا ہم نے جب زیارت کی
کچھ نہ پایا سوائے اسکے سخن	ایک تو تو کہے ہے اک ہی ہی

ایک مرتبہ بقا نے یہ شعر کہا ؎

سیلاب سے آنکھوں کے رہتے ہیں خرابے میں	ٹکڑے جو مرے دل کے بستے ہیں دوآبے میں

اسکے بعد میر صاحب کا یہ شعر اُن کی نگاہ سے گزرا ؎

وے دن گئے کہ آنکھیں دریاں سی بہتیاں تھیں	سوکھا پڑا ہے اب تو مدت سے یہ دوآبہ

بقا نے سمجھا کہ میر نے میرے یہاں سے سرقہ کیا ہے۔ اسپر جھنجھلا کر یہ قطعہ لکھ ڈالا۔

میر نے گر ترا مضمون دوآبے کا لیا	اے بقا تو بھی دعا دے جو دعا دینی ہو

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مثنوی در ہجو شخصے ہیچمداں کہ دعوئے ہمہ دانی داشت

اس چرخِ بے مدار کے کیا کیا کروں گلے ۔ میرے جگر میں جیسے ستارے ہیں آبلے
تنکا سا اُن نے جور و جفا کر سکھا دیا ۔ پھر تس پہ میرے رونے نے مجھ کو بہا دیا
اُس مجمع کمال کے گھر لے گیا بہ زور ۔ جس کو تمام فنوں میں گویا کہ تھا عبور
توحید گر کہے تو وہ حق حق بہت کرے ۔ ایسا بکے کہ بات تصوف میں ڈال دے
مصروف علم صرف کا تھا لیک اسے حرف ۔ پوچھو جو اسمِ آلہ سے تو بول اُٹھے کہ ظرف
یہ سنکے تم ہنسو ہو تو وہ رو کے ایکبار ۔ کہنے لگے کہ اپنا یہ صیغہ نہیں ہے یار
کرتا ہو بحث نحو میں جس دم وہ بار گیر ۔ ہر نحو کا ہے لفظ فقط حرف یاد گیر
موضوع اپنا جانتا منطق کو تس اُپر ۔ محمول ابتدا ہی کو کہتا تھا بے خبر
وصف حذاقت اُسکا بیاں کیجیے تو کیا ۔ تجویز کرتا دیکھ کے میطون کو سنا
فن بیاں میں کیسا ہے تشبیہ کس سے دوں ۔ عالم کنایہ اس سے کیا ہے میں کیا کہوں
پوچھو مجاز کی جو حقیقت ہو لا علاج ۔ کہنے لگے کہ رات سے بھیکا ملا مزاج
اور لفظ بھی مزاج ہے ناداں سے ہے مجاز ۔ معنے کہے تو اسکے کہے قصۂ دراز
پھر معنے پوچھے حکمتِ جو یاں مزاج کے ۔ انواع یوں بیاں کریے اسکے علاج کے
اسکی دوائیں کتنی مقرر ہیں طب کے بیچ ۔ تعریض ایک ان میں ہے یعنی سیاہ کیچ
اس کا ضماد کرتے ہیں دو چار روز تک ۔ پھر استعارہ دیویں ہیں تھوڑا کہ جائے پک
ہذیان معنی اس کا ہوا ہر طرف جہاں ۔ پھر وہ مجاز مرسل اسے صبر کر وہاں

ان کے علاوہ دو قلمی قدیم نسخے جو مکمل تو نہ تھے مگر پھر بھی دونوں کو ملا کر بہت سا کام دے سکتے تھے۔ ان میں کا ایک نسخہ سنہ ۱۲۴۹ھ کا لکھا ہوا تھا۔ تیسرا ایک قلمی نسخہ جس میں صرف اول و دوم دیوان ہے جو لکھنؤ محلہ نوبستہ میں لکھا گیا تھا یہ کہ مطبع ہذا کے محفوظ نسخوں میں موجود ہے وہ بھی پیش نظر تھا مثنویات کا انتخاب جو سر شاہ سلیمان صاحب نے شایع کیا ہے۔ ان سب نسخوں سے مقابلہ اور تصحیح کر کے۔ ان کے علاوہ بھی دوسری جگہوں سے امداد حاصل کی گئی۔ اور اب امید ہے کہ یہ کتاب اُن تمام نسخوں سے بہتر ثابت ہوگی جو اب تک کلیات میر کے نام سے شایع ہوئے ہیں۔

چونکہ قلمی نسخوں کی ترتیب مختلف تھی۔ اور مطبوعہ سب نسخوں کی ترتیب ایک تھی انمیں ایک خاص نقص یہ تھا کہ کوئی چیز ترتیب وار نہ تھی۔ کہیں عشقیہ قصہ مثنوی میں اور اسی کے ساتھ ہجو اسی کے بعد مدح وغیرہ۔ لہذا ہر چیز کا ایک سلسلہ علیحدہ قائم کر کے ہر ایک کے پہلے صفحہ میں ٹائیٹل یا لوح کی ایک صورت قائم کر دی گئی۔

مطبوعہ نسخوں میں بعض چیزیں ناکمل تھیں اُن کو قلمی نسخوں کی مدد سے مکمل کیا گیا۔ اور بعض چیزیں نئی زیادہ کی گئیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

ترجیع بند درمنقبت حضرت علی کرم اللہ وجہہ جو صفحہ ۷۰۰ پر درج ہے اسکے اول کے سات بند اور بند ہشتم کے تین شعر کسی مطبوعہ نسخے میں نہیں ہیں۔ یہ ایک قلمی نسخے سے لیے گئے۔

اسی طرح دو مثنویاں جو درج ذیل ہیں کسی مطبوعہ نسخے میں نہیں ہیں یہ قلمی دستیاب ہوئیں۔

دو غزل جو دوسرے مطبوعہ نسخوں میں نہیں ہے قلمی نسخوں سے لی گئی۔

میر کے کلام میں بہت سے ایسے اُردو الفاظ مستعمل ہوئے ہیں جو اب نہیں بولے جاتے اور نہ موجودہ لغات میں ملتے ہیں۔ اُنکو نہایت تحقیق سے لکھا گیا ہے۔ نیز فارسی کے اکثر مشکل محاورات جو دوسرے شعرا کے یہاں نہیں وہ کلام میر میں ملتے ہیں۔ ان سب کے لیے ایک فرہنگ مرتب کر دی گئی ہے جو آخر میں شامل ہے۔

چونکہ یہ کلیات تقریباً گیارہ سو صفحات پر ختم ہوا ہے۔ اس لئے مضامین کی ایک فہرست بھی اول کتاب میں شامل کر دی گئی ہے جس سے کسی خاص مضمون کے نکالنے میں مدد ملتی ہے۔

عبد الباری آسی ۲۷ اکتوبر سنہ ۱۹۴۰ء

یا پھل ہے وہ سنا کا جو لگتا ہے جھاڑ میں | یا کاہِ خشک ہے جو اُگے ہے پہاڑ میں
گر پوچھتا کوئی کہ کسے کہتے ہیں روی | کہتا روی غلط ہے مجھے یاد ہے رُوی
پھر جا کے کھول جلد کی اپنے کتاب کو | کہتا مرے قیاس میں آتا ہے ہو نہ ہو
اغلب کہ اسے عزیز وہ جنگل کی ہے جڑی | ہوتی ہے جسکی بیل بوٹوں اُپر پڑی
اک دن بدیع میں جو اُسے امتحاں کیا | اک بار باز سامنے اُس نے وہاں کیا
کر جمع قلبِ مستوی و قلبِ بعض کو | کہنے لگا کہ عکس ہے اکثر کہاں ہے وہ
حالانکہ تین صنعتیں کی جاتیاں بیاں | اور ایک سمجھا اُن کے تئیں ایسے ہیں کہاں
پوچھا جو اُس سے معنیٔ ایہام کے تئیں | دینے لگا نشاں مجھے اک نام کے تئیں
یعنی تھا ایک مدت میں اک پہلوان زور | دو انگلیوں سے اُن نے اُکھاڑے تھے شاخ گور
بہرام گور اسی ہی کو کہتے ہیں سب عوام | در گور رہ یہ تمام کہ کہتے ہیں ناتمام
تجنیس کا سوال کیا اُس سے ایک روز | کہنے لگا اس اسپ کو کہتے ہیں جو ہو یوز
نادان تو نے اسپ مجنس نہیں سُنا | مشتق اسی سے جانے ہے جو ہے پڑھا گنا
لاتے جہاں ہیں شعر میں تجنیس شاعراں | مذکور ان سے ہوتے ہیں گھوڑوں کے وصف واں
میں نے کہا کہ کہتے ہیں تم کو عروض داں | بحر رمل کی مجھ سے حقیقت کرو بیاں
بولا کہ تیری عقل سے آتا ہے بس عجب | دریا کا ایک نام ہے پھر کیا کہوں سبب
پھر میں کیا سوال [illegible] رقِ رجز | بحرِ طویل بحرِ مدید اور بحرِ رجز
ان میں جو ہے گا فاصلہ مجھ کو بتائیے | کامل سے ملکے حیف ہے ناقص جو جائیے
بولا کہ تجھ کو عقل نہیں تا کجا کہوں | یوں تربیت میں تجھسے کئی میں کہاں تلک رہوں
یہ تینوں رود خانے ہیں دہر بسیط میں | ملتے ہیں رفتہ رفتہ سبھی جا محیط میں
پھر آپ ہی آپ بولا کہ اک اور افادہ سُن | گر قابل اپنے ہونے کی دل میں رکھے ہے دُھن
بحر طویل ایک ہے دریا بہت بڑا | بحرِ خفیف ایک ہے پاس اُسکے آبنا
تمثیل اُس کی ڈھونڈھنے آپ جائیے کہاں | جمنا کے پاس جیسے ہے ہنڈن تمہارے یاں
تشریح میں بھی ایک تھا وہ تلخ بے مثال | ہر استخواں کو کہنے لگا نیم کی ہے چھال
تاریخ داں تھا قطع نظر سب کمال کے | کرتا سخن ضرور ہے نبیوں کے حال کے
کہنے لگا تمہارے پیمبر کے عہد میں | تاریخ میں جو دیکھا تو عیسیٰ تھا مہد میں

اجمالی معنی یہ کہے آخر کو یہ کہا
تفصیل کرنے کا تو دماغ اب نہیں رہا

علم معانی سے جو کیا ایک دن سوال
کہنے لگا حقیقت عقلی تو ہے محال

لیکن مجاز عقلی کو نادان یاد رکھ
یاں کون پوچھتا ہے دل اپنے کو شاد رکھ

ہیں اب فصاحت اور بلاغت سو جانے دے
یہ دونوں عیب شعر میں اپنے نہ آنے دے

اک دن سوال علم قوافی سے میں کیا
کہنے لگا کہ قید نہیں اس میں مطلقا

تم آب قافیہ نہ کرو لفظِ خاک کا
یا آتش اور باد کا زنجیر و تاک کا

لیکن مغائرہ ہو مقرر ردیف میں
آتا ہے یہ کچھ اپنے تو ذہنِ شریف میں

پھر شعر وصل و ہجر کے موزوں تم کرو
عرصہ ہوا وسیع جواب چاہو سو کہو

دعوی بتاؤں کیا ہے انھیں فن شعر کا
معنی جو قافیہ کے کوئی پوچھتا تھا آ

بے علم کرتا قافیہ تنگ اسکی جان پر
دے مارتا تھا ہاتھوں کو وہ اپنی ران پر

کہتا تھا ہائے ہائے مرے بعد ہوگا کیا
ان احمقوں کے جینے کے پیچھے تو مر گیا

پھر تربیت سے انکی مجھے فائدہ بھلا
ٹوٹے ہے بکتے بکتے انھوں کیلیے گلا

مرجاؤں گا تو گور پہ میری نہ آئیں گے
دو کوزے آب کے بھی یہ ہرگز نہ لائینگے

لیکن مجھے تو بخل نہیں ہے سنا عزیز
سنیو تو گوش دل سے اگر ہے تجھے تمیز

ایما اشارہ رہنے دے کہتا ہوں اب صریح
اول ہی لفظ کا نہیں ہے قافیہ صحیح

میں جو سنا ہے کافیہ ہے چھوٹے کاف سے
پس پڑھنا تو غلط ہوا اسکا قاف سے

اور اس میں ایک نکتہ بھی کرتا ہوں میں بیان
پھر بولا ہائے ہائے نہیں کوئی قدردان

ورنہ مرے دہن کو جواہر سے پر کرے
یہ نعل اگلوں ہوں میں مجھے سر اوپر دھرے

بارے وہ نکتہ یہ ہے لگا کہنے کر خطاب
ہے ایک علم جفر میں بھی کافیہ کتاب

تصحیح صرف ہو چکی اب معنے اسکے سن
ورنہ لگے ہے ذہن میں ان معنیونکو گھن

استادوں سے سنا تھا جو میں نے نہیں ہے یاد
اور اب جہاں کے بیچ نہیں کوئی اوستاد

ہر اک سے پوچھنے کو نہیں چاہتا ہے جی
لائق نہیں جو پوچھیے اب قافیہ ردی

یہ کہکے آپ ہی بولا کہ کہنے کا کیا حصول
اس معنی کو کہے یہ مرے کیجیو قبول

اس شخص کا جو حدث ہے ہو یہ میرے یار
ہر چند اس کو گوزِ شتر جانے سب و یار

بیہودہ کر کہوں ہوں بنا بر میں احتیاط
حرفِ غلط کا تا نہ ہو معنی سے اختلاط

دعویٰ تھا علم تیر میں اس کو بہت بڑا
پھر دیکھ بھال اسکو وہ کہتا کہ مجھ کو بھی
جب سوکھتا ہے اسکی سلاخوں کا کر خمیر
غرہ تھا ڈھولک اپنی بجانے پہ اور کبھو
اس پر لگا ٹکور تعجب سے پھر شتاب
آواز خوش کی اسکی گلو سوزی بیش بول
لکڑی بھی پھینکتا تھا بہت خوب سج سے وہ
شاگرد اس کا پوچھتا گر اس سے آن کر
اسکو اگر کہیں تو کہیں کیا وہ سر اٹھا
تھا گھوڑے کا بھی خوب مبصر وہ خرد لیک
گھوڑے کی آنکھ پر تھی رسولی پہ گندہ تر
تشریف لائے ذات شریف اسجگہ کہیں
کہنے لگا کہ ایک نظر مجھ کو بھی دکھاؤ
اس گھوڑے کے سوا کے پھر جی میں آگیا
لاگا سئیس سامنے اسکے پھرآونے
ہر چند انکھیاں پھاڑ کے دیکھے یہ سرنگیں
یکچشم دیکھ کہنے لگا نوج پوچ حلق
پھر اس نظر پہ طرفہ تو یہ ہے کہ رو کے خوب
شوخی کرے ہے ابلق ایام نابکار
جو جو ہوئے ہیں چرخ سے مجھ پر ستم دام

پڑ رہے کے بیس ہاتھ میں ہوتا جو وہ کھڑا
معلوم کیا ہے خوب ولیکن یہ ہے وہی
چاکوں اُپر کمھار بناتے ہیں بیس و تیر
آتا جو کوئی ہاتھ میں لے اسکے روبرو
کہتا روئی بھری ہے بہت آپس دابدب
گاتا تو باجتا تھا گلا جیسے پھوٹا ڈھول
ہوتا تھا کج بہت جو کھڑا ہوتا دھج سے وہ
مونڈھے اُپر لگاتے ہیں جو وا تان کر
کہتا کر ڈک وہی ہے جو تجھ کو دیا بتا
ایک میرے مہربان تھے گھوڑا تھا انکا ایک
رہتی تھی اس کمیت کی وہ حائل نظر
واں گھوڑوں کی رسولی کی تھیں باتیں جل میں
یہ چشم ہے خدا سے کہ اسکا اثر نہ پاؤ
کھلوا منگایا تھان سے وہ اسپ انکھ مند
اور آنکھ اپنے گھوڑے کی اسکو دکھاوُنے
اسکو تو پھوٹی آنکھوں سے پر سوجھتا نہیں
گھوڑے کے موتر اہے رسولی کہے ہے خلق
کہنے لگا کہ تب تو جہانیں پڑی ہے ڈوب
ورنہ بیادے مجھسے پھریں ایسے ہوں سوار
جیتا رہا تو میر کروں گا گلے تمام

اپنی تو بدزبانی نہ تھی خامے کا شعار
پر یہ بھی ہے جریدۂ عالم میں یادگار

یکبارگی غصا اُٹھے دجال کے اُپر
پھر تب سے مجھ کو علم نہیں ہے کہ ہیں کدھر

علم نجوم میں بھی بڑا تھا اُسے کمال
شاید کہ اس ستارے کا ہے گا حمل و بال

اکدن کیا سوال شہانِ سلف سے میں
پرویز کے اُنھوں میں خصوصاً سلف سے میں

اُس نے کہا کہ خوب کہا طرفہ نقل ہے
رکھتا ہے حافظہ میں اسے جسکو عقل ہے

امرد تھا ایک اُن نوں شیریں تھا اُسکا نام
یہ اسکی دشمنی میں ہوا یو نہیں تلخ کام

یہ سُن کے مارا خسرو پرویز نے اُسے
بیدم کیا ہے خنجر پر تیز سے اُسے

ہے ماجرا یہی جو کہے کوئی کیا ہے کہہ
اور شعر جو زباں سے پڑھا اپنی سو ہے یہہ

از آبِ زر بہ خنجر شیرویہ نقش بود
کیں رانسب بہ تیشۂ فرہادی رسد

گنتا تھا خوب آپ کو علم حساب میں
لیکن بیاں وہ کرتا نہیں جو کتاب میں

کہتا تھا جفت پانچ کا ہوتا ہے کر شمار
گر دیکھیے تو اسکو وہ ہووے ہزار بار

پھر طرفہ ہے یہ کہتا اگر ہے نہ چار طاق
پس کیوں لکھا لغت میں خنافر کو چار طاق

علمِ لغت میں عمر بھی اُسکی ہوئی تھی صرف
کرتا سوال اس سے جو جا کر میں ایک حرف

مثلاً کہا کہ نخل ہے کیا اسکو کر بیان
وہ در جواب اسکے وہیں کھول کر زباں

بولا کہ اک جزیرہ ہے سمت فرنگ کو
مارا تھا ان فرنگیوں نے اس نہنگ کو

اب خاک سے نہنگ کی واں اک نہال ہے
شیر و پلنگ کا وہ سدا پائمال ہے

اسکے ثمر کو بعض تو کہتے ہیں تاڑ پھل
بے مغزوں کا جو فرقہ ہے کہتا ہے ناریل

کہتا ہے کوئی مکہ کا خرما ہے اسکا بیج
اک کہتے ہیں فرنگ میں ہے ایک بادپیچ

جس کی صدا سے گوشِ [illegible] بحر میں ہیں کر
صدمہ سے جسکے ٹوٹ گئی کوہ کی کمر

یہ کچھ لکھا ہے سارے لغت کی کتابوں میں
زبدہ ضریری شرح وقایہ کے بابوں میں

تحقیق اسکی یہ ہے کہ ہے نخل اصل حرف
تصحیف ہو گئے سے جو تھا ہے نخ سے غرف

وہ نخل کیا کہ جانور و چارپایہ ہے
دم اتنی لمبی ہے کہ وہی سر کا سایہ ہے

سوداگر اس پہ بار کریں ہیں چنار کو
اس پر بناتے ہیں گے رہوں میں منار کو

سرکے میں اُسکے بالوں کا بھی کرتے ہیں اچار
اس ہی کو کہتے ہیں گے مداین میں سوسمار

یہ کہہ کے آپ ہی بولا ہاں ریش اور فش
آتا ہے جو کہ اپنے تئیں صعب ہے پیش کش

کرتا تھا شہ کمانی میں اپنے تئیں دخیل
زاغ کماں کو دیکھ کے کہتا کہ ہے یہ چیل

صاحب اک اور اسکی جب آیا
جن نے ایسی بلا کو جنوایا

جنگ مغلوبہ تھی گتھے باہم
مرتے تھے دونوں اور سکے رستم

صاحب انگریز کے گرے اکثر
تھک گئے لڑتے مرتے ہم دیگر

تاک کر باڑھ پہلو سے ماری
صف الٹ دی حریف کی ساری

لشکری سب سراں سمیت رہے
سبز جو کچھ ہوئے تھے کھیت ہرے

نعش پر نعش گر کے ڈھیر ہوئے
بھوکے مرتے کہ جی سے سیر ہوئے

پیچھے سردار تھا پٹھانوں کا
دیکھا جانا جو ان نے جانوں کا

خواب غفلت سے چونک اٹھا جاگا
دست پاچہ ہو اگیا بھاگا

مارے بھاگوں کو فوج نے لوٹا
مرگیوں میں سے بھی نہ اک چھوٹا

غارت ازبس کہ لشکری لائے
نعشوں سے اشرفی روپے پائے

وہ جو بھاگا تھا معرکہ سے رئیس
بھاگا یوں جیسے پیل سب سنئیس

ہوتے جو ہیں روہیلے ظلم شعار
لٹتے جاتے تھے شہر راہ گزار

رامپور میں بھی آکے رہ نہ سکا
وہ خدا اگیر بات کہہ نہ سکا

بھاگا واں سے ہے لیکے کچھ اسباب
کہ لگا آیا لشکر نواب

لی پناہ اُن نے جاکے زیر کوہ
واں بھی تھا ساتھ کوہ کوہ انبوہ

تھا پہاڑوں کے آگے جنگل بھی
وہیں ناکہ یہ تھا یہ دنگل بھی

وھاں روہیلے ہوئے اکٹھے سب
بعد دو چار پنج روز و شب

عجز کی راہ سے کیا پیغام
ہم ہیں نواب کے کمینے غلام

بندے رہتے ہیں باوجود خطا
تم سے صاحب امیدوار عطا

لطف کریے امیدواروں پر
رحم کریے گناہگاروں پر

ہم غلامی میں ہوتے ہیں حاضر
اب نہ خدمت سے ہونگے قاصر

کسو صاحب کو ہو حضور سے حکم
موجب طوع وہ ہے دور سے حکم

کہ مجھے اپنے ہاتھ لے جاوے
پاؤں کتنے کے عاجزانا وے

ذات نواب سے کرم سیرت
کہا صاحب کو تم بصد عزت

معرفت اپنے جاکے لاؤ اُسے
پاس خیمہ میں لا بٹھاؤ اُسے

لہ وہ جسپر خدا کا غضب ہو

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جنگنامہ

اب کے نواب رامپور آیا ناگہاں اس طرف خدا لایا

آگے آتا تھا بہر سیر و شکار بازی یکسر روہیلی ہے اس بار

گرد تھی فوج کی سپہر تلک بنگیا اور ایک تازہ فلک

جمع افغاں پسر تھے اس جاگہ لیک سارے تھے جنگ ناآگہ

یہ نہ سمجھے وزیر کوہ وقار ہے تحمل سے رہ میں دیر گزار

یعنی تخریب ایک آن میں ہے روکشی ان کی کسرِ شان میں ہے

ہاتھی سے وہ پیش جنگی کر وانتے دے دے گرے ہراول پر

دیکھ کر لوگ تھوڑے ٹوٹ پڑے پکے پھوڑے کے رنگ پھوٹ پڑے

جتنے تلوار و نہیں فرنگی سے مرے مارے بہت کڈھنگی سے

تھا تہوّر نہ یہ شجاعت تھی ساعتِ جنگ یا قیامت تھی

تھے تلنگے روہیلے محوِ جنگ لوتھوں سے ہوگیا تھا عرصہ تنگ

گورے کالے جدا جدا کیا تھے دونوں مردم گیا سے یکجا تھے

دیو کا بھی نہ ٹھہرے پاس جا تھا اُنھوں کا جہاں ثباتِ پا

سہل سردار سمجھا یہ مرنا اللہ اللہ ترا جگر کرنا

توپ پر آن کر چلی تلوار جھیل کر زخم لڑ موا سردار

غزل

(یہ غزل ایک قلمی نسخے تحریر شدہ ۱۲۴۹ھ میں موجود ہے)

گردش سر پھر کے کرتے پھروں پاس
سو تو ہم لوگ اُس کے آس نہ پاس

خط پہ خط بھیجتا تھا لکھو اکر
جب تلک یار تھا نہ حرف شناس

دل نہ باہم سلے تو ہجراں ہے
ہم وے رہتے ہیں گو کہ پاس ہی پاس

عرش و دل میں رہے مگر برسوں
وہم ہے پر کہیں کہیں ہے قیاس

ہے چلا جب سے وہ پریشاں ربط
جمع اک دم رہے نہ میرے حواس

ناامیدی بھی حد رکھتی ہے
جیتا کب تک رہے گا کوئی نراس

جز خدا ہم کسو سے ڈرتے نہیں
گھر ہمارا ہے واں جہاں ہے ہراس

میں تو حیرانِ کار ہوں بیہوش
کیونکہ نکلے گی میرے دل کی بھڑاس

میر وحشی کا دل ہے بے طاقت
چلتا پھرتا ہے پر اُداس اُداس

غزل دوم غیر مطبوعہ

رہے عمر بھر دیکھتے سادگاں کو
یہی جینے نہیں دیتے دلدادگاں کو

خبر قاصدوں کو نہیں اپنی شاید
بہت دور بھیجا فرستادگاں کو

عجب سادگوں میں ہے قشقوں کی خوبی
نہ ہو عجب کیوں برہمن زادگاں کو

نہال اور سرو اسکے حیراں کھڑے ہیں
کیا پائے گیر اُن نے آزادگاں کو

رہے زیر دیوار ہم میر برسوں
نہ پوچھا کبھی خاک اُفتادگاں کو



یا کہ خیمہ جدا کرو استاد — ہم اسے وقت پر کریں گے یاد

لایا صاحب چنانچہ خود جاکر — پاس کرنا ہے تا لفر جاکر

سر میں اسکے خیال باطل تھا — آپ بھی وہ جوان جاہل تھا

گفتگو میں کجی لگا کرنے — ہوا موجود مارنے مرنے

چاہتا تھا کہ آپ کو مارے — بارے ہتھیار چھن گئے سارے

رفقا کے تئیں نکال دیا — رنجہ کر ٹھلوؤں کو ٹال دیا

اُٹھ گئے جو حرامزادے تھے — ہو چکے دل میں جو ارادے تھے

عاقبت اس کو باندھ کر بھیجا — کہا پلٹن سے لکھنؤ لے جا

جمع تھے لوگ سو پریشاں ہیں — رہ گئے ہیں سو عجز کیشاں ہیں

جنگ نے صبح کے تئیں ہے نہ شام — آشتی کے ہیں اب پیام و سلام

غالباً صبح آج کل ہووے — ہر طرف جملگی خلل ہووے

لے کے اب ملک و مال سب نواب — راہ لیتے ہیں لکھنؤ کی شتاب

سال تاریخ کا تھا مجھ کو خیال — لطف کے رو سے کی ملک نے مقال

کا سے سخن گستر و جہاں استاد — فتح نواب سے کر اب دل شاد

۱۱۹۷ / ۱۲۰۹

میر کوئی غزل کہو اب تم
لذتِ شعر میں رہو خود گم

یہہ مثنوی تمام ہوئی

دیوانِ اوّل

کا سیا ہی سماں ہے

و لیا ہوا
قیامت کو کیا ہوا
واعظ رحمت کو کیا ہوا
کہ طاقت کو کیا ہوا
رامت کو کیا ہوا
کو کیا ہوا

میر تقی میر دہلوی

گذارش

مجھے فخر ہے کہ سالہا سال کی محنت اور کاوش کے بعد کلام افصح الفصحا میر تقی میر
بترتیب جدید ناظرین کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے میر کا کلیات اب تک عام
طریقے سے نہایت لاپروائی کے ساتھ غلطیوں کی نذر ہوتا رہا ہے لیکن اس مرتبہ
خصوصیت کے ساتھ متعدد قلمی اور سابقہ مطبوعہ نسخوں سے اسکی تصحیح کا پورا
اہتمام کیا گیا جسکو مصور درد مولوی عبدالباری آسی اور جناب مولوی سید جعفر علی صاحب
فاضل دیوبند نے نہایت غور اور امعان نظر کے ساتھ اصل پر نظر ثانی کرکے
کئی کئی مرتبہ کاپیوں اور پروفوں کو دیکھ کر صحیح کیا اور بعد کو آسی صاحب نے
اس پر فرہنگ اور مقدمہ کا اضافہ فرمایا۔ اس میں جو حواشی دیے گئے ہیں
وہ بھی میر کے کلام کے توازن کے لیے بہت موزوں ہیں امید ہے کہ مبصرین و
ماہرین کی نگاہوں میں یہ مطبع کی گراں بہا خدمت درجۂ قبول پائیگی اور شائقین اسکی
قدردانی فرماکر مطبع کو ایسی دوسری اہم خدمات ادبی و علمی کے لیے آمادہ فرمائینگے

المشتہر
منیجر نولکشور پریس صیغۂ بکڈپو لکھنؤ

نکلے ہے چشمہ جو کوئی جوش زناں پانی کا ٭ یاد دہ ہے وہ کسو چشم کی گریانی کا

لطف اگر یہ ہے بتاں صندلِ پیشانی کا ٭ حسن کیا صبح کے پھر چہرۂ نورانی کا

کفر کچھ چاہیئے اسلام کی رونق کیلئے ٭ حسن زنار ہے تسبیح سلیمانی کا

درہمی حال کی ہے سارے مرے دیواں میں ٭ سیر[۱] کر تو بھی یہ مجموعہ پریشانی کا

جان گھبراتی ہے اندوہ سے تن میں کیا کیا ٭ تنگ احوال ہے اس یوسفِ زندانی کا

کھیل لڑکوں کا سمجھتے تھے محبت کے تئیں ٭ ہے بڑا حیف ہمیں اپنی بھی نادانی کا

[۲] وہ بھی جانے ہے لہو رو کے لکھا ہے مکتوب ٭ ہم نے سرنامہ کیا کاغذِ افشانی کا

اُس کا منہ دیکھ رہا ہوں سو وہی دیکھوں ہوں ٭ نقش کا سا ہے سماں میری بھی حیرانی کا

بُت پرستی کو تو اسلام نہیں کہتے ہیں
معتقد کون ہے میرؔ ایسی مسلمانی کا

جامۂ مستیِ عشق اپنا مگر کم گھیر تھا ٭ دامنِ تر کا مرے دریا ہی کا سا پھیر تھا

دیر[۳] میں کعبے گیا میں خانقہ سے اب کی بار ٭ راہ سے میخانہ کی اس راہ میں کچھ پھیر تھا

بلبلوں نے کیا گل افشاں میرؔ کا مرقد کیا
دُور سے آیا نظر تو پھولوں کا اک ڈھیر تھا

اس عہد میں الٰہی محبت کو کیا ہوا ٭ چھوڑا وفا کو اُن نے مروت کو کیا ہوا

اُمیدوارِ وعدۂ دیدار مر چلے ٭ آتے ہی آتے یارو قیامت کو کیا ہوا

کب تک تظلم آہ بھلا مرگ کے تئیں ٭ کچھ پیش آیا واقعہ رحمت کو کیا ہوا

اُس کے گئے پر ایسی گئی دل سے ہمنشیں ٭ معلوم بھی ہوا نہ کہ طاقت کو کیا ہوا

بخشش نے مجھ کو ابرِ کرم کی کیا خجل ٭ اے چشم جوشِ اشکِ ندامت کو کیا ہوا

جاتا ہے یار تیغ بکف غیر کی طرف ٭ اے کشتۂ ستم تری غیرت کو کیا ہوا

تھی صعب عاشقی کی بدایت ہی میرؔ پر
کیا جانیے کہ حال نہایت کو کیا ہوا

[۱] سیر کر تو بھی الخ فی زماننا اس کو یوں کہا جائیگا "دیکھ لے تو بھی یہ مجموعہ پریشانی کا" یا "تو بھی اس مجموعۂ پریشانی کی سیر کر۔"

[۲] کسی استاد کا شعر ہے ؎ سوادِ دیدہ حل کردم نوشتم نامہ سوئے تو ٭ کہ تا ہنگام خواندن چشم من افتد بروئے تو۔ مرزا غالب ؎ آنکھ کی تصویر سرنامے پہ کھینچی ہے کہ تا ٭ تجھ پہ کھل جائے کہ مجھ کو حسرتِ دیدار ہے

[۳] مرزا عبدالتقی بیگ مائل شاگرد مرزا غالب ؎ حوض کوثر پہ جا نکلتا ہے ٭ یہی رستہ شراب خانے کا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

غزل

تھا مستعار حسن سے اُس کے جو نُور تھا
خورشید میں بھی اُس ہی کا ذرہ ظہور تھا

ہنگامہ گرم کُن جو دل ... رتھا
پیدا ہر ایک نالے سے شورِ نشور تھا

پہنچا جو آپ کو تو میں متعدد و قلمی را ایں
معلوم اب ہوا کہ بہت میں بھی دُور تھا

آتش بلند دل کی نہ تھی ورنہ اے کلیم
یک شعلہ برقِ خرمنِ صد کوہِ طور تھا

مجلس میں رات ایک ترے پرتوے بغیر
کیا شمع کیا پتنگ ہر اک بے حضور تھا

منعم کے پاس قاقم و سنجاب تھا تو کیا
اُس رند کی بھی رات گزر گئی[1] جو عور تھا

قاصرِ نگاک میں ملے تو ملے لیکن اے سپہر
اُس شوخ کو بھی راہ پہ لانا ضرور تھا

قطعہ

پانوں ایک کاسۂ سر پر جو آگیا
یکسر وہ استخوان شکستوں سے چُور تھا

کہنی کسی لگاکر دیکھ کے چل راہ بے خبر
میں بھی کبھو کسو کا سرِ پُرغرور تھا

تھا وہ تو رشکِ حورِ بہشتی ہمیں میں میر
سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنی قصور تھا

اس پر فرہنگ اور مقدمہ
سے قریں تھا

آنکھیں نہ کہیں تھیں دلِ غمدیدہ کہیں تھا
آنکھوں کے تلے اپنے تو وہ ماہ جبیں تھا

وہ بھی میر کے کلام کے ... چشمکِ انجم
دم کے لئے لیکن

ہونٹھوں پہ مرے جب نفسِ بازپسیں تھا
جو درد و الم تھا سو کہے تو کہ وہیں تھا

ماہرین کی نگاہ ... ہجراں کی جہاں تن پہ رکھا ہے
... کچھ جز غزل آکر کے جہاں میں

گل میرے تصرف میں یہی قطعۂ زمیں تھا
جن لوگوں کے گل ملک یہ سب زیرِ نگیں تھا

قدمام آج کوئی یاں نہیں لیتا ہے انھوں کا

مسجد میں امام آج ہوا آکے کہاں سے
کل تک تو یہی میر خراباتِ نشیں تھا

[1] گزر گئی۔ بر وزن فعولن اب متروک ہے کیونکہ اس طرح صرف گزرگی۔ رہ جاتا ہے۔

رہی تھی دم کی کشاکش گلے میں کچھ باقی
سو اُس کی تیغ نے جھگڑا ہی انفصال کیا

مری اب آنکھیں نہیں کھلتیں ضعف سے ہمدم
نہ کہہ کہ نیند میں ہے تو یہ کیا خیال کیا

بہارِ رفتہ پھر آئی ترے تماشے کو
چمن کو یُمنِ قدم نے ترے نہال کیا

جواب نامہ سیاہی کا اپنی ہے وہ زلف
کسو نے حشر کو ہم سے اگر سوال کیا

لگا نہ دل کو کہیں کیا سُنا نہیں تو نے
جو کچھ کہ میرؔ کا اس عاشقی نے حال کیا

دیکھے گا جو تجھ رو کو سو حیران رہے گا
وابستہ ترے مو کا پریشان رہے گا

وعدہ تو کیا اُس سے دمِ صبح کا لیکن
اُس دم تئیں مجھ میں بھی اگر جان رہے گا

منعم نے بنا ظلم کی رکھ گھر تو بنایا
پر آپ کوئی رات ہی مہمان رہے گا

چھوٹوں کہیں ایذا سے، لگا ایک ہی جلاد
تا حشر مرے سر پہ یہ احسان رہے گا

چپٹے رہیں گے دشتِ محبت میں سر و تیغ
محشر تئیں خالی نہ یہ میدان رہے گا

جانے کا نہیں شور سخن کا مرے ہرگز
تا حشر جہاں میں مرا دیوان رہے گا

دل دینے کی ایسی حرکت اُن نے نہیں کی
جب تک جیئے گا میرؔ پشیمان رہے گا

تا گور کے اوپر وہ گُل اندام نہ آیا
ہم خاک کے آسودوں کو آرام نہ آیا

بے ہوشِ مےِ عشق ہوں کیا میرا بھروسا
آیا جو بخود صبح تو میں شام نہ آیا

کس دل سے ترا تیرِ نگہ پار نہ گزرا
کس جان کو یہ مرگ کا پیغام نہ آیا

دیکھا نہ اُسے دُور سے بھی منتظروں نے
وہ رشکِ مہِ عید لبِ بام نہ آیا

سو بار بیاباں میں گیا محملِ لیلیٰ
مجنوں کی طرف ناقہ کوئی گام نہ آیا

اب کے جو ترے کوچے سے جاؤں گا تو سُنیو
پھر جیتے جی اس راہ وہ بدنام نہ آیا

نے خون ہو آنکھوں سے بہا ٹک نہ ہوا داغ
اپنا تو یہ دل میرؔ کسو کام نہ آیا

[1] جان میر تقی سے پہلے اور میر تقی کے معاصرین کے یہاں بصورت تذکیر بھی پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ مرزا رفیع سوداؔ کے اس شعر میں
؎ تیشے سے جو کوہ کن نے سر کو پٹکا ۔ شیریں کا یہ سُن کے جان تن سے بھٹکا
مگر اب بالاتفاق دہلی اور لکھنؤ کے فصحا میں مؤنث بولا جاتا ہے۔ آسی
[2] مصحفی کا شعر اسی انداز کا ہے ؎ مرضِ عشق سے گر اب کے سنبھل جاؤں گا ۔ تو میں دو چار برس کو کہیں ٹل جاؤں گا

شب ہجر میں کم تظلم کیا　　　کہ ہمسائگاں پر ترحم کیا

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات　　　کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

زمانے نے مجھ جرعہ کش کو ندان　　　کیا خاک و خشتِ سرِ خم کیا

جگر ہی[1] میں یک قطرہ خوں ہے سرشک　　　پلک تک گیا تو تلاطم کیا

کسو وقت پاتے نہیں گھر اسے
بہت میر نے آپ کو گم کیا

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا　　　دیکھا اس بیماریِ دل نے آخر کام تمام کیا

عہدِ جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند　　　یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا

حرف نہیں جاں بخشی میں اس کی خوبی اپنی قسمت کی　　　ہم سے جو پہلے کہہ بھیجا سو مرنے کا پیغام کیا

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی　　　چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

سارے رند اوباش جہاں کے تجھ سے سجود میں رہتے ہیں　　　بانکے ٹیڑھے ترچھے تیکھے سب کا تجھ کو امام کیا

سرزد ہم سے بے ادبی تو وحشت میں بھی کم ہی ہوئی　　　کوسوں اس کی اور گئے پر سجدہ ہر ہر گام کیا

کس کا کعبہ کیسا قبلہ، کون حرم ہے کیا احرام　　　کوچے کے اس کے باشندوں نے سب کو یہیں سے سلام کیا

شیخ جو ہے مسجد میں ننگا۔ رات کو تھا میخانہ میں　　　جبہ، خرقہ، کرتا، ٹوپی، مستی میں انعام کیا

کاش اب برقع منہ سے اٹھا دے، ورنہ پھر کیا حاصل ہے　　　آنکھ مندے پر ان نے گو دیدار کو اپنے عام کیا

یاں کے سپید و سیہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے　　　رات کو رو رو صبح کیا۔ یا دن کو جوں توں شام کیا

صبح چمن میں اس کو کہیں تکلیف ہوا لے آئی تھی　　　رخ سے گل کو مول لیا۔ قامت سے سرو غلام کیا

ساعدِ سیمیں دونوں اس کے ہاتھ میں لا کر چھوڑ دیے　　　بھولے اس کے قول و قسم پر ہائے خیالِ خام کیا

کام ہوئے ہیں سارے ضائع ہر ساعت کی سماجت سے　　　استغنا کی چوگنی ان نے جوں جوں میں ابرام کیا

ایسے آہوئے رم خوردہ کی وحشت کھونی مشکل تھی　　　سحر کیا، اعجاز کیا، جن لوگوں نے تجھ کو رام کیا

میر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

چمن میں گل نے جو کل دعویٰ جمال کیا　　　جمالِ یار نے منہ اس کا خوب لال کیا

فلک نے آہ تری رہ میں ہم کو پیدا کر　　　برنگِ سبزۂ نورستہ پائمال کیا

[1] مرزا غالب دہلوی مرحوم: دل میں پھر گریے نے اک شور اٹھایا غالب + آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفاں نکلا۔

دعویٰ کیا تھا گل نے ترے رخ سے باغ میں[1] — سیلی لگی صبا کی سو منھ لال ہو گیا

قامت خمیدہ رنگ شکستہ بدن نزار
تیرا تو میر غم میں عجب حال ہو گیا[2]

بیتاب جی کو دیکھا دل کو کباب دیکھا — جیتے رہے تھے کیوں ہم جو یہ عذاب دیکھا
پودا ستم کا جس نے اس باغ میں لگایا — اپنے کیے کا اُن نے ثمرہ شتاب دیکھا
دل کا نہیں ٹھکانا۔ بابت جگر کی گم ہے — تیرے بلاکشوں کا ہم نے حساب دیکھا
آباد جس میں تجھ کو دیکھا تھا ایک مدت — اس دل کی مملکت کو اب ہم[3] خراب دیکھا

لیتے ہی نام اُس کا سوتے سے چونک اٹھے ہو
ہے خیر میر صاحب، کچھ تم نے خواب دیکھا

دل بہم پہنچا بدن میں تب سے سارا تن جلا — آ پڑی یہ ایسی چنگاری کہ پیراہن جلا
سرکشی ہی ہے جو دکھلاتی ہے اس مجلس میں داغ — ہو سکے تو شمع ساں دیجے رگِ گردن جلا
بدر ساں اب آخر آخر چھا گئی مجھ پر یہ آگ — ورنہ پہلے تھا مرا جوں ماہِ نو دامن جلا
کب تلک دھونی لگائے جوگیوں کی سی رہوں — بیٹھے بیٹھے در پہ تیرے تو مرا آسن جلا
گرمی اُس آتش کے پرکالے سے رکھے چشم تب — جب کوئی میری طرح سے دیوے سب تن من جلا
ہو جو منت[4] سے تو کیا وہ شب نشینی باغ کی — کاٹ اپنی رات کو خار و خسِ گلخن جلا
سوکھتے ہی آنسوؤں کے نور آنکھوں کا گیا — بجھ ہی جاتے ہیں دیے جس وقت سب روغن جلا
شعلہ افشانی نہیں یہ کچھ نئی اس آہ سے — دَوں لگی ہے ایسی ایسی بھی کہ سارا بن جلا

آگ سی اک دل میں سلگے ہے کبھو بھڑکی تو میر
دیگی میری ہڈیوں کا ڈھیر جوں[5] ایندھن جلا

---

[1] لا اعلم — دعویٰ کیا تھا گل نے کل اُس کے رنگ و بو کا ؛ دھولیں صبا نے ماریں، شبنم نے منھ پہ تھوکا۔۱۲
ایسا ہی ایک اور شعر ہے — چمن میں گل نے جو کل دعویٰ جمال کیا ؛ صبا نے مار طمانچہ منھ اُس کا لال کیا۔
[2] حسرت موہانی — عشق بتاں کو جی کا جنجال کرلیا ہے ؛ حسرت یہ تو نے اپنا کیا حال کرلیا ہے۔
[3] فی زمانہ — اب ہم نے خراب دیکھا" کہیں گے۔
[4] احسان لینے کی مذمت میں کسی اُستاد کا یہ شعر بھی بہت خوب ہے — دیوار بارِ منتِ مزدور سے ہے خم ؛ اے خانماں خراب احساں اُٹھائیے
یا یہ شعر ذوق دہلوی کا — نہ پکڑیں دامن الیاس گرداب بلا میں ہم ؛ کہ بدتر ڈوب مرنے سے ہے جینا اس سہارے کا
[5] جوں ایندھن۔ قدما کے یہاں اکثر اس قسم کی ترکیبیں ملتی ہیں مگر زمانہ حال کے فصحا کے نزدیک مختلف فیہ ہیں ۱۲

جس سر کو غرور آج ہے یاں تاج وری کا
کل اُس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا

شرمندہ ترے رُخ سے ہے رُخسار پری کا
چلتا نہیں کچھ آگے ترے کبکِ دری کا

آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت
اسباب لُٹا راہ میں یاں ہر سفری[1] کا

زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی
اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا

ہر زخمِ جگر داورِ محشر سے ہمارا
انصاف طلب ہے تری بیدادگری کا

اپنی تو جہاں آنکھ لڑی پھر وہیں دیکھو
آئینہ کو لپکا ہے پریشاں نظری کا

صد موسمِ گل ہم کو تہِ بال ہی گزرے
مقدور نہ دیکھا کبھو بے بال و پری کا

اس رنگ سے جھمکے ہے پلک پر کہ کہے تو
ٹکڑا ہے ترا اشک عقیقِ جگری کا

کل سیر کیا ہم نے سمندر کو بھی جاکر
تھا دستِ نگر پنجۂ مژگاں کی تری کا

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا

ٹک میرؔ جگر سوختہ کی جلد خبر لے
کیا یار بھروسا ہے چراغِ سحری کا

منہ تکا ہی کرے ہے جس تس کا
حیرتی ہے یہ آئینہ کس کا

شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہوں
دل ہوا ہے چراغِ مفلس کا

تھے برے مغبچوں کے تیور لیک
شیخ میخانہ سے بھلا کھسکا[2]

داغ آنکھوں سے کھل رہے ہیں سب
ہاتھ دستہ ہوا ہے نرگس کا

قطعہ

بحر کم ظرف ہے بسانِ حباب
کاسہ لیس اب ہوا ہے تو جس کا

فیض اے ابر، چشمِ تر سے اُٹھا
آج دامن وسیع ہے اس کا

تاب کس کو جو حال میرؔ سنے
حال ہی اور کچھ ہے مجلس کا

وہ اک روش سے کھولے ہوئے بال ہو گیا
سنبل چمن کا مفت میں پامال ہو گیا

الجھاؤ پڑ گیا جو ہمیں اُس کے عشق میں
دل سا عزیز جان کا جنجال ہو گیا

کیا امتداد مدتِ ہجراں بیاں کروں
ساعت ہوئی قیامت و مہ سال ہو گیا

[1] سفری بمعنی مسافر۔
[2] کھسکا۔ قافیہ معمولہ۔

فرہاد ہاتھ تیشہ پہ ٹک رہ کے ڈالتا — پتھر تلے کا ہاتھ ہی اپنا نکالتا
بگڑا اگر وہ شوخ تو سنیو کہ رہ گیا — خورشید اپنی تیغ و سپر ہی سنبھالتا
یہ سر تبھی سے گوئے ہے میدانِ عشق کا — پھرتا تھا جن دنوں میں تو گیندیں اچھالتا
بن سکے پھوٹے بنتی نہ تھی کوہکن کے تئیں — خسرو سے سنگ سینہ کو کس طور ٹالتا

چھاتی سے ایک بار لگاتا جو وہ تو میرؔ
برسوں یہ زخم سینے کا ہم کو نہ سالتا

گل شرم سے بہ جائیگا گلشن میں ہو کر آب سا — برقع سے گر نکلا کہیں چہرہ ترا مہتاب سا
گلبرگ کا یہ رنگ ہے مرجاں کا ایسا ڈھنگ ہے — دیکھو نہ جھمکے ہے پڑا وہ ہونٹھ لعلِ ناب سا
وہ مایۂ جاں تو کہیں پیدا نہیں جوں کیمیا — میں شوق کی افراط سے بیتاب ہوں سیماب سا
دل تاب ہی لایا نہ ٹک تا یاد رہتا ہمنشیں — اب عیش روزِ وصل کا ہے جی میں بھولا خواب سا
سنا ہے میں جان کے ہوش و حواس و دم نہ تھا — اسباب سارا لے گیا آیا تھا ایک سیلاب سا
ہم سرکشی سے مدتوں مسجد سے بچ بچ کر چلے — اب سجدے ہی میں گزرے ہے قد جو ہوا محراب سا
تھی عشق کی وہ ابتدا جو موج سی اٹھی کبھو — اب دیدۂ تر کو جو تم دیکھو تو ہے گرداب سا
بہکے جو ہم مست آگئے سو بار مسجد سے اٹھا — واعظ کو مارے خوف کے کل لگ گیا جلاب سا

رکھ ہاتھ دل پر میرؔ کے دریافت کر کیا حال ہے؟
رہتا ہے اکثر یہ جواں کچھ ان دنوں بیتاب سا

مر رہتے جو گل بن تو سارا یہ خلل جاتا — نکلا ہی نہ جی ورنہ کانٹا سا نکل جاتا
پیدا ہی کہ پنہاں تھی آتش نفسی میری — میں ضبط نہ کرتا تو سب شہر یہ جل جاتا
میں گریۂ خونیں کو روکے ہی رہا۔ ورنہ — یک دم میں زمانہ کا یاں رنگ بدل جاتا
بن پوچھے کرم سے وہ جو بخشش نہ دیتا تو — پرسش میں ہماری ہی دن حشر کا ڈھل جاتا
استادہ جہاں میں تھا۔ میدانِ محبت میں — واں رستم اگر آتا تو دیکھ کے ٹل جاتا
وہ سیر[1] کا وادی کے مائل نہ ہوا۔ ورنہ — آنکھوں کو غزالوں کی پاؤں تلے مل جاتا

[1] سیر۔ اب بالاتفاق تانیث بولا جاتا ہے لیکن میرؔ سے پہلے اور میرؔ کے زمانے میں مذکر بھی بولا جاتا تھا جیسا کہ ذیل کے اشعار سے پتہ چلتا ہے۔
خود میرؔ کا ایک شعر ہے ؎ ملا ہو خاک میں کس کس طرح کا عالم یاں ÷ نکل کے شہر سے ٹک سیر کر مزاروں کا
مرزا رفیع السودا کا شعر ہے ؎ بسکہ پونچھوں ہوں میں اپنی چشم خوں آلود کو ÷ جامہ کا ہر ایک تختہ سیر ہے گلزار کا

حالِ دلِ میرؔ کا رو رو کے سب اے ماہ سنا — شب کو القصہ عجب قصۂ جانکاہ سُنا
نابلد ہو کے رہِ عشق میں پہنچوں تو کہیں — ہمرہِ خضر کو یاں کہتے ہیں گمراہ سُنا
کوئی ان طوروں سے گزرے ہے ترے غم میں مری — گاہ تو نے نہ سُنا حال مرا گاہ سُنا
خوابِ غفلت میں ہیں یاں سب۔ تو عبث جاگا میرؔ — بیخبر دیکھا انھیں میں[1] جنھیں آگاہ سُنا

جب جنوں سے ہمیں توسّل تھا — اپنی زنجیرِ پا ہی کا غل تھا
بستر اپنا چمن میں جوں بلبل — نالہ سرمایۂ توکّل تھا
یک نگہ کو وفا نہ کی گویا — موسمِ گل صفیرِ بلبل تھا
اُن نے پہچان کر ہمیں مارا — منھ نہ کرنا ادھر تجاہل تھا
شہر میں جو نظر پڑا اُس کا — کشتۂ ناز یا تغافل تھا
اب تو دل کو نہ تاب ہے نہ قرار — یادِ ایام جب تحمّل تھا
جا پھنسا دامِ زلف میں آخر — دل نہایت ہی بے تأمّل تھا
یوں گئی قد کی خم ہوئے جیسے — عمر اک رہروِ سرِ پل تھا
خوب دریافت جو کیا ہم نے — وقتِ خوش میرؔ نکہتِ گل تھا

آگے جمالِ یار کے معذور ہو گیا — گل اک چمن میں دیدۂ بے نور ہو گیا
یک چشم منتظر ہے کہ دیکھے ہے کب سے راہ — جوں زخم تیری دُوری میں ناسور ہو گیا
قسمت تو دیکھ شیخ کو جب لہر آئی تب — دروازہ شیرہ خانے کا معمور ہو گیا
پہنچا قریب مرگ کے وہ صیدِ ناقبول — جو تیرے صیدگاہ سے ٹک دور ہو گیا
دیکھا یہ ناؤ نوش کہ نیشِ فراق سے — سینہ تمام خانۂ زنبور ہو گیا
اُس ماہِ چاردہ[۱۴] کا چھپے عشق کیونکہ آہ — اب تو تمام شہر میں مشہور ہو گیا
شاید کسو کے دل کو لگی اُس گلی میں چوٹ — میری بغل میں شیشۂ دل چور ہو گیا
دیکھا جو میں نے یار تو وہ میرؔ ہی نہیں — تیرے غمِ فراق میں رنجور ہو گیا

[1] یعنی میں نے جنھیں آگاہ سُنا۔

شادابی و لطافت ہرگز ہوئی نہ اُس میں
تیری مسوں پہ گرچہ سبزے نے زہر کھایا
آخر کو مر گئے ہیں اُس کی ہی جستجو میں
جی کے تئیں بھی کھویا لیکن اُسے نہ پایا
لگتی نہیں ہے دارو، ہیں سب طبیب حیراں
اک روگ میں بسا ہا جی کو کہاں لگایا
کہہ ہیچ اُس کے مُنھ کو جی میں ڈرا یہاں تو
بارے وہ شوخ اپنی خاطر میں کچھ نہ لایا
ہونا تھا مجلس آرا اگر غیر کا تجھے تو
مانند شمع مجھ کو کاہے کے تئیں جلایا
تھی یہ کہاں کی یاری آئینہ رو کہ تو نے
دیکھا جو میر کو تو لے ہیچ مُنھ بنایا

شکوہ کروں میں کب تک اُس اپنے مہرباں کا
القصہ رفتہ رفتہ دشمن ہوا ہے جاں کا
گریہ پہ رنگ آیا، قید قفس سے شاید
خوں ہو گیا جگر میں اب داغ گلستاں کا
لے جھاڑو ٹوکرا ہی آتا ہے صبح ہوتے
جاروب کش مگر ہے خورشید اُس کے ہاں کا
دی آگ رنگ گل نے واں اے صبا چمن کو
یاں ہم جلے قفس میں سُن حال آشیاں کا
ہر صبح میرے سر پر اک حادثہ نیا ہے
پیوند ہو زمیں کا۔ شیوہ اس آسماں کا
ان صید افگنوں کا کیا ہو شکار کوئی قطعہ
ہوتا نہیں ہے آخر کام اُن کے امتحاں کا
تب تو مجھے کیا تھا تیروں سے صید اپنا
اب کرتے ہیں نشانہ ہر میرے استخواں کا
فتراک جس کا اکثر لوہو میں تر رہے ہے[1]
وہ قصد کب کرے ہے اس صید ناتواں کا
کم فرصتی جہاں کے مجمع کی کچھ نہ پوچھو
احوال کیا کہوں میں اس مجلس رواں[2] کا
سجدہ کریں ہیں سُنکر اوباش سارے اُس کو
سیّد پسر وہ پیارا ہے گا امام بانکا[3]
ناحق شناسی ہے یہ زاہد نہ کر برابر
طاعت سے سو برس کی سجدہ اس آستاں کا
جس دن کہ اُس کے مُنھ سے برقع اُٹھے گا سنیو
اُس روز سے جہاں میں خورشید پھر نہ جھانکا
ناحق یہ ظلم کرنا انصاف کر پیارے
ہے کون سی جگہ کا، کس شہر کا۔ کہاں کا
سودائی ہو تو رکھے بازار عشق میں پا
سر مفت بیچتے ہیں یہ کچھ چلن ہے واں کا
سو گالی ایک چشمک اتنا سلوک تو ہے
اوباش خانہ جنگ اُس خوش چشم بدزباں کا

[1] رہے ہے: اب متروک ہے۔ اس کی بجائے "رہتا ہے" فصیح ہے۔
[2] "مجلس رواں" دُنیا کو مجلس رواں کہنا، نہایت لطیف ہے کیونکہ یہاں کی ہر چیز سفری اور ہر شے گزران ہے۔
[3] قافیہ معمولہ۔

بیتاب و تواں یوں میں کاہے کو تلف ہوتا
یا قوتِ ترے لب کی ملتی تو سنبھل جاتا

اُس سیم بدن کو تھی کب تاب تعب اتنی
وہ چاندنی میں شب کی ہوتا تو پگھل جاتا

مارا گیا تب گزرا بوسے سے ترے لب کے
کیا میر بھی لڑکا تھا باتوں میں بہل جاتا

سُنیو جب وہ کبھو سوار ہوا
تا بہ روح الامینؑ شکار ہوا

اُس فریبندہ کو نہ سمجھے آہ
ہم نے جانا کہ ہم سے یار ہوا

نالہ ہم خاکساروں کا آخر
خاطرِ عرش کا غبار ہوا

مر چلے بے قرار ہوکر ہم
اب تو تیرے تئیں قرار ہوا

وہ جو خنجر بکف نظر آیا
میر سو جان سے نثار ہوا

مانندِ شمعِ مجلسِ شب اشکبار پایا
القصہ میر کو ہم بے اختیار پایا

احوال خوش اُنھوں کا ہم بزم میں جو تیرے
افسوس ہی کہ ہم نے واں کا نہ بار پایا

چیتے جو ضعف ہوکر زخمِ رسا سے اُس کے
سینے کو چاک دیکھا دل کو فگار پایا

شہرِ دل ایک مدت اُجڑا بسا غموں میں
آخر اُجاڑ دینا اُس کا قرار پایا

اتنا نہ تجھ سے ملتے نے دل کو کھو کے روتے
جیسا کیا تھا ہم نے ویسا ہی یار پایا

کیا اعتبار یاں کا پھر اُس کو خوار دیکھا
جس نے جہاں میں آکر کچھ اعتبار پایا

آہوں کے شعلے جس جا اُٹھتے تھے میر سے شب
واں جاکے صبح دیکھا مشتِ غبار پایا

مارا زمیں میں گاڑا۔ تب اُس کو صبر آیا
اس دل نے ہم کو آخر یوں خاک میں ملایا

اُس گُل زمیں سے اب تک اُگتے ہیں سرو جس جا
مستی میں جھکتے جس پر تیرا پڑا ہے سایا

یکساں ہے قتل گہ اور اُس کی گلی تو مجھ کو
واں خاک میں میں لوٹا یاں لوہو میں نہایا

پوجے سے اور پتھر ہوتے ہیں یہ صنم تو
اب کس طرح اطاعت اُن کی کروں خدایا

تا چرخ نالہ پہنچا لیکن اثر نہ دیکھا
کرنے سے اب دعا کے میں ہاتھ ہے اُٹھایا

تیرا ہی منہ تکے ہے کیا جانئے کہ نو خط
کیا باغ سبز تو نے آئینہ کو دکھایا

ملہ مرزا غالب دہلوی مرحوم — مدفنِ عاشق سے اُگتی ہی جو کوسوں تک حنا ؛ کس قدر یا رب ہلاکِ حسرتِ پابوس تھا

شب درد و غم سے عرصہ مرے جی پہ تنگ تھا ۔ آیا شبِ فراق تھی یا روزِ جنگ تھا

کثرت میں درد و غم کے نہ نکلی کوئی طپش ۔ کوچہ جگر کے زخم کا شاید کہ تنگ تھا

لایا مرے مزار پہ اُس کو یہ جذبِ عشق ۔ جس بیوفا کو نام سے بھی میرے ننگ تھا

دیکھا ہو صید گہ میں تری صید کا جگر ۔ باآنکہ چھن رہا تھا یہ ذوقِ خدنگ تھا

دل سے مرے لگا نہ ترا دل ہزار حیف ۔ یہ شیشہ ایک عمر سے مشتاقِ سنگ تھا

مت کر عجب جو میرؔ ترے غم میں مر گیا
جینے کا اس مریض کے کوئی بھی ڈھنگ تھا

دل میں بھرا ز بسکہ خیالِ شراب تھا ۔ مانند آئینہ کے مرے گھر میں آب تھا

موجیں کرے ہے بحرِ جہاں میں ابھی تو تو ۔ جانے گا بعدِ مرگ کہ عالم حباب تھا

اُگتے تھے دستِ بلبل و دامانِ گل بہم ۔ صحنِ چمن، نمونۂ یوم الحساب تھا

ٹک دیکھ آنکھیں کھول کے اُس دم کی حسرتیں ۔ جس دم یہ سوجھے گی کہ یہ عالم بھی خواب تھا

دل جو نہ تھا تو رات زخود رفتگی میں میرؔ
گہ انتظار و گاہ مجھے اضطراب تھا

کیا طرح ہے، آشنا گاہے گہے نا آشنا ۔ یا تو بیگانے ہی رہیے، ہوجیے یا آشنا

پائمالِ صد جفا ناحق نہ ہو اے عندلیب ۔ سبزۂ بیگانہ بھی تھا اِس چمن کا آشنا

کون سے یہ بحرِ خوبی کی پریشاں زلف ہے ۔ آتی ہے آنکھوں میں میرے موجِ دریا آشنا[1]

قطعہ
بلبلیں پائیز میں کہتی تھیں ہوتا کاشکے ۔ یک مژہ رنگِ فراری اِس چمن کا آشنا

کو گل و لالہ[2] کہاں سنبل سمن ہم نسترن ۔ خاک سے یکساں ہوئے ہیں ہائے کیا کیا آشنا

قطعہ
کیا کروں، کس سے کہوں، اتنا ہی بیگانہ ہے یار ۔ سارے عالم میں نہیں پاتے کسی کا آشنا

جس کی ہیں جاہی و سلطنت اُن نے یہ مجھ سے کہا ۔ ہم تو کہتے گرمیاں ہم سے وہ ہوتا آشنا

قطعہ
یوں سنا جا ہے[3] کہ کرتا ہے سفر کا عزم جزم ۔ ساتھ اب بیگانہ وضعوں کے ہمارا آشنا

شعرِ صائب کا مناسب ہے ہماری اور سے ۔ سامنے اُس کے پڑھے گر یہ کوئی جا آشنا

---

[1] آتی ہے آنکھوں میں میرے موجِ دریا آشنا۔ یعنی میری نظر کو موجِ دریا آشنا معلوم ہوتی ہے۔

[2] مرزا غالب دہلوی ؎ سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں ؎ خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں۔

[3] یوں سنا جا ہے، بجائے یوں سنا جاتا ہے۔ کے متروک ہے۔

یا روئے یا رُلایا اپنی تو یوں ہی گزری
قیدِ قفس میں ہیں تو خدمت ہے نالگی کی

قطعہ

کیا ذکرِ ہمصفیراں، یارانِ شاد ماں کا
گلشن میں تھے تو ہم کو منصب تھا روضخواں کا

پوچھو تو میر سے کیا کوئی نظر پڑا ہے
چہرہ اُتر رہا ہے کچھ آج اُس جواں کا

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا
دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

قسم جو کھائیے تو طالعِ زلیخا کی
عزیز مصر کا بھی صاحب اک غلام لیا

خراب رہتے تھے مسجد کے آگے میخانے
نگاہِ مست نے ساقی کی انتقام لیا

وہ کج روش نہ ملا راستی میں مجھ سے کبھی
نہ سیدھی طرح سے اُن نے مرا سلام لیا

مزا دکھا دیں گے بیرحمی کا تری صیاد
گر اضطرابِ اسیری نے زیرِ دام لیا

مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

اگرچہ گوشہ گزیں ہوں میں شاعروں میں میر
پہ میرے شور نے روئے زمیں تمام لیا

شعر

سیر کے قابل ہے دل صد پارہ اس نخچیر کا
جس کے ہر ٹکڑے میں ہو پیوست پیکاں تیر کا

سب کھلا باغِ جہاں الّا یہ حیران و خفا
جس کو دل سمجھے تھے ہم سو غنچہ تھا تصویر کا

بوئے خوں سے جی رُکا جاتا ہے اے بادِ بہار
ہو گیا ہے چاک دل شاید کسو دلگیر کا

کیونکہ نقّاشِ ازل نے نقشِ ابرو کا کیا
کام ہے اک تیرے مُنہ پر کھینچنا شمشیر کا

رہ گزر سیلِ حوادث کا ہے بے بنیاد دہر
اس خرابے میں نہ کرنا قصد تم تعمیر کا

بس طبیب اُٹھ جا مری بالیں سے مت دے دردِ سر
کام جاں آخر ہوا اب فائدہ تدبیر کا

نالہ کش ہیں عہدِ پیری میں بھی تیرے در پہ ہم
قدِ خم گشتہ ہمارا حلقہ ہے زنجیر کا

جو ترے کوچہ میں آیا۔ پھر وہیں گاڑا اُسے
تشنۂ خوں میں تو ہوں اس خاکِ دامنگیر کا

خوں سے میرے ہوئی یک دم خوشی تم کو تو لیک
مفت میں جاتا رہا جی ایک بے تقصیر کا

لختِ دل سے جوں چھڑی پھولوں کی گوندھی ہے ولے
فائدہ کچھ اے جگر اس آہِ بے تاثیر کا

گورِ مجنوں سے نجاویں گے کہیں ہم بے نو
عیب ہے ہم میں جو چھوڑیں ڈھیر اپنے پیر کا

کس طرح سے مانئے یارو کہ یہ عاشق نہیں
رنگ اُڑا جاتا ہے ٹک چہرہ تو دیکھو میر کا

اے تو کہ یاں سے عاقبت کار جائے گا
غافل نہ رہ کہ قافلہ اک بار جائے گا

موقوف حشر پر ہے سو آتی بھی وہ نہیں
کب درمیاں سے وعدۂ دیدار جائے گا

چھوٹا جو میں قفس سے تو سب نے مجھے کہا
بیچارہ کیونکہ تا سرِ دیوار جائے گا

دیگی نہ چین لذتِ زخم اُس شکار کو
جو کھا کے تیرے ہاتھ کی تلوار جائے گا

آئے گی اک بلا ترے سر سُن لے ای صبا
زلفِ سیہ کا اُس کے اگر تار جائے گا

باہر نہ آتا چاہ سے یوسفؑ جو جانتا
لے کارواں مرے تئیں بازار جائے گا

تدبیر میرے عشق کی کیا فائدہ طبیب
اب جان ہی کے ساتھ یہ آزار جائے گا

آئے بن اُس کے حال ہوا جائے ہے تغیر
کیا حال ہوگا پاس سے جب یار جائے گا

کوچہ میں اُس کے رہنے سے باز آ وگرنہ میر
اک دن تجھے وہ جان سے بھی مار جائے گا

کیا کہوں کیسا ستم غفلت سے مجھ پر ہو گیا
قافلہ جاتا رہا میں صبح ہوتے سو گیا

بیکسی مدت تلک برسا کی اپنی گور پر
جو ہماری خاک پر سے ہو کے گزرا رو گیا

کچھ خطرناکی طریقِ عشق میں پنہاں نہیں
کھپ گیا وہ راہرو اس راہ ہو کر جو گیا

مُدعا جو ہے سو وہ پایا نہیں جاتا کہیں
ایک عالم جستجو میں جی کو اپنے کھو گیا

میر ہر یک موج میں ہے زلف ہی کا سا دماغ[1]
جب سے وہ دریا پہ آ کر بال اپنے دھو گیا

مت ہو دُشمن ای فلک مجھ پائمالِ راہ کا
خاک اُفتادہ ہوں میں بھی اک فقیر اللہ کا

سیکڑوں طرحیں نکالیں یار کے آنے کی لیک
عذر ہی جا ہے[3] چلا اُس کے دلِ بدخواہ کا

گر کوئی پیرِ مغاں مجھ کو کرے تو دیکھے پھر
میکدہ سارے کا سارا صرف ہے اللہ کا

کاش تیرے غم رسیدوں کو بُلاویں حشر میں
ظلم ہے اک خلق پر آشوب اُن کی آہ کا

جو سُنا ہشیار اس میخانہ میں تھا بے خبر
شوق ہی باقی رہا ہم کو دلِ آگاہ کا

باندہ مت رونے کا تار اے ناقباحت فہم چشم
اس سے پایا جائے ہے سر رشتہ جی کی چاہ کا

شیخ مت کر ذکر ہر ساعت قیامت کا کہ ہے
عرصۂ محشر نمونہ اُس گلی بازی گاہ کا

[1] مومن خاں مومن دہلوی — ہم نکالیں گے سن ای موج ہوا بل تیرے ؎ اُس کی زلفوں کے اگر بال پریشاں ہونگے
[2] صفحہ ۱۳ سطر ۱۶ دیکھئے کہ موج صبا کو وہاں بھی زلف سے تشبیہ دی ہے۔ [3] عذر ہی جا ہے چلا یعنی عذر ہی چلا جاتا ہے۔ ۱۲ آسی

آتا بجاں ما ہمرہیم و تا بمنزل دیگراں | فرق باشد جانِ ما از آشنا تا آشنا

داغ ہیِ تاباں[1] علیہ الرحمہ کا چھاتی پہ میر
ہو نجات اُس کو بچارا ہم سے بھی تھا آشنا

گل کو محبوب ہم قیاس کیا | فرق نکلا بہت جو باس[2] کیا
دل نے ہم کو مثالِ آئینہ | ایک عالم کا روشناس کیا
کچھ نہیں سوجھتا ہمیں اُس بن | شوق نے ہم کو بیحواس کیا
عشق میں ہم ہوئے نہ دیوانے | قیس کی آبرو کا پاس کیا
دَور سے چرخ کے نکل نہ سکے | ضعف نے ہم کو مورطاس کیا
صبح تک شمع سر کو دھنتی رہی | کیا پتنگے نے التماس کیا

ایسے وحشی کہاں ہیں اے خوباں
میر کو تم عبث اُداس کیا

مفت آبروے زاہدِ علامہ لے گیا | اک مُغبچہ اُتار کے عمامہ لے گیا
داغِ فراق و حسرتِ وصل آرزوے شوق | میں ساتھ زیرِ خاک بھی ہنگامہ لے گیا
پہنچا نہ پہنچا آہ گیا، سو گیا غریب | وہ مُرغِ نامہ بر جو مرا نامہ لے گیا

اُس راہزن کے ڈھنگوں سے دیوے خدا پناہ
اک مرتبہ جو میر جی کا جامہ لے گیا

کا جی جامہ

ل[1] تاباں مرحوم کا نام میر عبدالحیٔ تھا۔ رضوی سید تھے۔ دہلی ان کی زاد بوم تھی۔ ایسے حسین و جمیل تھے کہ لوگ ان کو یوسفِ ثانی کہتے تھے۔ ان کے تلمذِ شاعری میں اختلاف ہے۔ شیخ حاتم نے ان کو اپنا شاگرد بتایا ہے۔ شیفتہ نے گلشنِ بیخار میں سودا کا شاگرد بیان کیا ہے۔ خود ان کے کلام سے پتہ چلتا ہے کہ محمد علی حشمت کے شاگرد تھے۔ اوائل جوانی سے میخواری کی عادت قبیحہ پیدا ہو کر طبیعت ثانیہ بن گئی تھی اور اسی نے ان کی تندرستی کو خراب کیا بلکہ اسی میں ان کی جان گئی۔ مگر مرنے سے سات آٹھ روز پہلے شراب سے یک لخت توبہ کر لی اور اپنے دوستوں اور ملاقاتیوں کو رقعہ لکھ لکھ کر ترکِ مینوشی سے خبردار کر دیا تھا اور اپنا گواہ بنا لیا تھا۔ نہایت خوشگو شاعر تھے۔ مرزا مظہر جان جاناں کے مُرید تھے۔ افسوس کہ عالمِ شباب میں انتقال کیا۔ سنہ ۱۲۱۱ھ تک زندہ تھے۔ اب ان کا ایک مختصر دیوان چھپ گیا ہے ۱۲ آسی

ل[2] باس کیا۔ یعنی سونگھا۔ باس کرنا اب متروک ہے۔

گو کٹے سر کہ سوزِ دل جوں شمع
اب تو میری زبان سے نکلا

آ گئے اے نالہ ہے خدا کا نانوں
بس تو نہ آسمان سے نکلا

چشم و دل سے جو نکلا ہجراں میں
نہ کبھو بحر و کان سے نکلا

مر گیا جو اسیرِ قیدِ حیات
تنگنائے جہان سے نکلا

دل سے مت جا کہ حیف اُس کا وقت
جو کوئی اس مکان سے نکلا

اُس کی شیریں لبی کی حسرت میں
شہد پانی ہو شان سے نکلا

نامُرادی کی رسم میر سے ہے
طور یہ اس جوان سے نکلا

گرمی سے میں تو آتشِ غم کی پگھل گیا
راتوں کو روتے روتے ہی جوں شمع گل گیا

ہم خستہ دل ہیں تجھ سے بھی نازک مزاج تر
تیوری چڑھائی تو نے کہ یاں جی نکل گیا

گرمیِ عشق مانعِ نشو و نما ہوئی
میں وہ نہال تھا کہ اُگا اور جل گیا

مستی میں چھوڑ دیر کو کعبہ چلا تھا میں
لغزش بڑی ہوئی تھی ولیکن سنبھل گیا

ساقی نشے میں تجھ سے لنڈھا شیشۂ شراب
چل اب کہ دخترِ تاک کا جوبن تو ڈھل گیا

ہر ذرہ خاک تیری گلی کی ہے بے قرار
یاں کونسا ستم زدہ ماٹی میں رل گیا

عریاں تنی کی شوخی سے دیوانگی میں میر
مجنوں کے دشتِ خار کا داماں بھی چل گیا

سُنا ہی حال ترے کشتگاں بچاروں کا
ہوا نہ گور گڑھا ان ستم کے ماروں کا

ہزار رنگ کھلے گُل چمن کے ہیں شاہد
کہ روزگار کے سر خون ہے ہزاروں کا

ملا ہے خاک میں کس کس طرح کا عالم یاں
نکل کے شہر سے ٹک سیر کر مزاروں کا

عرق فشانی سے اُس زلف کی ہراساں ہوں
بھلا نہیں ہے بہت ٹوٹنا بھی تاروں کا

علاج کرتے ہیں سودائے عشق کا میرے
خلل پذیر ہوا ہے دماغ یاروں کا

ترے[۱] ہی زلف کو محشر میں ہم دکھا دیں گے
جو کوئی مانگے گا نامہ سیاہ کاروں کا

نگاہِ مست کے مارے ترے خراب ہیں شوخ
نہ ٹھور ہے نہ ٹھکانا ہے ہوشیاروں کا

کریں ہیں دعوئ خوش چشمی آہوانِ دشت
ٹک ایک دیکھنے چل مُلک ان گنواروں کا

۱ میر تقی سے جواب نامہ سیاہی کا اپنی ہی وہ زلف ÷ کسو نے حشر میں ہم سے اگر سوال کیا۔ ۲ شہد کا چھتہ

شہر میں کس مُنہ سے آوے سامنے تیرے کہ شوخ
جھائیوں سے بھر رہا ہے سارا چہرہ ماہ کا

سر فرو لاتی نہیں ہمت مری ہر اک کے پاس
ہوں گدائے آستاں میں میر حضرت شاہ کا

ایسی گلی اک شہر اسلام نہیں رکھتا
جس کوچے میں وہ بت صد بدنام نہیں رکھتا

آزار نہ دے اپنے کانوں کے تئیں اے گل
آغاز مرے غم کا انجام نہیں رکھتا

ناکامیِ صد حسرت خوش لگتی نہیں ورنہ
اب جی سے گزر جانا کچھ کام نہیں رکھتا

ہو خشک تو بہتر ہے، وہ ہاتھ بہاراں میں
مانندِ نے نرگس جو جام نہیں رکھتا

بن اُس کے ہم آغوشی بیتاب نہیں اب ہی
مدت سے بغل میں دل آرام نہیں رکھتا

میں داڑھی تری واعظ مسجد ہی میں منڈواتا
پر کیا کروں ساتھ اپنے حجام نہیں رکھتا

وہ مفلس اُن آنکھوں سے کیونکر کے بسر آوے
جو اپنی گرہ میں اک بادام نہیں رکھتا

کیا بات کروں اُس سے مل جائے جو وہ میں تو
اس ناکسی سے روئے دشنام نہیں رکھتا

یوں تو رہ و رسم اُس کو اس شہر میں سب سے ہے
اک میر ہی سے خط و پیغام نہیں رکھتا

خوبی کا اس کی بسکہ طلبگار ہو گیا
گل باغ میں گلے کا مرے ہار ہو گیا

کس کو نہیں ہے شوق ترا پر نہ اس قدر
میں تو اسی خیال میں بیمار ہو گیا

میں نو دمیدہ بال چمن زاد طیر تھا
پر گھر سے اُٹھ چلا سو گرفتار ہو گیا

ٹھہرا گیا نہ ہو کے حریف اُس کی چشم کا
سینہ کو توڑ تیر نگہ پار ہو گیا

ہے اُس کی حرف زیر لبی کا سبھوں میں ذکر
کیا بات تھی کہ جس کا یہ بستار ہو گیا

تو وہ متاع ہے کہ پڑی جس کی تجھ پہ آنکھ
وہ جی کو بیچ کر بھی خریدار ہو گیا

کیا کہیے آہ عشق میں خوبی نصیب کی
دلدار اپنا تھا سو دل آزار ہو گیا

آٹھوں پہر لگا ہی پھرے ہے تمہارے ساتھ
کچھ ان دنوں میں غیر بہت یار ہو گیا

کب رو ہے اُس سے بات کے کرنے کا مجھ کو میر
ناکردہ جرم میں تو گنہگار ہو گیا

تیر جو اُس کمان سے نکلا
جگرِ مرغ جان سے نکلا

نکلی تھی تیغ بے دریغ اُسکی
میں ہی اک امتحان سے نکلا

گو کٹے سر کہ سوزِ دل جوں شمع — اب تو میری زبان سے نکلا
آگے اے نالہ ہے خدا کا ناؤں — بس تو نہ آسمان سے نکلا
چشم و دل سے جو نکلا ہجراں میں — نہ کبھو بحر و کان سے نکلا
مر گیا جو اسیرِ قیدِ حیات — تنگنائے جہان سے نکلا
دل سے مت جا کہ حیف اُس کا وقت — جو کوئی اس مکان سے نکلا
اُس کی شیریں لبی کی حسرت میں — شہد پانی ہو شان سے نکلا

نامُرادی کی رسم میر سے ہے
طور یہ اس جوان سے نکلا

گرمی سے میں تو آتشِ غم کی پگھل گیا — راتوں کو روتے روتے ہی جوں شمع گل گیا
ہم خستہ دل ہیں تجھ سے بھی نازک مزاج تر — تیوری چڑھائی تو نے کہ یاں جی نکل گیا
گرمیِ عشق مانع نشو و نما ہوئی — میں وہ نہال تھا کہ اُگا اور جل گیا
مستی میں چھوڑ دیر کو کعبہ چلا تھا میں — لغزش بڑی ہوئی تھی و لیکن سنبھل گیا
ساقی نشے میں تجھ سے لنڈھا شیشۂ شراب — چل اب کہ دخترِ تاک کا جوبن تو ڈھل گیا
ہر ذرہ خاک تیری گلی کی ہے بیقرار — یاں کونسا ستمزدہ ماٹی میں رل گیا

عریاں تنی کی شوخی سے دیوانگی میں میر
مجنوں کے دشتِ خار کا داماں بھی جل گیا

سُنا ہی حال ترے کشتگاں بچاروں کا — ہوا نہ گور گڑھا ان ستم کے ماروں کا
ہزار رنگ کھلے گُل چمن کے ہیں شاہد — کہ روزگار کے سر خون ہے ہزاروں کا
ملا ہے خاک میں کس کس طرح کا عالم یاں — نکل کے شہر سے ٹک سیر کر مزاروں کا
عرق فشانی سے اُس زلف کی ہراساں ہوں — بھلا نہیں ہے بہت ٹوٹنا بھی تاروں کا
علاج کرتے ہیں سودائے عشق کا میرے — خلل پذیر ہوا ہے دماغ یاروں کا
ترے[1] ہی زلف کو محشر میں ہم دکھا دیں گے — جو کوئی مانگے گا نامہ سیاہ کاروں کا
نگاہِ مست کے مارے ترے خراب ہیں شوخ — نہ ٹھور ہے نہ ٹھکانا ہے ہوشیاروں کا
کریں ہیں دعویٰ خوش چشمی آہوانِ دشت — ٹک ایک دیکھنے چل مُلکّاں گنواروں کا

لہ میر تقی سے جواب نامہ سیاہی کا اپنی ہو وہ زلف ۔ کسو نے حشر میں ہم سے اگر سوال کیا ۔ عہ شہد کا چھتہ

شہر میں کس مُنہ سے اوے سامنے تیرے کہ شوخ
چھائیوں سے بھر رہا ہے سارا چہرہ ماہ کا

سر فرو لاتی نہیں ہمت مری ہر اک کے پاس
ہوں گدائے آستاں میں میر حضرت شاہ کا

ایسی گلی اک شہر اسلام نہیں رکھتا
جس کوچے میں وہ بت صد بدنام نہیں رکھتا

آزار نہ دے اپنے کانوں کے تئیں اے گل
آغاز مرے غم کا انجام نہیں رکھتا

ناکامیٔ صد حسرت خوش لگتی نہیں ورنہ
اب جی سے گزر جانا کچھ کام نہیں رکھتا

ہو خشک تو بہتر ہے، وہ ہاتھ بہاراں میں
مانندِ نرگس جو جام نہیں رکھتا

بن اُس کے ہم آغوشی بیتاب نہیں اب ہی
مدت سے بغل میں دل آرام نہیں رکھتا

یں داڑھی تری واعظ مسجد ہی میں منڈواتا
پر کیا کروں ساتھ اپنے حجام نہیں رکھتا

وہ مفلس اُن آنکھوں سے کیونکر کے بسر آوے
جو اپنی گرہ میں اک بادام نہیں رکھتا

کیا بات کروں اُس سے مل جائے جو دہ میں تو
اس ناکسی سے روئے دشنام نہیں رکھتا

یوں تو رہ و رسم اُس کو اس شہر میں سب سے ہے
اک میر ہی سے خط و پیغام نہیں رکھتا

خوبی کا اس کی بسکہ طلبگار ہو گیا
گل باغ میں گلے کا مرے ہار ہو گیا

کس کو نہیں ہے شوق ترا پر نہ اس قدر
میں تو اسی خیال میں بیمار ہو گیا

میں نو دمیدہ بال چمن زاد طیر تھا
پر گھر سے اُٹھ چلا سو گرفتار ہو گیا

ٹھہرا گیا نہ ہو کے حریف اُس کی چشم کا
سینہ کو توڑ تیر نگہ پار ہو گیا

ہے اُس کی حرفِ زیرلبی کا سبھوں میں ذکر
کیا بات تھی کہ جس کا یہ بستار ہو گیا

تو وہ متاع ہے کہ پڑی جس کی تجھ پہ آنکھ
وہ جی کو بیچ کر بھی خریدار ہو گیا

کیا کہیے آہ عشق میں خوبی نصیب کی
دلدار اپنا تھا سو دل آزار ہو گیا

آٹھوں پہر لگا ہی پھرے ہے تمہارے ساتھ
کچھ ان دنوں میں غیر بہت یار ہو گیا

کب ربط ہے اُس سے بات کرنے کا مجھ کو میر
ناکردہ جرم میں تو گنہگار ہو گیا

تیر جو اُس کمان سے نکلا
جگرِ مرغ جان سے نکلا

نکلی تھی تیغ بے دریغ اُسکی
میں ہی اک امتحان سے نکلا

اے تاجِ شہ نہ سر کو فرو لاؤں تیرے پاس | ہے معتقد فقیر نمد کی کلاہ کا

بیمار تو نہ ہووے جئے جب تلک کہ میر
سونے نہ دے گا شور تری آہ آہ کا

دل سے شوقِ رخِ نکو نہ گیا | جھانکنا تاکنا کبھو نہ گیا
ہر قدم پر تھی اُس کی منزل لیک | سر سے سودائے جستجو نہ گیا
سب گئے ہوش و صبر و تاب و تواں | لیکن اے داغ دل سے تو نہ گیا
دل میں کتنے مسوّدے[1] تھے و لے | ایک پیش اُس کے رو برو نہ گیا
سبحہ گرداں ہی میر ہم تو رہے
دستِ کوتاہ تا سبو نہ گیا

گل و بلبل بہار میں دیکھا | ایک تجھ کو ہزار میں دیکھا
جل گیا دل سفید ہیں آنکھیں | یہ تو کچھ انتظار میں دیکھا
آبلے کا بھی ہونا دامنگیر | تیرے کوچے کے خار میں دیکھا
تیرہ عالم ہوا یہ روزِ سیاہ | اپنے دل کے غبار میں دیکھا
جن بلاؤں کو میر سنتے تھے
اُن کو اس روزگار میں دیکھا

کئی دن سلوک وداع کا مرے درپئے دلِ زار تھا
کبھو درد تھا، کبھو داغ تھا، کبھو زخم تھا، کبھو وار تھا
دمِ صبح بزمِ خوش جہاں شبِ غم سے کم نہ تھے مہرباں
کہ چراغ تھا سو تو دُود تھا، جو پتنگ تھا سو غبار تھا
دلِ خستہ جو لہو ہو گیا تو بھلا ہوا کہ کہاں تلک
کبھو سوزِ سینہ سے داغ تھا، کبھو درد و غم سے فگار تھا
دلِ مضطرب سے گزر گئی شبِ وصل اپنی ہی فکر میں
نہ دماغ تھا نہ فراغ تھا، نہ شکیب تھا نہ قرار تھا
جو نگاہ کی بھی پلک اُٹھا تو ہمارے دل سے لہو بہا
کہ وہیں وہ ناوکِ بے خطا، کسو کے کلیجے کے پار تھا

[1] مسوّدہ، یہاں بمعنی منصوبہ ہے۔

تڑپ کے مرنے سے دل کے کہ مغفرت ہو اُسے
جہاں میں کچھ تو رہا نام بیقراروں کا

تڑپ کے خرمنِ گل پر کبھی گرا اے بجلی
جلانا کیا ہے مرے آشیاں کے خاروں کا

تمھیں[1] تو زہد و ورع پر بہت ہی اپنے غرور
خدا ہے، شیخ جی، ہم بھی گنہگاروں کا

اُٹھے ہے گرد کی جا نالہ گور سے اُس کی
غبارِ میر بھی عاشق ہے نے سواروں کا

دل سمجھا نہ محبت کو کچھ اُن نے کیا یہ خیال کیا
خوں ہو بہ سب آپھی[2] گیا جو عشقِ حسن و جمال کیا

آنکھیں کفک سے اُس کی لگا کر خاک برابر ہم بھی ہوئے
مہندی کے رنگ اُن پاؤں نے تو بہتوں کو پامال کیا

یوں نکلے ہے فلک ادھر سے نازکناں جو جانے تو
خاک سے سبزہ میری اُگا کر اُن نے مجھکو نہال کیا

آگے جواب سے اُن لوگوں کے بارے معافی اپنی ہوئی
ہم بھی فقیر ہوئے تھے لیکن ہم نے ترک سوال کیا

حال نہیں ہے عشق سے مجھ میں کس سے میر اب حال کہوں
آپ ہی چاہ کر اُس ظالم کو یہ اپنا میں حال کیا

گزرا بنائے چرخ سے نالہ پگاہ کا
خانہ خراب ہوجیو اس دل کی چاہ کا

آنکھوں میں جی مرا ہے ادھر دیکھتا نہیں
مرتا ہوں میں تو ہائے رے صرفہ نگاہ کا

صد خانماں خراب ہیں ہر ہر قدم پہ دفن
کشتہ ہوں یار میں تو ترے گھر کی راہ کا

اک قطرہ خون ہو کے پلک سے ٹپک پڑا
قصہ یہ کچھ ہوا دلِ غفراں پناہ کا

تلوار مارنا تو تمھیں کھیل ہے دلے
جاتا رہے نہ جان کسو بیگناہ کا

بدنام و خوار و زار و نزار و شکستہ حال
احوال کچھ نہ پوچھیے اس روسیاہ کا

ظالم[3] زمیں سے لوٹتا دامن اُٹھا کے چل
ہوگا کمیں میں ہاتھ کسو دادخواہ کا

[1] مرزا داغ دہلوی سے صبر لے زاہدِ نافہم نہ میخواروں کا ؛ بخشنے والا بھی دیکھا ہے گنہگاروں کا

[2] آپھی کے بجائے اب نسخاً آپ ہی بولتے ہیں۔

[3] تذکرہ میر میں پہلا مصرع اس طرح ملتا ہے۔ ظالم زمیں سے لوٹتا دامن اُٹھا کے پہن مگر وہ صحیح نہیں ہے۔

اُس کا خرام دیکھ کے جایا نہ جائے گا
اے کبک پھر بحال بھی آیا نہ جائے گا

ہم کشتگانِ عشق ہیں ابرو و چشمِ یار
سر سے ہمارے تیغ کا سایا نہ جائے گا

ہم رہروانِ راہِ فنا ہیں برنگِ عمر
جاویں گے ایسے کھوج بھی پایا نہ جائے گا

پھوڑا سا ساری رات جو پکتا رہیگا دل
تو صبح تک تو ہاتھ لگایا نہ جائے گا

اپنے شہیدِ ناز سے بس ہاتھ اُٹھا کہ پھر
دیوانِ حشر میں اُسے لایا نہ جائے گا

اب دیکھ لے کہ سینہ بھی تازہ ہوا ہے چاک
پھر ہم سے اپنا حال دکھایا نہ جائے گا

ہم بیخودانِ محفلِ تصویر اب گئے
آئندہ ہم سے آپ میں آیا نہ جائے گا

گو بیستوں کو ٹال دے آگے سے کوہکن
سنگِ گرانِ عشق اُٹھایا نہ جائے گا

یاد اُس کی اتنی خوب نہیں میرؔ باز آ
نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا

ایسا ترا رہ گزر نہ ہوگا
ہر گام پہ جس میں سر نہ ہوگا

کیا اُن نے نشے میں مجھکو مارا
اتنا بھی تو بے خبر نہ ہوگا

دھوکا ہے تمام بحرِ دُنیا
دیکھے گا کہ ہونٹھ تر نہ ہوگا

آئی جو شکست آئینہ پر
روئے دلِ یار ادھر نہ ہوگا

دُشمنوں سے کسی کا اتنا ظالم
ٹکڑے ٹکڑے جگر نہ ہوگا

اب دل کے تئیں دیا تو سمجھا
محنت زدوں کے جگر نہ ہوگا

دُنیا کی نہ کر تو خواستگاری
اس سے کبھو بہرہ ور نہ ہوگا

آ خانہ خرابی اپنی مت کر
قحبہ ہے یہ اس سے گھر نہ ہوگا

ہو اس سے جہاں سیاہ تد بھی
نالے میں مرے اثر نہ ہوگا

پھر نوحہ گری کہاں جہاں میں
ماتم زدہ میرؔ اگر نہ ہوگا

غم اُس کو ساری رات سُنایا تو کیا ہوا
یا روز اُٹھ کے سر کو پھرایا تو کیا ہوا

اُن نے تو مجھ کو جھوٹے بھی پوچھا نہ ایکبار
میں نے اُسے ہزار جتایا تو کیا ہوا

خواہاں نہیں وہ کیوں ہی میں اپنی طرف سے یوں
دل دیکے اُس کے ہاتھ بکایا تو کیا ہوا

اب سعی کر سپہر کہ میرے موئے گئے
اُس کا مزاج مہر پہ آیا تو کیا ہوا

یہ تمھاری اندنوں دوستاں مژہ جس کے غم میں ہے خونچکاں
وہی آفتِ دلِ عاشقاں کسو وقت ہم سے بھی یار تھا

نہیں تازہ دل کی شکستگی یہی درد تھا یہی خستگی
اُسے جب سے ذوقِ شکار تھا اسے زخم سے سروکار تھا

کبھو جائے گی جو اُدھر صبا۔ تو یہ کہیو اُس سے کہ بے وفا
مگر ایک میرؔ شکستہ پا ترے باغِ تازہ میں خار تھا

مہر کی تجھ سے توقع تھی ستمگر نکلا
موم سمجھے تھے ترے دل کو سو پتھر نکلا

داغ ہوں رشکِ محبت سے کہ اتنا بیتاب
کس کی تسکیں کے لئے گھر سے تو باہر نکلا

جیتے جی آہ ترے کوچے سے کوئی نہ پھرا
جو ستم دیدہ رہا جا کے سو مر کر نکلا

دل کی آبادی کی اس حد ہے خرابی کہ نہ پوچھ
جانا جاتا ہے کہ اس راہ سے لشکر نکلا

قطعہ
اشکِ تر، قطرۂ خوں، لختِ جگر، پارۂ دل
ایک سے ایک عدو آنکھ سے بہ کر نکلا

کنج کاوی جو کی سینے کی غمِ ہجراں نے (نسخہ: گنج)
اس دفینے میں سے اقسامِ جواہر نکلا

ہم[۱] نے جانا تھا لکھے گا تو کوئی حرف اے میرؔ
پر ترا نامہ تو اک شوق کا دفتر نکلا

رہے خیال تنک ہم بھی رو سیاہوں کا
لگے ہو خون بہت کرنے بیگناہوں کا

نہیں ستارے یہ سوراخ پڑ گئے ہیں تمام
فلک حریف ہوا تھا ہماری آہوں کا

گلی میں اُس کی پھٹے کپڑوں پر مرے مت جا
لباس فقر ہے واں فخر بادشاہوں کا

تمام زلف کے کوچے ہیں مار پیچ اُس کے
تجھی کو آوے دلا چلنا ایسی راہوں کا

اسی جو خوبی سے لائے تجھے قیامت میں
تو حرفِ کن نے کیا گوش دادخواہوں کا

تمام عمر رہیں خاکِ زیرِ پا اُس کے
جو زور کچھ چلے ہم عجز دستگاہوں کا

کہاں سے تہ کریں پیدا یہ ناظمانِ حال
کہ پوچ بافی ہی ہے کام اُن جلاہوں کا

حساب کاہے کا روزِ شمار میں مجھ سے
شمار ہی نہیں ہے کچھ مرے گناہوں کا

تری جو آنکھیں ہیں تلوار کے تلے بھی اِدھر
فریب خوردہ ہے تو میرؔ کن نگاہوں کا

[۱] اسی اندازِ بیان کا ایک شعر مصحفی کا ہے "مصحفی ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ہوگا کوئی زخم ؛ تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا"۔۱۲

ہے قاعدۂ کلی یہ کوئے محبت میں — دل گم جو ہوا ہوگا پیدا نہ ہوا ہوگا

اس کہنہ خرابے میں آبادی نہ کر منعم — اک شہر نہیں یاں جو صحرا نہ ہوا ہوگا

آنکھوں سے تری ہم کو ہے چشم کہ اب ہووے — جو فتنہ کہ دنیا میں برپا نہ ہوا ہوگا

جز مرتبۂ کل کو حاصل کرے ہے آخر — اک قطرہ نہ دیکھا جو دریا نہ ہوا ہوگا

صد نشتر مژگاں کے لگنے سے نہ نکلا خوں
آگے تجھے میرؔ ایسا سودا نہ ہوا ہوگا

عالم میں کوئی دل کا طلب گار نہ پایا — اس جنس کا یاں ہم نے خریدار نہ پایا

حق ڈھونڈھنے کا آپ کو آتا نہیں ورنہ — عالم ہے سبھی یار کہاں یار نہ پایا

غیروں ہی کے ہاتھوں میں ہے دستِ نگاریں — کب ہم نے ترے ہاتھ سے آزار نہ پایا

جاتی ہے نظر خس پہ گہِ چشم پریدن — یاں ہم نے پرِ کاہ بھی بیکار نہ پایا

تصویر کے مانند لگے در ہی سے گزری — مجلس میں تری ہم نے کبھو بار نہ پایا

سوراخ ہے سینے میں ہر اک شخص کے تجھ سے — کس دل کے ترا تیرِ نگہ پار نہ پایا

مربوط ہیں تجھ سے بھی یہی ناکس و نا اہل — اس باغ میں ہم نے گلِ بیخار نہ پایا

دم بعد جنوں مجھ میں نہ محسوس تھا یعنی — جامہ میں مرے یاروں نے اک تار نہ پایا

آئینہ بھی حیرت سے محبت کی ہوئے ہم — پر سیر ہو اس شخص کا دیدار نہ پایا

وہ کھینچ کے شمشیرِ ستم رہ گیا جو میرؔ
خوں ریزی کا یاں کوئی سزاوار نہ پایا

کیا مرے آنے پہ تو اے بتِ مغرور گیا — کبھی اس راہ سے نکلا تو تجھے گھور گیا

لے گیا صبح کے نزدیک مجھے خواب اے وائے — آنکھ اس وقت کھلی قافلہ جب دور گیا

گور سے نالے نہیں اٹھتے تو نئے اگتی ہے — جی گیا پر نہ ہمارا سرِ پر شور گیا

چشمِ خوں بستہ سے کل رات لہو پھر ٹپکا — ہم نے جانا تھا کہ بس اب تو یہ ناسور گیا

ناتواں ہم ہیں کہ ہیں خاک گلی کی اس کے — اب تو بے طاقتی سے دل کا بھی مقدور گیا

لے کہیں منھ پہ نقاب اپنے کہ اے غیرتِ صبح — شمع کے چہرۂ رخشاں سے تو اب نور گیا

نالۂ میرؔ نہیں رات سے سنتے ہم لوگ
کیا ترے کوچہ سے اے شوخ وہ رنجور گیا

مت رنجہ کر کسی کو کہ اپنے تو اعتقاد
دل[1] ڈھائے کر جو کعبہ بنایا تو کیا ہوا
میں صیدِ ناتواں بھی تجھے کیا کرونگا یاد
ظالم اک اور تیر لگایا تو کیا ہوا
کیا کیا دعائیں مانگی ہیں خلوت میں شیخ یوں
ظاہر جہاں سے ہاتھ اٹھایا تو کیا ہوا
وہ فکر کر کہ چاک جگر پاوے التیام
ناصح جو تو نے جامہ سلایا تو کیا ہوا
جیتے تو میر اُن نے مجھے داغ ہی رکھا
پھر گور پر چراغ جلایا تو کیا ہوا

گرچہ سردار مزوں کا ہے امیری کا مزا
چھوڑ لذت کے تئیں لے تو فقیری کا مزا
اے کہ آزاد ہے ٹک چکھ نمک مرغ کباب
تا تو جانے کہ یہ ہوتا ہے اسیری کا مزا
ہم تو گمراہ جوانی کے مزوں پر ہیں میر
حضرتِ خضر کو ارزانی ہو پیری کا مزا

دل جو تھا اک آبلہ پھوٹا گیا
رات کو سینہ بہت کوٹا گیا
طائر رنگ حنا کی سی طرح
دل نہ اُس کے ہاتھ سے چھوٹا گیا
میں نہ کہتا تھا کہ منہ کر دل کی اور
اب کہاں وہ آئینہ ٹوٹا گیا
دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے
یہ نگر سَو مرتبہ لوٹا گیا
میر کس کو اب دماغ گفتگو
عمر گزری ریختہ چھوٹا گیا

یاد ایام کہ یہاں ترکِ شکیبائی تھا
ہر گلی شہر کی یہاں کوچۂ رسوائی تھا
اتنی گزری جو ترے ہجر میں سو اسکے سبب
صبر مرحوم عجب مونسِ تنہائی تھا
تیرے جلوہ کا مگر رو تھا سحر گلشن میں
نرگس اک دیدۂ حیران تماشائی تھا
یہی زلفوں کی تری بات تھی یا کاکل کی
میر کو خوب کیا سیر تو سودائی تھا

اے دوست کوئی مجھ سا رسوا نہ ہوا ہوگا
دشمن کے بھی دشمن پر ایسا نہ ہوا ہوگا
اب اشکِ حنائی سے جو تر نکرے مژگاں
وہ تجھ کفِ رنگیں کا مارا نہ ہوا ہوگا
ٹک گورِ غریباں کی کر سیر کہ دُنیا میں
ان ظلم رسیدوں پر کیا کیا نہ ہوا ہوگا

[1] دل بدست آور کہ حج اکبر است ؛ از ہزاران کعبہ یکدل بہتر است ۔ کعبہ بنگاہ خلیل آزر است ؛ دل گزرگاہِ جلیلِ اکبر است ۱۲

وے[1] دن گئے کہ آنکھیں دریا سی بہتیاں تھیں ۔۔۔ سوکھا پڑا ہے اب تو مدت سے یہ دوآبا

منہ دھوتے وقت اُس کے اکثر دکھائی دے ہے ۔۔۔ خورشید لے رہا ہے اک روز آفتابا

اب شہر ہر طرف سے میدان ہو گیا ہے ۔۔۔ پھیلا تھا اس طرح کا کاہیکو یاں خرابا

دل تفتگی کی اپنی ہجراں میں شرح کیا دوں ۔۔۔ چھاتی تو میر میری جل کر ہوئی ہے تابا

دکھ اب فراق کا ہم سے سہا نہیں جاتا ۔۔۔ پھر اس پہ ظلم یہ ہے کچھ کہا نہیں جاتا

ہوئی ہے اتنی تری عکسِ زلف کی حیراں ۔۔۔ کہ موجِ بحر سے مطلق بہا نہیں جاتا

نہیں گزرتی گھڑی کوئی مجھ خراب پر آہ ۔۔۔ کہ جس میں غم سے ترے جی ڈہا نہیں جاتا

ستم کچھ آج گلی میں تری نہیں مجھ پر ۔۔۔ کب آ کے خون میں یاں میں نہا نہیں جاتا

خراب مجھ کو کیا اضطرابِ دل نے میر ۔۔۔ کہ ٹک بھی اس کنے اُس بن رہا نہیں جاتا

سمجھے تھے میر ہم کہ یہ ناسور کم ہوا ۔۔۔ پھر ان دنوں میں دیدۂ خونبار نم ہوا

آئے برنگِ ابرِ عرق ناک تم ادھر ۔۔۔ حیران ہوں کہ آج کدھر کو کرم ہوا

تجھ بن شراب پی کے ہوئے سب ترے خراب ۔۔۔ ساقی بغیر تیرے انھیں جام سم ہوا

کافر ہمارے دل کی نہ پوچھ اپنے عشق میں ۔۔۔ بیت الحرام تھا سو وہ بیت الصنم ہوا

قطعہ

خانہ خراب کس کا کیا تیری چشم نے ۔۔۔ تھا کون یوں جسے تو نصیب ایک دم ہوا

تلوار کس کے خون میں سر ڈوب ہے تری ۔۔۔ یہ کس اجل رسیدہ کے گھر پر ستم ہوا

قطعہ

آئی نظر جو گورِ سلیماںؑ کی ایک روز ۔۔۔ کوچے پر اُس مزار کے تھا یہ رقم ہوا

کاے سرکشاں جہاں میں کھینچا تھا میں تو سر ۔۔۔ پایانِ کار مور کے خاک قدم ہوا

---

[1] بقاء اللہ بقا اکبرآبادی کا دوآبے کے متعلق یہ شعر ہے ؎ سیلاب سے آنکھوں کے رہتے ہیں خرابے میں ٭ ٹکڑے جو مرے دل کے بستے ہیں دوآبے میں ٭ بقا کا خیال تھا کہ اسی شعر سے دوآبے کا لفظ لیکر میر نے یہ شعر کہا ہے ؎ وے دن گئے کہ آنکھیں دریا سی بہتیاں تھیں ٭ سوکھا الخ چنانچہ اسی بنا پر انھوں نے یہ قطعہ کہا ؎ میر نے گر ترا مضمون دوآبے کا لیا ٭ اے بقا تو بھی دعا دے جو دعا دینی ہو ٭ یا خدا میر کی آنکھوں کو دوآبہ کر دے ٭ دہنی کا یہ عالم ہو کہ ترمینی ہو ۔ میر و سودا سے بقا کی برابر نوک جھونک ہوا کرتی تھی چنانچہ ایک اور موقع پر کہا ہے ؎ پگڑی اپنی سنبھالئے گا میر ٭ اور بستی نہیں یہ دلی ہے ٭ ایک اور موقع پر کہا ہے ؎ میر و مرزا کی شعر خوانی نے ٭ بسکہ عالم میں دھوم ڈالی تھی ٭ کھول دیوان دونوں صاحب کے ٭ اے بقا ہم نے جب زیارت کی ٭ کچھ نہ پایا سوائے اس کے سخن ٭ ایک تو تو کہے ہے اک ہی ہی مستفاد از گل رعنا

خواہ مجھ سے لڑ گیا اب خواہ مجھ سے مل گیا
کیا کہوں اے ہمنشیں میں تجھ سے حاصل دل گیا

اپنے ہی دل کو نہ ہو وا شد تو کیا حاصل نسیم
گو چمن میں غنچۂ پژ مُردہ تجھ سے کھل گیا

دل سے آنکھوں میں لہو آتا ہے شاید رات کو
کشمکش میں بیقراری کی یہ پھوڑا اچھل گیا

قیس کا کیا کیا گیا اُودھر دل و دیں، ہوش و صبر
جس طرف صحرا سے لیلیٰ کا چلا محمل گیا

رشک کی جا گہ ہے مرگ اُس کشتۂ حسرت کی میر
نعش کے ہمراہ جس کی گور تک قاتل گیا

تا بمقدور انتظار کیا
دل نے اب زور بے قرار کیا

دُشمنی ہم سے کی زمانے نے
کہ جفا کار تجھ سا یار کیا

یہ توہم کا کارخانہ ہے
یھاں وہی ہے جو اعتبار کیا

ایک ناوک نے اُس کی مژگاں کے
طائر سدرہ تک شکار کیا

صد رگِ جاں کو تاب دے باہم
تیری زلفوں کا ایک تار کیا

ہم فقیروں سے بے ادائی کیا
آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا

سخت کافر تھا جن نے پہلے میر
مذہبِ عشق اختیار کیا

شب تھا نالاں عزیز کوئی تھا
مرغِ خوش خواں عزیز کوئی تھا

تھی تمھارے ستم کی تاب اُس تک
صبر جو یاں عزیز کوئی تھا

شب کو اُس کا خیال تھا دل میں
گھر میں مہماں عزیز کوئی تھا

چاہ بیجا نہ تھی زلیخا کی
ماہِ کنعاں عزیز کوئی تھا

اب تو اُس کی گلی میں خوار ہے ایک
میر بیجاں عزیز کوئی تھا

چھوٹا کئے پیالے لنڈھتا پھرا قرابا
مستی میں میری تھا یاں اک شور اور شرابا

حکمت ہی کچھ جو گردوں یکساں پھرا کرے ہی
چلتا نہیں دگرنہ شام و سحر عرابا

باہم ہوا کریں ہیں دن رات نیچے اوپر
یہ نرم شانے لونڈے ہیں مخمل و خوابا

ان صحبتوں میں آخر جانیں ہی جاتیاں ہیں
نے عشق کو ہے صرفہ نے حسن کو محابا

ہر چند ناتواں ہیں پر آگیا جو جی میں
دیں گے ملا زمیں سے تیرا فلک قلابا

جیتے جی کوچۂ دلدار سے جایا نہ گیا | اُس کی دیوار کا سر سے مرے سایا نہ گیا
کاو کاوِ مژۂ یار و دلِ زار و نزار | گتھ گئے ایسے شتابی کہ چھڑایا نہ گیا
وہ تو کل دیر تلک دیکھتا ایدھر کو رہا | ہم سے ہی حالِ تباہ اپنا دکھایا نہ گیا
گرم رو راہِ فنا کا نہیں ہو سکتا پتنگ | اس سے تو شمع نمط سر بھی کٹایا نہ گیا
پاسِ ناموسِ محبت تھا کہ فرہاد کے پاس | بیستوں سامنے سے اپنے اٹھایا نہ گیا
خاک تک کوچۂ دلدار کی چھانی ہم نے | جستجو کی پہ دلِ گم شدہ پایا نہ گیا
آتشِ تیز جدائی میں یکایک اُس بن | دل جلا یوں کہ تنک جی بھی جلایا نہ گیا
مہ نے آ سامنے شب یاد دلایا تھا اُسے | پھر وہ تا صبح مرے جی سے بھلایا نہ گیا

زیرِ شمشیرِ ستم میرؔ تڑپنا کیسا!
سر بھی تسلیمِ محبت میں ہلایا نہ گیا

جی میں آتا ہے کہ کچھ اور بھی موزوں کیجے | دردِ دل ایک غزل میں تو سنایا نہ گیا

دل کے تئیں آتشِ ہجراں سے بچایا نہ گیا | گھر جلا سامنے پر ہم سے بجھایا نہ گیا
دل میں رہ دل میں کہ معمارِ قضا سے اب تک | ایسا مطبوع مکاں کوئی بنایا نہ گیا
کبھو عاشق کے ترے جبہے سے ناخن کا خراش | خطِ تقدیر کے مانند مٹایا نہ گیا
کیا تنک حوصلہ تھی دیدۂ دل اپنی آہ | ایک دم راز محبت کا چھپایا نہ گیا
دل جو دیدار کا قاتل کے بہت بھوکا تھا | اُس ستم کشتہ سے اک زخم بھی کھایا نہ گیا
میں تو تھا صیدِ زبوں صیدگہِ عشق کے بیچ | آپ کو خاک میں بھی خوب ملایا نہ گیا

شہرِ دل آہ عجب جائے تھی پر اس کے گئے (نـ آپ سے)
ایسا اجڑا کہ کسی طرح بسایا نہ گیا

آج رہتی نہیں خامے کی زباں رکھیے معاف | حرف کا طول بھی جو مجھ سے گھٹایا نہ گیا

گل میں اُس کی سی جو بو آئی تو آیا نہ گیا | ہم کو بن دوشِ ہوا باغ سے لایا نہ گیا
آہ جو نکلی مرے منہ سے تو افلاک کے پاس | اُس کے آشوب کے عہدے سے بر آیا نہ گیا
گل نے ہر چند کہا باغ میں رہ پر اُس بن | جی جو اُچٹا تو کسو طرح لگایا نہ گیا

افسوس کی بھی چشم تھی اُن سے خلافِ عقل (قطعہ)
بارِ علاقہ سے تو عبث پشت خم ہوا

اہلِ جہاں ہیں سارے ترے جیتے جی تلک
پوچھیں گے بھی نہ بات جہاں تو عدم ہوا

کیا کیا عزیز دوست ملے میر خاک میں
نادان یہاں کسو کا کسو کو بھی غم ہوا

دل و دماغ ہے اب کس کو زندگانی کا
جو کوئی دم ہے تو افسوس ہے جوانی کا

اگرچہ عمر کے دس دن یہ لب رہے خاموش
سخن رہیگا سدا میری کم زبانی کا

سبک ہو آوے جو مندیل رکھ نماز کو شیخ
رہا ہے کون سا اب وقت سرگرانی کا

ہزار جان سے قربان بے پری کے ہیں
خیال بھی کبھو گزرا نہ پرفشانی کا

پھرے ہی کھینچے ہی تلوار مجھ پہ ہر دم تو
کہ صید ہوں میں تری دشمنی جانی کا

نمود کرکے وہیں بحرِ غم میں بیٹھ گیا
کہے تو میر بھی اک بلبلا تھا پانی کا

[illegible]

موا میں سجدہ میں پر نقش میرا یار رہا
اُس آستاں پہ مری خاک سے غبار رہا

جنوں میں ابکی مجھے اپنے دل کا غم ہے حیف
خبر لی جبکہ نہ جامے میں ایک تار رہا

بشر ہے وہ پہ کھلا جب سے اُس کا دامِ زلف
سرِ رہ اُس کی فرشتے ہی کا شکار رہا

کبھو نہ آنکھوں میں آیا وہ شوخ خواب کی طرح
تمام عمر ہمیں اُس کا انتظار رہا

شرابِ عیش میسر ہوئی جسے اک شب
پھر اُس کو روزِ قیامت تلک خمار رہا

بتاں کے عشق نے بے اختیار کر ڈالا (قطعہ)
وہ دل کہ جس کا خدائی میں اختیار رہا

وہ دل کہ شام و سحر جیسے پکا پھوڑا تھا
وہ دل کہ جس سے ہمیشہ جگر فگار رہا

تمام عمر گئی اُس پہ ہاتھ رکھتے ہمیں
وہ دردناک علی الرغم بیقرار رہا

ستم میں غم میں سرانجام اُس کا کیا کہیے
ہزاروں حسرتیں تھیں تسپہ جی کو مار رہا

بہا تو خون ہو آنکھوں کی راہ بہ نکلا
رہا جو سینۂ سوزاں میں داغدار رہا

سو اُس کو ہم سے فراموش کاریوں لیگئے[۱]
کہ اُس سے قطرۂ خوں بھی نہ یادگار رہا

گلی میں اُس کی گیا، سو گیا، نہ بولا پھر
میں میر میر کر اُس کو بہت پکار رہا

[۱] لے گئے کا استعمال بروزن فعلن اب متروک ہے۔

سحر گہ عید میں دورِ سبو تھا
پر اپنے جام میں تجھ بن لہو تھا

غلط تھا آپ سے غافل گزرنا
نہ سمجھے ہم کہ اس قالب میں تو تھا

چمن کی وضع نے ہم کو کیا داغ
کہ ہر غنچہ دلِ پُر آرزو تھا

گل و آئینہ کیا خورشید و مہ کیا
جدھر دیکھا تدھر تیرا ہی رو تھا

کروگے یاد باتیں تو کہوگے
کہ کوئی رفتۂ بسیار گو تھا

جہاں پُر ہے فسانے سے ہمارے
دماغِ عشق ہم کو بھی کبھو تھا

مگر دیوانہ تھا گل بھی کسو کا
کہ پیراہن میں سو جاگہ رفو تھا

کہیں کیا بال تیرے کھل گئے تھے
کہ جھونکا باؤ کا کچھ مشک بو تھا

نہ دیکھا میر آوارہ کو لیکن
غبار اک ناتواں سا کو بکو تھا

راہ[۱] دورِ عشق سے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا

قافلے میں صبح کے اک شور ہے
یعنی غافل ہم چلے سوتا ہے کیا

سبز ہوتی ہی نہیں یہ سرزمیں
تخمِ خواہش دل میں تو بوتا ہے کیا

یہ نشانِ عشق ہیں جاتے نہیں
داغ چھاتی کے عبث دھوتا ہے کیا

غیرتِ یوسف ہے یہ وقتِ عزیز
میر اس کو رائیگاں کھوتا ہے کیا

رونا ٹک اک تھمبا تو غمِ بیکراں سہا
دس دن رہے جہان میں ہم سو دہا دہا

پہلو میں اک گرہ سی تہِ خاک ساتھ ہے
شاید کہ مر گئے پہ بھی خاطر میں کچھ رہا

آنکھوں نے رازداری محبت کی خوب کی
آنسو جو آتے آتے رہے تو لہو بہا

آئے تھے اک امید پہ تیری گلی میں ہم
سو آہ اس طرح چلے لوہو میں ہم نہا

کس کس طرح سے میر نے کاٹا ہے عمر کو
اب آخر آخر آن کے یہ ریختہ کہا

یکسانہ جی گرفتاری سے شیون میں رہا
ایک دل غمخوار رکھتے تھے سو گلشن میں رہا

پنجۂ گل کی طرح دیوانگی میں ہاتھ کو
گر نکالا میں گریباں سے تو دامن میں رہا

---

۱ یہ شعر اس طرح بھی مشہور ہے — ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا الخ مگر صحیح اسی طرح ہے جیسا کہ نقل ہوا۔

سرنشین رہِ میخانہ ہوں میں کیا جانوں
رسمِ مسجد کے تئیں شیخ کہ آیا نہ گیا

حیف ہے وہ جنگی وہ اس وقت میں پہنچا جس وقت
اُن کنے حال اشاروں سے بتایا نہ گیا

خطرِ راہِ محبت کہیں جوں حرف مٹے
جس سے اُس طرف کو قاصد بھی چلایا[1] نہ گیا

خوفِ آشوب سے غوغائے قیامت کیلئے
خونِ خوابیدۂ عشاق جگایا نہ گیا

میر مت عذر گریباں کے پھٹے رہنے کا کر
زخمِ دل چاکِ جگر تھا کہ سِلایا نہ گیا

ادھر آکر شکار افگن ہمارا
مشبک کر گیا ہے تن ہمارا

گریباں سے رہا کوتہ تو پھر ہے
ہمارے ہاتھ میں دامن ہمارا

گئے جوں شمع اس مجلس میں جلتے
سبھوں پر حال ہے روشن ہمارا

بلا جس چشم کو کہتے ہیں مردم
وہ ہے عین بلا مسکن ہمارا

ہوا رونے سے رازِ دوستی فاش
ہمارا گریہ تھا دشمن ہمارا

بہت چاہا تھا ابرِ تر نے لیکن
نہ منت کش ہوا گلشن ہمارا

چمن میں ہم بھی زنجیری رہے ہیں
سنا ہوگا کبھو شیون ہمارا

کیا تھا ریختہ پردہ سخن کا
سو ٹھہرا ہے یہی اب فن ہمارا

نہ بہکے میکدے میں میر کیونکر
گرو ستو جا ہے پیراہن ہمارا

گلیوں میں اب تلک تو مذکور ہے ہمارا
افسانۂ محبت مشہور ہے ہمارا

مقصود کو تو دیکھیں کب تک پہنچتے ہیں ہم
بالفعل اب ارادہ تا گور ہے ہمارا

کیا آرزو تھی جس سے سب چشم ہو گئے ہیں
ہر زخم تن جگہ سے ناسور ہے ہمارا

تیں آہ عشق بازی چوپڑ عجب بچھائی
کچی پڑیں ہیں نردیں گھر دور ہے ہمارا

تا چند پشت پا پر شرم و حیا سے آنکھیں
احوال کچھ بھی تم کو منظور ہے ہمارا

بے طاقتی کریں تو تم بھی معاف رکھیو
کیا کیجے کہ دل بھی مجبور ہے ہمارا

ہیں مشتِ خاک لیکن جو کچھ ہیں میر ہم ہیں
مقدور سے زیادہ مقدور ہے ہمارا

[1] چلایا نہ گیا، بجائے بھیجا نہ گیا۔ فی زمانا متروک ہے۔

ہاتھ سے تیرے اگر میں ناتواں مارا گیا — سب کہیں گے یہ کہ کیا اک نیم جاں مارا گیا
یک نگہ سے بیش کچھ نقصاں نہ آیا اُسکے تئیں — اور میں بیچارہ تو اسے مہرباں مارا گیا
وصل و ہجراں سی جو دو منزل ہیں راہِ عشق کی — دل غریب ان میں خدا جانے کہاں مارا گیا
دل نے سر کھینچا دیارِ عشق میں ای بوالہوس — وہ سراپا آرزو آخر جواں مارا گیا
کب نیازِ عشق نازِ حسن سے کھینچے ہی ہاتھ
آخر آخر میر سر بر آستاں مارا گیا

محبت کا جب زور بازار ہوگا — بکیں گے سر اور کم خریدار ہوگا
نہ خالی رہے گی مری جاگہ گر میں — نہوں گا تو اندوہ بسیار ہوگا
یہ منصور کا خون ناحق کہ حق تھا — قیامت کو کس کس سے خوندار ہوگا
عجب شیخ جی کی ہی شکل و شمائل — ملے گا تو صورت سے بیزار ہوگا
کھنچے عہدِ خط میں بھی دل تیری جانب — کبھو تو قیامت طرحدار ہوگا
زمیں گیر ہو عجز سے تو کہ اک دن — یہ دیوار کا سایہ دیوار ہوگا
نہ پوچھ اپنی مجلس میں ہی میر بھی یاں
جو ہوگا تو جیسے گنہگار ہوگا

اشک آنکھوں میں کب نہیں آتا — لہو آتا ہے جب نہیں آتا
ہوش جاتا نہیں رہا لیکن — جب وہ آتا ہی تب نہیں آتا
صبر تھا ایک مونسِ ہجراں — سو وہ مدت سے اب نہیں آتا
دل سے رخصت ہوئی کوئی خواہش — گریہ کچھ بے سبب نہیں آتا
عشق کو حوصلہ ہی شرط ار نہ — قطعہ — بات کا کس کو ڈھب نہیں آتا
جی میں کیا کیا ہی اپنے ای ہمدم — پر سخن تا بلب نہیں آتا
دور بیٹھا غبارِ میر اس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

کب تک تو امتحاں میں مجھ سے جدا رہے گا — جیتا ہوں تو تجھی میں یہ دل لگا رہے گا
یہاں ہجر اور ہم میں بگڑی ہی کب کی صحبت — زخمِ دل و نمک میں کب تک مزا رہے گا
تو برسوں میں ملے ہی یہاں فکر یہ رہے ہے — جی جائے گا ہمارا اک دم کو یا رہے گا

شمع ساں جلتے رہے لیکن نہ توڑا یار سے / رشتۂ الفت تمامی عمر گردن میں رہا

ڈر سے اُس شمشیر زن کے جوہر آئینہ ساں / سر سے لیکر پاؤں تک میں غرقِ آہن میں رہا

ہم نہ کہتے تھے کہ مت دَیر و حرم کی راہ چل / اب یہ دعویٰ حشر تک شیخ و برہمن میں رہا

در پئے دل ہی رہے اس چہرہ کے خالِ سیاہ / ڈر ہمیں ان چوٹوں کا روزِ روشن میں رہا

آہ کس انداز سے گزرا بیاباں سے کہ میر
جی ہر اک نخچیر کا اُس صید افگن میں رہا

غمزے نے اُس کے چوری میں دل کی ہنر کیا / اُس خانماں خراب نے آنکھوں میں گھر کیا

رنگ اڑ چلا چمن میں گلوں کا تو کیا نسیم / ہم کو تو روزگار نے بے بال و پر کیا

نافع جو تھیں مزاج کو اوّل سو عشق میں / آخر انھیں دواؤں نے ہم کو ضرر کیا

کیا جانوں بزمِ عیش کہ ساقی کی چشم دیکھ / میں صحبتِ شراب سے آگے سفر کیا

جس دم کہ تیغِ عشق کھنچی بوالہوس کہاں / سُن لیجیو کہ ہم ہی نے سینہ سپر کیا

دل زخمی ہو کے تجھ تئیں پہنچا تو کم نہیں / اس نیم کشتہ نے بھی قیامت جگر کیا

ہے کون آپ میں جو ملے تجھ سے مستِ ناز / ذوقِ خبر ہی نے تو ہمیں بے خبر کیا

وہ دشتِ خوفناک رہا ہے مرا وطن / سُن کر جسے خضر نے سفر سے حذر کیا

کچھ کم نہیں ہیں شعبدہ بازوں سے میگسار / دارو پلا کے شیخ کو آدم سے خر کیا

ہیں چاروں طرف خیمے کھڑے گردباد کے / کیا جانیے جنوں نے ارادہ کدھر کیا

لکنت تری زبان کی ہے سحر جس سے شوخ / اک حرف نیم گفتہ نے دل پر اثر کیا

بے شرم محض ہے وہ گنہگار جن نے میر
ابرِ کرم کے سامنے داماں تر کیا

تا کسی سے پاس میرے یار کا آنا گیا / بس گیا میں جان سے اب اُس سے یہ جانا گیا

کچھ نہ دیکھا پھر بجز اک شعلۂ پُر پیچ و تاب / شمع تک ہم نے تو دیکھا تھا کہ پروانا گیا

ایک ہی چشمک تھی فرصتِ صحبتِ احباب کی / دیدۂ تر ساتھ لے مجلس سے پیمانا گیا

گل کھلے صد رنگ تو کیا بے پری سے اے نسیم / مدتیں گزریں کہ وہ گلزار کا جانا گیا

دور تجھ سے میر نے ایسا تعب کھینچا کہ شوخ
کل جو میں دیکھا اُسے مطلق نہ پہچانا گیا

نقاش دیکھ تو میں کیا نقشِ یار کھینچا
اُس شوخ کم نما کا نت انتظار کھینچا

رسمِ قلمروِ عشق مت پوچھ کچھ کہ ناحق
ایکوں کی کھال کھینچی ایکوں کو دار کھینچا

تھا بد شرابِ ساقی کتنا کہ رات مجھ سے
میں نے جو ہاتھ کھینچا اُن نے کٹار کھینچا

مستی میں شکل ساری نقاش سے کھنچی پر
آنکھوں کو دیکھ اُس کی آخر خمار کھینچا

جی کھنچ رہے ہیں اودھر عالم کا ہوگا بلوا
گر شانے تو نے اُس کی زلفوں کا تار کھینچا

تھے شب کسے کسائے تیغ کشیدہ کف میں
پر میں نے بھی بغل میں بے اختیار کھینچا

پھرتا ہے میر تو جو پھاڑے ہوئے گریباں
کس کس ستم زدے نے دامانِ یار کھینچا

یہ حسرت ہے مروں اس میں لیے لبریز پیمانا
مہکتا ہو نپٹ جو پھول سی دارو سے میخانا

نہ دے زنجیر کے غل ہیں نہ دے جرگے غزالوں کے
مرے دیوان پن تک ہی رہا معمور ویرانا

مرا سر نزع میں زانو پہ رکھ کر یوں لگا کہنے
کہ اے بیمار میرے تجھ پہ جلد آساں ہو مرجانا

نہو کیوں ریختہ بے شورشِ کیفیت و معنی
گیا ہو میر دیوانہ رہا سودا[۱] سو مستانا

بارہا گورِ دل جھنکا لایا
اب کے شرطِ وفا بجا لایا

قدر رکھتی نہ تھی متاعِ دل
سارے عالم میں میں دکھا لایا

دل کہ اک قطرہ خوں نہیں ہے بیش
ایک عالم کے سر بلا لایا

[۱] سودا۔ یعنی مرزا رفیع المتخلص بہ سودا، جو میر صاحب کے مشہور معاصر۔ شاہ حاتم کے شاگرد۔ اور دلی کے قدیم باشندے تھے، ایک ضخیم کلیات جس میں سب قسم کا کلام موجود ہے اور جو اب مطبع ہذا میں نہایت اہتمام سے بترتیب جدید چھاپا گیا ہے اُن سے یادگار ہے۔ میر صاحب اُن کو بڑا زبردست شاعر مانتے ہیں چنانچہ نکات الشعراء میں ان کے متعلق یہ رائے لکھی ہے

"جوانیست خوش خلق و خوش خوئے گرم جوش، یار باش شگفتہ رو، مولد او شاہجہان آباد است، نوکر پیشہ و غزل و قصیدہ و مثنوی و قطعہ و مخمس و رباعی ہمہ را خوب می گوید۔ سرآمد شعرائے ہندی اوست۔ بسیار خوش گو است۔ ہر شعرش دامن لطف رستہ رستہ۔ در چمن بندی الفاظش گل معنی دستہ دستہ۔ ہر مصرع برجستہ اش سرو آزادہ بندہ پیش فکر عالیش طبع عالی شرمندہ شاعر ریختہ چنانچہ ملک الشعرائی ریختہ او را شاید"

مرزا سودا دہلی کی طوائف الملوکی کے زمانہ میں لکھنؤ چلے آئے اور یہاں کے حکمرانوں کے درباری شعرا میں منسلک ہے اور پھر عمر بھر لکھنؤ سے نہ نکلے چنانچہ سنہ ۱۱۹۵ھ مطابق سنہ ۱۷۸۱ء میں یہیں انتقال کیا اور یہیں مدفون ہوئے۔

غافل نہ رہیو ہرگز نادان داغِ دل سے
بھڑکے گا جب یہ شعلہ تب گھر جلا رہے گا
مرنے پر اپنے مت جا سالک طلب میں اُس کی
گو سر کو کھو رہیگا پر اُس کو پا رہے گا
عمر عزیز ساری دل ہی کے غم میں گزری
بیمارِ عاشقی یہ کس دن بھلا رہے گا
دیدار کا تو وعدہ محشر میں دیکھ کر کے
بیمارِ غم میں تیرے تب تک تو کیا رہے گا
گیا ہے جو اُٹھ گیا ہے پر بستہ وفا ہے
قیدِ حیات میں ہی تو میر آ رہے گا

جو یہ دل ہے تو کیا سر انجام ہوگا
تہِ خاک بھی خاک آرام ہوگا
مرا جی تو آنکھوں میں آیا یہ سنتے
کہ دیدار بھی ایک دن عام ہوگا
نہ ہوگا وہ دیکھا جسے کبک تو نے
وہ اک باغ کا سرو اندام ہوگا
نہ نکلا کر اتنا بھی بے پردہ گھر سے
بہت اس میں ظالم تو بدنام ہوگا
ہزاروں کی یہاں لگ گئیں چھت سے آنکھیں
تو اے ماہ کس شب لبِ بام ہوگا
جگر چاکی ناکامیِ دنیا ہے آخر
نہیں آئے جو میر کچھ کام ہوگا

خواب میں تو نظر جمال پڑا
پر مرے جی ہی کے خیال پڑا
وہ نہانے لگا تو سایۂ زلف
بحر میں تو کہے کہ جال پڑا
میں نے تو سر دیا پر اے جلاد
کس کی گردن پہ یہ وبال پڑا
شیخ قلاش ہی جوے میں نہ لاؤ
یہاں ہمارا ہے ہے مال پڑا
خوبرو اب نہیں ہیں گندم گوں
میر ہندوستاں میں کال پڑا

نہ پوچھ خواب زلیخا نے کیا خیال لیا[1]
کہ کاروان کا کنعاں کے جی نکال لیا
رہِ طلب میں گرے ہوتے سر کے بل ہم بھی
شکستہ پائی نے اپنی ہمیں سنبھال لیا
رہوں ہوں برسوں سے ہمدوش پر کبھو ان نے
گلے میں ہاتھ مرا پیار سے نہ ڈال لیا
بتاں کی میر ستم وہ نگاہ ہے جس نے
خدا کے واسطے بھی خلق کا وبال لیا

[1] ایک قلمی نسخہ مرقومہ ۱۲۲۳ھ محفوظ ندوۃ العلما لائبریری میں یہ غزل نہیں پائی جاتی۔ آسی

اک وہم سی رہی ہو اپنی نمود تن میں
آنے ہو اب تو آؤ پھر ہم میں کیا رہیگا

مذکورِ یار ہم سے مت ہمنشیں کیا کر
دل جو بجا نہیں ہی پھر اس میں جا رہیگا

دل ہی کے غم میں گزری اپنی تو عمر ساری[1]
بیمارِ عاشقی یہ کس دن بھلا رہیگا

اُس گل بغیر جیسے ابرِ بہار عاشق
نالاں جدا رہیگا، روتا جدا رہیگا

دانستہ ہے تغافل غم کہنا اس سے حاصل
تم دردِ دل کہوگے وہ سر جھکا رہیگا

اب جھمکی اُس کی تم نے دیکھی کبھو جو یارو
برسوں تلک اسی میں پھر دل سدا رہیگا

کس کس کو میر اُن نے کہہ کر دیا ہی بوسہ
وہ ایک ہی مفتن یوں ہی چما رہیگا

بھلا ہوگا کچھ اک احوال اس سے یا بُرا ہوگا
مآل اپنا ترے غم میں خدا جانے کہ کیا ہوگا

تفحص فائدہ ناصح تدارک تجھ سے کیا ہوگا
وہی پاوے گا میرا دردِ دل جس کا لگا ہوگا

کسو کو شوق یارب بیش اس سے اور کیا ہوگا
قلم ہاتھ آگئی ہوگی تو سو سو خط لکھا ہوگا

دُکانیں حسن کی آگے ترے تختہ ہوئی ہوں گی
جو تو بازار میں ہوگا تو یوسف کب بکا ہوگا

معیشت ہم فقیروں کی سی اخوانِ زماں سے کر
کوئی گالی بھی دے تو کہہ بھلا بھائی بھلا ہوگا

خیال اس بیوفا کا ہمنشیں اتنا نہیں اچھا
گماں رکھتے تھے ہم بھی یہ کہ ہم سے آشنا ہوگا

قیامت کرکے اب تعبیر جس کو کرتی ہی خلقت
وہ اُس کوچہ میں ایک آشوب سا شاید ہوا ہوگا

عجب کیا ہی ہلاکِ عشق ہیں فرہاد و مجنوں تے
محبت روگ ہی کوئی کہ کم اُس سے جیا ہوگا

نہ ہو کیوں غیرتِ گلزار وہ کوچہ خدا جانے
لہو اُس خاک پر کن کن عزیزوں کا گرا ہوگا

بہت ہمسائے اس گلشن کے زنجیری رہا ہوں میں
کبھو تم نے بھی میرا شور نالوں کا سنا ہوگا

نہیں جز عرش جاگہ راہ میں لینے کو دم اس کے
قفس سے تن کے مرغِ روح میر اب جب رہا ہوگا

کہیں ہیں میر کو مارا گیا شب اس کے کوچے میں
کہیں وحشت میں شاید بیٹھے بیٹھے اٹھ گیا ہوگا

یہاں نامِ یار کس کا وردِ زباں نہ پایا
پر مطلقاً کہیں ہم اُس کا نشاں نہ پایا

وضعِ کشیدہ اُس کی رکھتی ہی داغ سب کو
نیوتا کسو سے ہم وہ ابرو کماں نہ پایا

پایا نہ یوں کہ کریے اُس کی طرف اشارت
یوں تو جہاں میں ہم نے اُسکو کہاں نہ پایا

یہ دل کہ خون ہووے برجا نہ تھا وگرنہ
وہ کونسی جگہ تھی اس کو جہاں نہ پایا

[1] میر سے عمر عزیز ساری دل ہی کے غم میں گذری + بیمارِ عاشقی یہ کس دن بھلا رہیگا۔

سب[1] پہ جس بار نے گرانی کی — اُس کو یہ ناتواں اُٹھا لایا
دل مجھے اُس گلی میں لیجاکر — اور بھی خاک میں مِلا لایا
ابتدا ہی میں مر گئے سب یار — عشق کی کون انتہا لایا
اب تو جاتے ہیں بُتکدے سے میر
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

کیا عجب پل میں اگر ترک ہو اُس سے جاں کا — ہو جو زخمی کسو برہم زدنِ مژگاں کا
اُٹھتے پلکوں کے گرے پڑتے ہیں لاکھوں آنسو — ڈول ڈالا ہے مری آنکھوں نے اب طوفاں کا
جلوۂ ماہ تہِ ابرِ تنک بھول گیا — اُن نے سوتے میں دوپٹے سے جو منھ کو ڈھانکا
لہو لگتا ہے ٹپکنے جو پلک ماروں ہوں — اب تو یہ رنگ ہے اس دیدۂ اشک افشاں کا
ساکنِ کو کو ترے کب ہے تماشے کا دماغ — آئے فردوس بھی چلکر نہ ادھر کو جھانکا
اُٹھ گیا ایک تو اک مرنے کو آ بیٹھے ہے — قاعدہ ہے یہی مدت سے ہمارے ہاں کا
کارِ اسلام ہے مشکل ترے خال و خط سے — رہزنِ دیں ہے کوئی دزد کوئی ایماں کا
چارۂ عشق بجز مرگ نہیں کچھ اے میر
اس مرض میں ہے عبث فکر تمھیں درماں کا

ہر دم طرف ہے ویسے مزاجِ کرخت کا — ٹکڑا مرا جگر ہے کہو سنگِ سخت کا
سبزانِ تازہ رو کی جہاں جلوہ گاہ تھی — اب دیکھیے تو وہاں نہیں سایہ درخت کا
جوں برگ ہائے لالہ پریشان ہو گیا — مذکور کیا ہے اب جگرِ لخت لخت کا
دلی[2] میں آج بھیکھ بھی ملتی نہیں انھیں — تھا کل تلک دماغ جنھیں تاج و تخت کا
خاکِ سیہ سے میں جو برابر ہوا ہوں میر
سایہ پڑا ہے مجھ پہ کسو تیرہ بخت کا

ہم[3] عشق میں نہ جانا غم ہی سدا رہیگا — دس دن جو ہے یہ مہلت سو یہاں وبال رہیگا
برقع اُٹھے پہ اُس کے ہوگا جہاں روشن — خورشید کا نکلنا کیونکر چھپا رہیگا

۱؎ حافظ — آسماں بارِ امانت نتوانست کشید ؛ قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند۔
۲؎ دلی کی طوائف الملوکی کی طرف اشارہ کیا ہے۔
۳؎ میر صاحب کا وہ شعر بھی دہر کے مضمون کا خوب ہے جو صفحہ ۲۹ سطر ۱ پہ درج ہے۔

کیونکہ پڑتے ہیں ترے پانوں نسیمِ سحری | اُس کے کوچے میں ہی صد گنجِ شہیداں یکجا
تو بھی رونے کو بلا دل ہی ہمارا بھی بھرا | ہو جو اے ابر بیابان میں گریاں یکجا

بیٹھ کر میر جہاں جوب نہ رویا ہووے
ایسی کوچہ میں نہیں ہے تیرے جاناں یکجا

فلک[1] کا منہ نہیں اس فتنہ کے اٹھانے کا | ستم شریک ترا یار ہے زمانے کا
ہمارے ضعف کی حالت سے دل قوی رکھو | کہیں خیال نہیں یاں بحال آنے کا
تری ہی راہ میں مارے گئے سبھی آخر | سفر تو ہم کو ہی درپیش جی سے جانے کا
بسانِ شمع جو مجلس سے ہم گئے تو گئے | سُراغ کیجو نہ پھر تو نشان پانے کا
چمن میں دیکھ نہیں سکتے ٹک کہ چھپتا ہے | جگر میں برق کے کانٹا مجھ آشیانے کا[2]
ٹک آ تو تا سرِ بالیں نہ کر تعلل کیا | تجھے بھی شوخ یہی وقت ہے بہانے کا
سرا[3] ہا ان نے ترا ہاتھ جن نے دیکھا زخم | شہید ہوں میں تری تیغ کے لگانے کا

شریعت مکہ رہا ہے تمام عمرا ے شیخ
یہ میر اب جو گدا ہے شراب خانے کا

کل شبِ ہجراں تھی لب پر نالہ بیمارانہ تھا | شام سے تا صبحدم بالیں پہ سر یکجا نہ تھا
شہرۂ عالم اسی یمنِ محبت نے کیا | ورنہ مجنوں ایک خاک افتادہ دیوانہ تھا
منزل اس مہ کی رہا جو مدتوں اے ہمنشیں | اب وہ دل گویا کہ اک مدت کا ماتم خانہ تھا
اک نگاہِ آشنا کو بھی وفا کرتا نہیں | وا ہوئیں مژگاں کہ سبزہ سبزۂ بیگانہ تھا
روز و شب گزرے ہے پیچ و تاب میں رہتے تجھے | اے دلِ صد چاک کس کی زلف کا تو شانہ تھا
یاد ایامے کہ اپنی روز و شب کی جائے باش | یا درِ باز بیاباں یا درِ میخانہ تھا
جس کو دیکھا ہم نے اس وحشت کدہ میں دہر کے | یا سڑی یا خبطی یا مجنون یا دیوانہ تھا
بعد خوں ریزی کے مدت بے حنا رنگیں رہا | ہاتھ اُس کا جو مرے لوہو میں گستاخانہ تھا
غیر کے کہنے سے مارا اُن نے ہم کو بے گناہ | یہ نہ سمجھا وہ کہ واقع میں بھی کچھ تھا یا نہ تھا

[1] حکیم مومن خاں مومن دہلوی سے ہزار لطف ہیں جو مہر ستم میں جاں کیلئے ۔ ستم شریک ہوا کون آسماں کیلئے۔
[2] مجھ آشیانے کا ۔ میرے آشیانے کا ۔ کی جگہ اب متروک ہے۔
[3] مرزا غالب دہلوی سے نظر لگے نہ کہیں اُس کے دستِ بازو کو ۔ یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں۔

فتنے کی گرچہ باعث آفاق میں وہی تھی
لیکن کمر کو اُس کی ہم درمیاں نہ پایا
محرومِ سجدہ آخر جانا پڑا جہاں سے،
جوشِ جباہ سے ہم وہ آستاں نہ پایا
ایسی ہی میر کی بھی مدت سے رونی صورت
چہرے پہ اُس کے کس دن آنسو رواں نہ پایا

پھر شب نہ لطف تھا نہ وہ مجلس میں نور تھا
اُس روئے دل فروز ہی کا سب میں ظہور تھا
کیا کیا عزیز خلع بدن ہائے کر گئے
تشریف تم کو یہاں تئیں لانا ضرور تھا
کیونکر تو میری آنکھ سے ہو دل تلک گیا
یہ بحرِ موج خیز تو عسر العبور تھا
شاید نشے میں اُس سے یہ سفاکیاں ہوئیں
زخمی جو اُس کے ہاتھ کا نکلا سو چور تھا
جیتے جی پاس ہو کے نہ نکلا کسو کے میر
یہ دور گرد بادیۂ عشق دُور تھا

ہے حال جائے گریہ جانِ پُر آرزو کا
روئے نہ ہم کبھو ٹک دامن پکڑ کسو کا
جاتی نہیں اُٹھائی اپنے پہ یہ خشونت
اب رہ گیا ہے آنا میرا کبھو کبھو کا
اِس آستاں سے کس دن پُر شور سر نہ پٹکا
اُس کی گلی میں جا کر کس رات ہٹ کو کا
شاید کہ مُند گئی ہو قمری کی چشمِ گریاں
کچھ ٹوٹ سا چلا ہے پانی چمن کے جو کا
اپنے تڑپنے کی تو تدبیر پہلے کر لوں
تب فکر میں کروں گا زخموں کے بھی رفو کا
دانتوں کی نظم اُس کی ہنسنے میں جن نے دیکھی
پھر موتیوں کی لڑ پر اُن نے کبھو نہ تھوکا
یہ عیش گہ نہیں ہے یہاں رنگ اور کچھ ہے
ہر گل ہے اس چمن میں ساغر بھرا لہو کا
بلبل غزل سرائی آگے ہمارے مت کر
سب ہم سے سیکھتے ہیں انداز گفتگو کا
گلیاں بھری پڑی ہیں اے یار زخمیوں سے
مت کھول پیچ ظالم اُس زلفِ مشکبو کا
دے پہلی التفاتیں ساری فریب نکلیں
دینا نہ تھا دل اس کو میں میر آہ چوکا

میں بھی دُنیا میں ہوں اک نالہ پریشاں یکجا
دل کے سَو ٹکڑے مرے پر سبھی نالاں یکجا
پند گویوں نے بہت سینے کی تدبیریں کیں
آہ ثابت بھی نہ نکلا یہ گریباں یکجا
تیرا کوچہ ہے ستمگار وہ کافر جا کہ
کہ جہاں مارے گئے کتنے مسلماں یکجا
سر سے باندھا ہے کفن عشق میں تیرے یعنی
جمع ہم نے بھی کیا ہے سر و ساماں یکجا

کب تلک یہ ستم اُٹھائیے گا
ایک دن یوں ہی جی سے جائیے گا

شکلِ تصویر بیخودی کب تک
کسو دن آپ میں بھی آئیے گا

سب سے مل چل کہ حادثے سے پھر
کہیں ڈھونڈا بھی تو نہ پائیے گا

نہ موئے ہم اسیری میں تو نسیم
کوئی دن اور باؤ کھائیے گا

کہیے گا اُس سے قصۂ مجنوں
یعنی پردے میں غم سنائیے گا

اُس کے پابوس کی توقع پر
اپنے تئیں خاک میں ملائیے گا

اُس کے پانوں کو جا لگی ہے حنا
خوب سے ہاتھ اُسے لگائیے گا

شرکتِ شیخ و برہمن سے میر
کعبہ و دیر سے بھی جائیے گا

قطعہ

اپنی ڈیڑھ اینٹ کی جدی مسجد
کسی ویرانے میں بنائیے گا

دل پہنچا ہلاکی کو نپٹ کھینچ کسالا
لے یار مرے سلمہ اللہ تعالا

کچھ میں نہیں اس دل کی پریشانی کا باعث
برہم ہی مرے ہاتھ لگا تھا یہ رسالا

معمور شرابوں سے کبابوں سے ہے سب دیر
مسجد میں ہے کیا شیخ، پیالا نہ نوالا

گزرے ہے لہو وہاں سرِ ہر خار سے اب تک
جس دشت میں پھوٹا ہے مرے پانوں کا چھالا

گر قصد ادھر کا ہے تو ٹک دیکھ کے آنا
یہ دیر ہے زہاد نہو خانۂ خالا

جس گھر میں ترے جلوے سے ہو چاندنی کا فرش
وہاں چادرِ مہتاب ہے مکڑی کا سا جالا

دشمن نہ کدورت سے مرے سامنے ہوجو
تلوار کے لڑنے کو مرے کیجو[1] حوالا

قطعہ

ناموس مجھے صافیِ طینت کی ہے ورنہ
رستم نے مری تیغ کا حملہ نہ سنبھالا

دیکھے ہی مجھے دیدۂ پرخشم سے وہ میر
میرے ہی نصیبوں میں تھا یہ زہر کا پیالا

پل میں جہاں کو دیکھتے میرے ڈبو چکا
اک وقت میں یہ دیدہ بھی طوفان رو چکا

افسوس میرے مردے پہ اتنا نہ کر کہ اب
پچھتانا یوں ہی سا ہے جو ہونا تھا ہو چکا

[1] کیجو بجائے کیجئو اور ہوجو بجائے ہوجیو اور اسی قسم کے صیغے اب متروک ہیں زمانۂ مرزا غالب رح تک استعمال میں تھے۔ چنانچہ اُن کے یہاں ایسے الفاظ کا اس طرح استعمال ہوا ہے۔ مثلاً ؎
وہ حلقہ ہائے زلف کمیں میں ہیں اے خدا ؎ رکھ لیجو میرے دعوئ وارستگی کی شرم۔ بخلاف اسکے کیجے لیجے بروزن فعلن اب بھی استعمال ہوتے ہیں:

صبح ہوتے وہ بناگوش آج یاد آیا مجھے — جو گرا دامن پہ آنسو گوہرِ یک دانہ تھا
شب فروغِ بزم کا باعث ہوا تھا حسنِ دوست — شمع کا جلوہ غبارِ دیدۂ پروانہ تھا
رات اُس کی چشمِ میگوں خواب میں دیکھی تھی میں — صبح سوتے سے اُٹھا تو سامنے پیمانہ تھا
رحم کچھ پیدا کیا شاید کہ اس بے رحم نے — گوش اُس کا شب ادھر تھا آخرِ افسانہ تھا

میرؔ بھی کیا مست طافح تھا شرابِ عشق کا
لب پہ عاشق کے ہمیشہ نعرۂ مستانہ تھا

پیغامِ غم جگر کا گلزار تک نہ پہنچا — نالہ مرا چمن کی دیوار تک نہ پہنچا
اس آئنہ کے مانند زنگار جس کو کھاوے — کام اپنا اُس کے غم میں دیدار تک نہ پہنچا
جوں نقشِ پا ہے غربت حیران کار اُس کی — آوارہ ہو وطن سے جو یار تک نہ پہنچا
لبریز شکوہ تھے ہم لیکن حضور تیرے — کارِ شکایت اپنا گفتار تک نہ پہنچا
بے چشم نم رسیدہ پانی چوا نہ کوئی — وقتِ اخیر اُس کے بیمار تک نہ پہنچا
یہ بختِ سبز دیکھو باغ زمانہ میں سے — پژمردہ گل بھی اپنی دستار تک نہ پہنچا
مستوری خوبروئی دونوں نہ جمع ہوویں — قطعہ — خوبی کا کام کس کی اظہار تک نہ پہنچا
یوسف سے لیکے تا گل پھر گل سے لیکے تا شمع — یہ حسن کس کو لیکر بازار تک نہ پہنچا

افسوس میرؔ وے جو ہونے شہید آئے
پھر کام اُن کا اُس کی تلوار تک نہ پہنچا

اُس کا خیال چشم سے شب خواب لے گیا — قسمے کہ عشق جی سے مرے تاب لے گیا
کن نیندوں اب تو سوتی ہے اے چشم گریہ ناک — مژگاں تو کھول شہر کو سیلاب لے گیا
آوے جو مصطبے[۱] میں تو سن لو کہ راہ سے — واعظ کو ایک جامِ مئے ناب لے گیا
نے دل رہا بجا ہے نہ صبر و حواس و ہوش — آیا جو سیلِ عشق سب اسباب لے گیا
میرے حضور شمع نے گریہ جو سر کیا — رویا میں اس قدر کہ مجھے آب لے گیا
احوال اس شکارِ زبوں کا ہے جائے رحم — جس ناتواں کو مفت نہ قصاب لے گیا

منھ کی جھلک سے یار کے بے ہوش ہو گئے
شب ہم کو میرؔ پرتوِ مہتاب لے گیا

۱؎ مصطبہ بمعنی میخانہ عہ بدمست۔

اُس کے لب سے تلخ ہم سنتے رہے
اپنے حق میں آبِ حیواں سم رہا

میرے رونے کی حقیقت جس میں تھی
ایک مدت تک وہ کاغذ نم رہا

صبحِ پیری شام ہونے آئی میر
تو نہ چیتا یہاں بہت دن کم رہا

چوری میں دل کی وہ ہنر کر گیا
دیکھتے ہی آنکھوں میں گھر کر گیا

دیر میں میں خاک بسر ہی رہا
عمر کو اس طور بسر کر گیا

دل نہیں ہے منزلِ سینہ میں اب
یہاں سے وہ بیچارہ سفر کر گیا

حیف جو وہ نسخۂ دل کے اوپر
سرسری سی ایک نظر کر گیا

کس کو میرے حال سے تھی آگہی
نالۂ شب سب کو خبر کر گیا

گو نہ چلاتا مژہ تیر نگاہ
اپنے جگر سے تو گزر کر گیا

مجلسِ آفاق میں پروانہ ساں
میر بھی شام اپنی سحر کر گیا

وھاں وہ تو گھر سے اپنے پی کر شراب نکلا
یہاں شرم سے عرق میں ڈوب آفتاب نکلا

آیا جو واقعی میں درپیش عالمِ مرگ
یہ جاگنا ہمارا دیکھا تو خواب نکلا

دیکھا جو اوس پڑتے گلشن میں ہم تو آخر
گل کا وہ روئے خنداں چشمِ پُر آب نکلا

پردے ہی میں چلا جا خورشید تو ہی بہتر
اک حشر ہے جو گھر سے وہ بے حجاب نکلا

کچھ دیر ہی لگی نا دل کو تو تیر لگتے
اس صیدِ ناتواں کا کیا جی شتاب نکلا

ہر حرفِ غم نے میرے مجلس کے تئیں رُلایا
گویا غبارِ دل کا پڑھتا کتاب نکلا

روئے عرق فشاں کو بس پونچھ گرم مت ہو
اُس گل میں کیا رہیگا جس کا گلاب نکلا

مطلق نہ اعتنا کی احوال پر ہمارے
نامے کے نامے ہی میں سب پیچ و تاب نکلا

شانِ تغافل اپنے تو خط کی کیا لکھیں ہم
قاصد موا تب اُس کے منہ سے جواب نکلا

کس کی نگہ کی گردش تھی میر رو بہ مسجد
محراب میں سے زاہد مست و خراب نکلا

دامانِ کوہ میں جو میں دھاڑ مار رویا
اک ابر وھاں سے اُٹھ کر بے اختیار رویا

پڑتا نہ تھا بھروسہ عہدِ وفائے گل پر
مرغِ چمن نے سمجھا میں تو ہزار رویا

لگتی نہیں پلک سے پلک انتظار میں
آنکھیں اگر یہی ہیں تو بس نیند سو چکا

اک چشمک پیالہ ہے ساقی بہار عمر
جھپکی لگی کہ دور یہ آخر ہی ہو چکا

ممکن نہیں کہ گل کرے ویسی شگفتگی
اس سر زمیں میں تخم محبت میں بو چکا

پایا نہ دل بہایا ہوا سیل اشک کا
میں پنجۂ مژہ سے سمندر بلو چکا

ہر صبح حادثے سے یہ کہتا ہے آسماں
دے جام خون میر کو گر منہ وہ دھو چکا

دیر و حرم سے گزرے اب دل ہے گھر ہمارا
ہے ختم اس آبلے پر سیر و سفر ہمارا

پلکوں سے تیری ہم کو کیا چشم داشت یہ تھی
اُن برچھیوں نے بانٹا باہم جگر ہمارا

دُنیا و دیں کی جانب میلان ہو تو کہئے
کیا جانئے کہ اُس بن دل ہے کدھر ہمارا

ہیں تیرے آئینے کی تمثال ہم نہ پوچھو
اس دشت میں نہیں ہے پیدا اثر ہمارا

جوں صبح اب کہاں ہے طول سخن کی فرصت
قصہ ہی کوئی دم کو ہے مختصر ہمارا

کوچے میں اُس کے جاکر بنتا نہیں پھر آنا
خون ایک دن گریگا اس خاک پر ہمارا

ہے تیرہ روز اپنا لڑکوں کی دوستی سے
اس دن ہی کو کہے تھا اکثر پدر ہمارا

سیلاب ہر طرف سے آئیں گے بادیہ میں
جوں ابر روتے ہوگا جس دم گزر ہمارا

نشو و نما ہے اپنی جوں گرد باد الوکھی
بالیدہ خاک رہ سے ہے یہ شجر ہمارا

یوں دور سے کھڑے ہو کیا معتبر ہے رونا
دامن سے باندھ دامن ہے ابر تر ہمارا

جب پاس رات رہنا آتا ہے یاد اُس کا
تھمتا نہیں ہے رونا دو دو پہر ہمارا

اس کارواں سرا میں کیا میر بار کھولیں
یہاں کوچ لگ رہا ہے شام و سحر ہمارا

غم رہا جبتک کہ دم میں دم رہا
دم کے جانے کا نہایت غم رہا

حسن تھا تیرا بہت عالم فریب
خط کے آنے پر بھی اک عالم رہا

دل نہ پہنچا گوشۂ داماں تلک
قطرۂ خوں تھا مژہ پر جم رہا

سنتے ہیں لیلیٰ کے خیمہ کو سیاہ
اُس میں مجنوں کا ولے ماتم رہا

جامۂ احرام زاہد پر نہ جا
تھا حرم میں لیک نامحرم رہا

زلفیں کھولے تو تو ٹک آیا نظر
عمر بھر یہاں کام دل برہم رہا

اتنے منعم جہان میں گزرے
وقت رحلت کے کس کنے زر تھا

صاحب جاہ و شوکت و اقبال
اک ازاں جملہ اب سکندر تھا

تھی یہ سب کائنات زیر نگیں
ساتھ مور و ملخ سا لشکر تھا

لعل و یاقوت ہم زر و گوہر
چاہیے جس قدر میسر تھا

آخر کار جب جہاں سے گیا
ہاتھ خالی کفن سے باہر تھا

عیب طول کلام مت کریو
کیا کروں میں سخن سے خوگر تھا

خوش رہا جب تلک رہا جیتا
میرؔ معلوم ہے قلندر تھا

تیرا رخ مخطط قرآن ہے ہمارا
بوسہ بھی لیں تو کیا ہے ایمان ہے ہمارا

گر ہے یہ بیقراری تو رہ چکا بغل میں
دو روز دل ہمارا مہمان ہے ہمارا

ہیں اس خراب دل سے مشہور شہر خوباں
اس ساری بستی میں گھر ویران ہے ہمارا

مشکل بہت ہی ہمسا پھر کوئی ہاتھ آنا
یوں مارنا تو پیارے آسان ہے ہمارا

ادریس و خضر و عیسیٰ قاتل سے ہم چھڑائے
ان خوں گرفتگاں پر احسان ہے ہمارا

ہم وے ہیں سن رکھو تم مر جائیں رک کے یکجا
کیا کوچہ کوچہ پھرنا عنوان ہے ہمارا

ہیں صید گہ کے تیری صیاد کیا نہ دھڑکے
کہتے ہیں صید جو ہے بیجان ہے ہمارا

کرتے ہیں باتیں کس کس ہنگامہ کی یہ زاہد
دیوان حشر گویا دیوان ہے ہمارا

ماہیت دو عالم کھاتی پھرے ہے غوطے
یک قطرہ خون یہ دل طوفان ہے ہمارا

کیا خانداں کا اپنے تجھ سے کہیں تقدس
روح القدس اک ادنیٰ دربان ہے ہمارا

کرتا ہے کام وہ دل جو عقل میں نہ آوے
گھر کا مشیر کتنا نادان ہے ہمارا

بنجر زمین دل کی ہے میرؔ ملک اپنی
پر داغ سینہ مُہری فرمان ہے ہمارا

کب مصیبت زدہ دل مائل آزار نہ تھا
کون سے درد و ستم کا یہ طرفدار نہ تھا

آدم خاکی سے عالم کو جلا ہے ورنہ
آئینہ تھا یہ ولے قابل دیدار نہ تھا

دھوپ میں جلتی ہیں غربت وطنوں کی لاشیں
تیرے کوچے میں مگر سایۂ دیوار نہ تھا

صد گلستاں تہ یک بال تھے اس کے جب تک
طائر جان قفس تن کا گرفتار نہ تھا

ہر گل زمیں یہاں کی رونے ہی کی جگہ تھی — مانندِ ابر ہر جا میں زار زار رویا
تھی مصلحت کہ رُک کر ہجراں میں جان دیجے — دل کھول کر نہ غم میں میں ایک بار رویا
اک عجزِ عشق اس کا اسباب صد الم تھا
کل میرؔ سے بہت میں ہو کر دوچار رویا

دو

اُس چہرہ کی خوبی سے عبث گل کو جتایا — یہ کون شگوفہ سا چمن زار میں لایا
وہ آئنہ رخسار دمِ بازپس آیا — جب حس نہ رہا ہم کو تو دیدار دکھایا
کچھ ماہ میں اس میں نہ تفاوت ہوا ظاہر — سو بار نکالا اسے اور اُس کو چھپایا
اک عمر مجھے خاک میں ملتے ہوئے گزری — کوچہ میں ترے آن کے لوہو میں نہایا
سمجھا تو مجھے مرگ کے نزدیک پس از دیر — رحمت ہے مرے یار بہت دور سے آیا
یہ بارغ رہا ہم سے وے لے جا نہ سکے ہم — بے بال و پری نے بھی ہمیں خاک اُڑایا
میں صیدِ رمیدہ ہوں بیابانِ جنوں کا — رہتا ہے مرا موجبِ وحشت مرا سایا
یا قافلہ در قافلہ ان رستوں میں تھے لوگ — یا ایسے گئے یہاں سے کہ پھر کھوج نہ پایا
رو میں نے رکھا ہے درِ ترسا بچگاں پر — رکھیو تو مری شرم بڑھاپے میں خدایا
مالا نہیں کچھ مجھ کو پتنگ آج اُڑاتے — بہتوں کے تئیں باؤ کا رُخ اُن نے بتایا
ایسے بتِ بے مہر سے ملتا ہے کوئی بھی
دل میرؔ کو بھاری تھا جو پتھر سے لگایا

دل جو زیرِ غبار اکثر تھا — کچھ مزاج ان دنوں مکدر تھا
اُس پہ تکیہ کیا تو تھا لیکن — رات دن ہم تھے اور بستر تھا
سرسری تم جہان سے گزرے — ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا
دل کی کچھ قدر کرتے رہیو تم — یہ ہمارا بھی ناز پرور تھا
بعد اک عمر جو ہوا معلوم — دل اُس آئینہ رو کا پتھر تھا
بار سجدہ ادا کیا تہِ تیغ — کب سے یہ بوجھ میرے سر پہ تھا
کیوں نہ ابرِ سیہ سفید ہوا — جب تلک عہد دیدۂ تر تھا
اب خرابا ہوا جہان آباد — ورنہ ہر اک قدم پہ یاں گھر تھا
بے زری کا نہ کر گلہ غافل — قطعہ — رہ تسلی کہ یوں مقدر تھا

کل چمن میں گل و سمن دیکھا — آج دیکھا تو باغ بن دیکھا
کیا ہے گلشن میں جو قفس میں نہیں — عاشقوں کا جلا وطن دیکھا
ذوقِ پیکان تیر میں تیرے — مدتوں تک جگر نے چمن دیکھا
گھر کے گھر جلتے تھے پڑے تیرے — داغ دل دیکھے بس چمن دیکھا
ایک چشمک دو صد سنانِ مژہ — اس نکیلے کا بانکپن دیکھا

حسرت اُس کی جگہ تھی خوابیدہ
میر کا کھول کر کفن دیکھا

جدا جو پہلو سے وہ دلبرِ یگانہ ہوا — طپش کے یہاں تئیں دل نے کہ دردِ شانہ ہوا
جہاں کو فتنہ سے خالی کبھو نہیں پایا — ہمارے وقت میں تو آفتِ زمانہ ہوا
خلش نہیں کسو خواہش کی رات سے شاید — سرشک یاس کے پردے میں دل روانہ ہوا
ہم اپنے دل کی چلے دل ہی میں لیے یہاں سے — ہزار حیف سرِ حرف اس سے وا نہ ہوا

کھلا نشے میں جو پگڑی کا پیچ اُس کی میر
سمندِ ناز پہ ایک اور تازیانہ ہوا

کیا دن تھے وے کہ یہاں بھی دلِ آرمیدہ تھا — رُو آشیانِ طائرِ رنگِ پریدہ تھا
قاصد جو وہاں سے آیا تو شرمندہ میں ہوا — بیچارہ گریہ ناک گریباں دریدہ تھا
اک وقت ہم کو تھا سرِ گریہ کہ دشت میں — جو خار خشک تھا سو وہ طوفاں رسیدہ تھا
جس صیدگاہِ عشق میں یاروں کا جی گیا — مرگ[1] اُس شکارگہ کا شکارِ رمیدہ تھا
مت پوچھ کس طرح سے کٹی رات ہجر کی — ہر نالہ میری جان کو تیغِ کشیدہ تھا
حاصل نہ پوچھ گلشنِ مشہد کا بوالہوس — یہاں پھل ہر اک درخت کا حلقِ بریدہ تھا

دل بیقرار گریۂ خونیں تھا رات میر
آیا نظر تو بسمل در خوں طپیدہ تھا

کثرتِ داغ سے دل رشکِ گلستاں نہ ہوا — میرا دلخواہ جو کچھ تھا وہ کبھو یہاں نہ ہوا
جی تو ایسے کئی صدقے کئے تجھ پر لیکن — حیف یہ ہے کہ تنک تو بھی پشیماں نہ ہوا
آہ میں کب کی کہ سرمایۂ دوزخ نہ ہوئی — کونسا اشک مرا منبعِ طوفاں نہ ہوا

[1] مرگ۔ اب فصحا اس کی تانیث کو مرجح سمجھتے ہیں۔

حیف سمجھا ہی نہ وہ قاتلِ ناداں ورنہ
بے گنہ مارنے قابل یہ گنہگار نہ تھا
عشق کا جذب ہوا باعثِ سودا ورنہ
یوسفؑ مصر زلیخا کا خریدار نہ تھا
نرم تر موم سے بھی ہم کو کوئی دیتی قضا
سنگ چھاتی کا تو یہ دل ہمیں درکار نہ تھا
رات حیران ہوں کچھ چُپ ہی مجھے لگ گئی میر
دردِ پنہاں تھے بہت پر لبِ اظہار نہ تھا

جی اپنا میں نے تیرے لئے خوار ہو دیا
آخر کو جستجو نے تری مجھ کو کھو دیا
بیطاقتی سکوں نہیں رکھتی ہے ہمنشیں
رونے نے ہر گھڑی کے مجھے توڑ بو دیا
اے ابراس چمن میں نہ ہوگا گلِ امید
یعاں تخم یاس اشک کو میں بھر کے بو دیا
پوچھا جو میں نے دردِ محبت سے میر کو
رکھ ہاتھ اُن نے دل پہ ٹک اک اپنے رو دیا

خط منہ پہ آئے جاناں خوبی پہ جان دیگا
ناچار عاشقوں کو رخصت کے پان دیگا
سارے رئیس اعضا ہیں معرضِ تلف میں
یہ عشق بے محابا کس کو امان دیگا
پائے پر آبلہ سے میں گم شدہ گیا ہوں
ہر خار بادیہ کا میرا نشان دیگا
داغ اور سینے میں کچھ بگڑی ہے عشق دیکھیں
دل کو جگر کو کس کو اب درمیان دیگا
نالہ ہمارا ہر شب گزرے ہے آسماں سے
فریاد پر ہماری کس دن تو کان دیگا
مت رنگ سے ہمارے پیارے حنا لگاؤ
پابوس پر تمھارے سر سَو جوان دیگا
گھر چشم کا ڈبو مت دل کے گئے پہ رو رو
کیا میر ہاتھ سے تو یہ بھی مکان دیگا

ہوتا ہے یعاں جہاں میں ہر روز و شب تماشا
دیکھا جو خوب تو ہے دُنیا عجب تماشا
ہر چند شور محشر اب بھی ہے در پہ لیکن
نکلے گا یار گھر سے ہو ویگا جب تماشا
بھڑکی ہے آتشِ غم منظور ہے جو تجھ کو
جلنے کا عاشقوں کے آ دیکھ اب تماشا
طالع جو میر خواری محبوب کو خوش آئی
پرغم یہ ہے مخالف دیکھیں گے سب تماشا

ے میر صاحب کا ایک شعر اور بھی ایسے ہی انداز کا ہے ے
اس سرزمیں میں تخم محبت میں بو چکا ؎ ممکن نہیں کہ گل کرے ویسی شگفتگی

اس قیدِ جیب سے میں چھوٹا جنوں کی دولت
ورنہ گلا یہ میرا جوں طوق میں پھنسا تھا

مشتِ نمک کی خاطر اس واسطے ہوں حیراں
کل زخمِ دل نہایت دل کو مرے لگا تھا

ای گرد باد مت دے ہر آن عرضِ وحشت
میں بھی کسو زمانے اس کام میں بلا تھا

بن کچھ کہے سنا ہے عالم سے میں نے کیا کیا
پر تو نے یوں نہ جانا ای بے وفا کہ کیا تھا

روتی ہے شمع اتنا ہر شب کہ کچھ نہ پوچھو
میں سوزِ دل کو اپنے مجلس میں کیوں کہا تھا

قطعہ
سر مار کر ہوا تھا میں خاک اس گلی میں
سینے پہ مجھ کو اس کا مذکور نقشِ پا تھا

سو بخت تیرہ سے ہوں پامالِ صبا میں
اس دن کے واسطے میں کیا خاک میں ملا تھا

قطعہ
یہ سرگزشت میری افسانہ جو ہوئی ہے
مذکور اُس کا اُس کے کوچے میں جابجا تھا

سُنکر کسی سے وہ بھی کہنے لگا تھا کچھ کچھ
بیدرد کتنے بولے ہاں اُس کو کیا ہوا تھا

کہنے لگا کہ جانے میری بلا عزیزاں
احوال تھا کسی کا کچھ میں بھی سن لیا تھا

آنکھیں مری کھلیں جب جی میر کا گیا تب
دیکھے سے اُس کو ورنہ میرا بھی جی جلا تھا

سرِ[۱] دورِ فلک بھی دیکھوں اپنے روبرو ٹوٹا
کہ سنگِ محتسب سے پائے خمِ دست سبو ٹوٹا

کہاں آتے میسر تجھ سے مجھ کو خود نما اتنے
ہوا یوں اتفاق آئینہ میرے[۲] روبرو ٹوٹا

کفِ چالاک میں تیری جو تھا سر رشتہ جانوں کا
گریباں ہے مرے ہر اک ترا ٹانکا رفو ٹوٹا

طراوت تھی چمن میں سرو گویا اشکِ قمری سے
اُدھر آنکھیں مندیں اُس کی کہ ایدھر آبِ جو ٹوٹا

خطر کر تو نہ لگ چل ای صبا اُس زلف سے اتنا
بلا آوے گی تیرے سر جو اُس کا ایک مو ٹوٹا

وہ بیکس کیا کرے گر تو رہی دل ہی کی دل ہی میں
پٹ بیجا ترا دل میر سے ای آرزو ٹوٹا

آنکھوں میں جی مرا ہی ادھر یار دیکھنا
عاشق کا اپنے آخری دیدار دیکھنا

کیسا چمن کہ ہم سے اسیروں کو منع ہی
چاکِ قفس سے باغ کی دیوار دیکھنا

آنکھیں چرائیو نہ ٹک ابرِ بہار سے
میری طرف بھی دیدۂ خونبار دیکھنا

ای ہمسفر نہ آبلے کو پہنچے چشمِ تر
لاگا[۳] ہی میرے پانوں میں آ خار دیکھنا

[۱] مصرعۂ ثانی تذکرۂ میر میں اس طرح ہی۔ ع۔ بحسن اتفاق آئینہ تیرے روبرو ٹوٹا۔ نسخہ کلکتہ میں اسی طرح ہی اور نسخہ کشوری طبع اوّل میں بجائے میرے۔ تیرے ہی ۱۲۔ [۳] لاگنا بمعنی لگنا اب متروک ہی۔ ۱۲۔ آسی

قطعہ

گو توجہ سے زمانے کی جہاں میں مجھ کو
جاہ و ثروت کا میسر سر و ساماں نہ ہوا

شکر صد شکر کہ میں ذلت و خواری کے سبب
کسی عنوان میں ہم چشم عزیزاں نہ ہوا

برق مت خوشی کی اور اپنی بیاں کر صحبت
شکر کر یہ کہ مرا دھاں دل سوزاں نہ ہوا

دل بے رحم گیا شیخ لئے زیر زمیں
مر گیا پر یہ کہن گبر مسلماں نہ ہوا

کون سی رات زمانے میں گئی جس میں میر
سینۂ چاک سے میں دست و گریباں نہ ہوا

تیرے قدم سے جا لگے جس پہ مرا ہی سر لگا
گو کہ مرے ہی خون کی دست گرفتہ ہو حنا

سنگ مجھے بجاں قبول اس کے عوض ہزار بار
تا بہ کجا یہ اضطراب دل نہ ہوا ستم ہوا

کس کی ہوا کہاں کا گل ہم تو قفس میں ہیں اسیر
سیر چمن کی روز و شب تجھ کو مبارک اے صبا

کن نے بدی ہے اتنی دیر موسم گل میں ساقیا
وی بھی مے دو آتشہ زور ہی سر رہی ہوا

فصل خزاں تلک تو میں اتنا نہ تھا خراب گرد
مجھ کو جنوں ہو گیا موسم گل میں کیا بلا

جان بلب رسیدہ سے اتنا ہی کہنے پائے ہم
جاوے اگر تو یار تک کہیو ہماری بھی دعا

بوئے کباب سوختہ آتی ہی کچھ دماغ میں
ہووے نہ ہووے ای نسیم رات کسی کا دل جلا

میں تو کہا تھا تیرے تئیں آؤ سمجھ نہ ظلم کر
آخر کار بیوفا جی ہی گیا نہ میر کا

قابو خزاں سے ضعف کا گلشن میں بن گیا
دوش ہوا یہ رنگ گل یاسمن گیا

برگشتہ بخت دیکھ کہ قاصد سفر سے میں
بھیجا تھا اس کے پاس سو میرے وطن گیا

خاطر نشان ای صید فگن ہو گی کب تری
تیروں کے مارے میرا کلیجہ تو چھن گیا

یادش بخیر دشت میں مانند عنکبوت
دامن کے اپنے تار جو خاروں سے تن گیا

مارا تھا کس لباس میں عریانی نے مجھے
جس سے تہ زمین بھی میں بے کفن گیا

آئی اگر بہار تو اب ہم کو کیا صبا
ہم سے تو آشیاں بھی گیا اور چمن گیا

سرسبز ملک ہند میں ایسا ہوا کہ میر
یہ ریختہ لکھا ہوا تیرا دکن گیا

لخت جگر تو اپنے اک لخت رو چکا تھا
اشک فقط کا جھمکا آنکھوں سے لگ رہا تھا

دامن میں آج دیکھا پھر لخت میں لے آیا
ٹکڑا کوئی جگر کا پلکوں میں رہ گیا تھا

نئے طرزوں سے میخانے میں رنگِ مے جھلکتا تھا — گلابی رووتی تھی واں جام ہنس ہنس کر چھلکتا تھا
ترے اس خاک اُڑانے کی دھمک سے ای مری وحشت — کلیجہ ریگِ صحرا کا بھی دس دس گز تھلکتا تھا

اُنہی تسبیح اُس کی نزع میں کب میر کے دل سے
اُسی کے نام کی سمرن تھی جب منکا ڈھلکتا تھا

مجھ سے ہر آن مرے پاس کا آنا ہی گیا — کیا گلہ کیجے غرض اب وہ زمانا ہی گیا
چشم بن اشک ہوئی یا نہوئی یکساں ہے — خاک میں جب وہ ملا موتی کا دانا ہی گیا
بر مجنوں میں خرد مند کوئی جا نہ سکا — عاقبت سر کو قدم کر یہ دوانا ہی گیا
ہم اسیروں کو بھلا کیا جو بہار آئی نسیم — عمر گزری کہ وہ گلزار کا جانا ہی گیا

جی گیا میر کا اس لیت و لعل میں لیکن
نہ گیا ظلم ہی تیرا نہ بہانا ہی گیا

دل عشق کا ہمیشہ حریفِ نبرد تھا — اب جس جگہ کہ داغ ہے یاں آگے درد تھا
اک گرد راہ تھا پئے محمل تمام راہ — کس کا غبار تھا کہ یہ دُنبالہ گرد تھا
دل کی شکستگی نے ڈرائے رکھا ہمیں — واں چیں جبیں پہ آئی کہ یاں رنگ زرد تھا
مانندِ حرف صفحۂ ہستی سے اُٹھ گیا — دل بھی مرا جریدۂ عالم میں فرد تھا
تھا پشتہ ریگِ بادیہ اک وقت کارواں — یہ گردباد کوئی بیاباں نورد تھا
گزری مدام اُس کی جوانانِ مست میں — پیرِ مغاں بھی طرفہ کوئی پیرمرد تھا

عاشق ہیں ہم تو میر کے بھی ضبطِ عشق کے
دل جل گیا تھا اور نفس لب پہ سرد تھا

گئے قیدی ہو ہم آواز جب صیاد آ ٹوٹا — یہ ویراں آشیانے دیکھنے کو ایک میں چھوٹا
مرا رنگ اُڑ گیا جس وقت سنگِ محتسب آگے — بغل سے گر پڑا مینا و ساغر چور ہو پھوٹا
مرا وعدہ ہی آپہنچا ترے آنے کے وعدے تک — ہوا میں موت سے سچا رہا ای شوخ تو جھوٹا

کفِ جاناں سے کیا امکاں رہائی میر کوئی ہو
اچنبھا ہی جو اُس کے ہاتھ سے رنگِ حنا چھوٹا

برقع اُٹھا تھا رخ سے مرے بدگمان کا — دیکھا تو اور رنگ ہے سارے جہان کا
مت[1] مانیو کہ ہوگا یہ بے درد اہلِ دیں — گر آوے شیخ پہن کے جامہ قرآن کا

[1] ذوق دہلوی سے جھوٹ ہی جانوں کلام اُس دشمنِ ایمان کا ؛ پہن کر جامہ بھی وہ آئے اگر قرآن کا

ہونا نہ چار چشم دل اس ظلم پیشہ سے
ہشیار زینہار خبردار دیکھنا

صیاد دل ہی داغ جدائی سے رشک باغ
تجھ کو بھی ہو نصیب یہ گلزار دیکھنا

گر زمزمہ یہی ہی کوئی دن تو ہم صفیر
اس فصل ہی میں ہم کو گرفتار دیکھنا

بلبل ہمارے گل پہ نہ گستاخ کر نظر
ہو جائیگا گلے کا کہیں ہار دیکھنا

شاید ہماری خاک سے کچھ ہو بھی ای نسیم
غربال کر کے کوچۂ دلدار دیکھنا

اُس خوش نگہ کے عشق سے پرہیز کیجو میر
جاتا ہی لیکے جی ہی یہ آزار دیکھنا

غلط ہے عشق میں ای بُلہوس اندیشہ راحت کا
رواج اس ملک میں ہی درد و داغ و رنج و کلفت کا

زمین اک صفحۂ تصویر بیہوشاں سے مانا ہے
یہ مجلس جب سے ہی اچھا نہیں کچھ رنگ صحبت کا

جہاں جلوے سے اس محبوب کے یکسر لبالب ہے
نظر پیدا کر اوّل پھر تماشا دیکھ قدرت کا

ہنوز آوارۂ لیلیٰ ہے جانِ رفتہ مجنوں کی
موئے پر بھی رہا ہوتا نہیں وابستہ الفت کا

حریفِ بے جگر ہی صبر ورنہ کل کی صحبت میں
نیاز و ناز کا جھگڑا گرو تھا ایک جرأت کا

نگاہِ یاس بھی اس صید افگن پر غنیمت ہی
نہایت تنگ ہے ای صید بسمل وقت فرصت کا

خرابی دل کی اُس حد ہی کہ یہ سمجھا نہیں جاتا
کہ آبادی بھی یہاں تھی یا کہ ویرانہ تھا مدت کا

نگاہِ مست نے اُس کی لٹائین خانقہ ساری
پڑا ہی برہم اب تک کارخانہ زہد و طاعت کا

قدم ٹک دیکھ کر رکھ میر سر دل سے نکالے گا
پلک سے شوخ تر کانٹا ہے صحرائے محبت کا

جو اس شور سے میر روتا رہیگا
تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہیگا

میں وہ رونیوالا جہاں سے چلا ہوں
جسے ابر ہر سال روتا رہیگا

مجھے کام رونے سے اکثر ہی ناصح
تو کب تک مرے منہ کو دھوتا رہیگا

بس ای گریہ آنکھیں تری کیا نہیں ہیں
کہاں تک جہاں کو ڈبوتا رہیگا

مرے دل نے وہ نالہ پیدا کیا ہی
جرس کے بھی جو ہوش کھوتا رہیگا

تو یوں گالیاں غیر کو شوق سے دے
ہمیں کچھ کہے گا تو ہوتا رہیگا

بس ای میر مژگاں سے پونچھ آنسوؤں کو
تو کب تک یہ موتی پروتا رہیگا

تیرے کوچے کے رہنے والوں نے / یہیں سے کعبہ کو سلام کیا
اُس کے عیّارپن نے میرے تئیں / خادم و بندۂ و غلام کیا
حالِ بد میں مرے بتنگ آکر / آپ کو سب میں نیک نام کیا
قطعہ ہو گیا دل مرا کباب جب / درد نے قطعۂ پیام[1] کیا
دلّی کے کج کلاہ لڑکوں نے / کام عشّاق کا تمام کیا
کوئی عاشق نظر نہیں آتا / ٹوپی والوں نے قتلِ عام کیا

عشقِ خوباں کو میر میں اپنا
قبلہ و کعبہ و امام کیا

رات پیاسا تھا میرے لوہو کا / ہوں دِوانہ ترے سگِ کو کا
شعلۂ آہ جوں توں اب مجھ کو / فکر ہے اپنے ہر بنِ مو کا
ہے مرے یار کے مسوں کا رشک / کشتہ ہوں سبزۂ لبِ جو کا
بوسہ دینا مجھے نہ کر موقوف / ہے وظیفہ یہی دعا گو کا
شورِ قلقل کی ہوتی تھی مانع / ریشِ قاضی پہ رات میں تھوکا
عطر آگیں ہے بادِ صبح مگر / کھل گیا پیچ زلفِ خوشبو کا
ایک دو ہوں تو سحرِ چشم کہوں / کارخانہ ہے وہاں تو جادو کا
قطعہ میر ہر چند میں نے چاہا لیک / نہ چھپا عشقِ طفلِ بدخو کا

نام اُس کا لیا ادھر اودھر
اُڑ گیا رنگ ہی مرے رو کا

آیا تھا خانقہ میں وہ نورِ دیدگاں کا / تہ کر گیا مصلّیٰ عزلت گزیدگاں کا
آخر کو خاک ہونا درپیش ہے سبھوں کو / ٹک دیکھ منہ کدھر ہے قامت خمیدگاں کا
جو خار دشت میں ہے سو چشمِ آبلہ سے / دیکھا ہوا ہے تیری محنت کشیدگاں کا

[1] پیام سے مراد شرف الدین علیخاں پیام اکبرآبادی ہیں جس قطعہ کو میر صاحب نے پیش کیا ہے وہ قطعہ انھیں کا ہے یہ عہد محمد شاہ بادشاہ میں زندہ تھے فارسی کے شعر خوب کہتے تھے۔ اردو کے بعض شعر پتہ دیتے ہیں کہ ریختہ کے بھی اُستاد ہوں گے۔ میر نے لکھا ہے کہ میں نے اُن کو کئی بار دیکھا اُنکا ریختہ کا دیوان بھی تھا۔ اُنکی عبارت یہ ہے "شاعر قرار داد شاعران فارسی عہد خود بود، و صاحب دیوان ریختہ نیز از خاک پاک اکبرآباد است۔ بندہ اکثر ملاقات کردم چنانچہ با نجم الدین علی سلام کہ خلف الصدق اوست فقیر را اخلاص دلیست ہمیشہ اتفاق با ہم نشستن و ذکر شعر کردن و گپ زدن می افتد" ۱۲۔ آسی

خوبی کو اُس کے چہرہ کی کیا پہنچے آفتاب — ہے اس میں اُس میں فرق زمین آسمان کا
ابلہ ہے وہ جو ہووے خریدار گلرخاں — اس سودے میں صریح ہے نقصان جان کا
کچھ اور گاتے ہیں جو رقیب اُس کے روبرو — دشمن ہیں میری جان کے یہ جی ہی تان کا
تسکین اُس کی تب ہوئی جب چُپ مجھے لگی — مت پوچھ کچھ سلوک مرے بدزبان کا
یہاں بلبل اور گل پہ تو عبرت سے آنکھ کھول — گلگشت سرسری نہیں اس گلستان کا (قطعہ)
گل یادگارِ چہرۂ خوباں ہے بے خبر — مرغ چمن نشاں ہے کسو خوش زبان کا
تو برسوں میں کہے ہے ملوں گا میں میرؔ کو
یہاں کچھ کا کچھ ہے حال ابھی اُس جوان کا

مغاں مجھ مست بن پھر خندۂ ساغر نہ ہووے گا — مے گلگوں کا شیشہ ہچکیاں لیلے کے رووے گا
کیا ہے خوں مرا پامال یہ سرخی نہ چھوٹے گی — اگر قاتل تو اپنے پاؤں مہندی پانی سے دھووے گا
کوئی رہتا ہے جی بے جی ترے کوچے کے آنے سے
تبھی آسودہ ہوگا میرؔ جب جی کو کھووے گا

مجھے زنہار خوش آتا نہیں کعبہ کا ہمسایا — صنم خانہ ہی یہاں اے شیخ تونے کیوں نہ بنوایا
زہے اے عشق کی نیرنگ سازی غیر کو اُن نے — جلایا بات کہتے وھاں ہمیں مرنے کو فرمایا
بھری ہے آگ تیرے درد دل میں میرؔ ایسی تو
کہ کہتے روبرو اُس شوخ کے قاصد کا منہ آیا

نقش بیٹھے ہے کہاں خواہش آزادی کا — ننگ ہے نام رہائی ترے صیادی کا
داد دے ورنہ ابھی جان پہ کھیلوں ہوں میں — دل جلاتا نہیں دیکھا کسی فریادی کا
شہر کی سی رہی رونق اُسی کے جیتے جی — مر گیا قیس جو تھا خانہ خدا دادی کا
شیخ کیا صورتیں رہتی تھیں بھلا جب تھا دیر — رو بہ ویرانی ہوا اس کعبہ کی آبادی کا
ریختہ رتبے کو پہنچایا ہوا اس کا ہے
معتقد کون نہیں میرؔ کی اُستادی کا

کام پل میں مرا تمام کیا — غرض اُس شوخ نے بھی کام کیا
سرو و شمشاد خاک میں مل گئے — تونے گلشن میں کیوں خرام کیا
سعی طوفِ حرم نہ کی ہرگز — آستاں پر ترے مقام کیا (قطعہ)

ایک بات لچر سی بزبانِ دکنی تھی ۱۲ + ورنہ ریختہ کا ر... ۵۲ ...

گلہ نہیں ہی ہمیں اپنی جاں گدازی کا
جگر پہ زخم ہے اُس کی زباں درازی کا

سمندِ ناز نے اُس کے جہاں کیا پامال
وہی ہے اب بھی اُسے شوق ترکتازی کا

ستم ہیں تہر ہیں لونڈے شراب خانے کے
اُتار لیتے ہیں عمامہ ہر نمازی کا

اُلٹ پلٹ مری آہِ سحر کی کیا ہے کم
اگر خیال تمھیں ہووے نیزہ بازی کا

بتاؤ ہم سے کوئی آن تم سے کیا بگڑی
نہیں ہے تم کو سلیقہ زمانہ سازی کا

خدا کو کام تو سونپے ہیں ہیں نے سب لیکن
رہے ہی خوف مجھے وہاں کی بے نیازی کا

چلو ہو راہِ موافق کہے مخالف کے
طریق چھوڑ دیا تم نے دل نوازی کا

کسو کی بات نے آگے مرے نہ پایا رنگ
دلوں میں نقش ہی میری سخن طرازی کا

لبانِ خاک ہو پامال راہ خلق ای میر
رکھے ہی دل میں اگر قصد سرفرازی کا

کیا کہئے کہ خوباں نے اب ہم میں ہی کیا رکھا
اُن چشم سیاہوں نے بہتوں کو سلا رکھا

جلوہ ہی اُسی کا سب گلشن میں زمانے کے
گل پھول کو ہی اُن نے پردہ سا بنا رکھا

جوں برگِ خزاں دیدہ سب زرد ہوئے ہم تو
گرمی نے ہمیں دل کی آخر کو جلا رکھا

کہئے جو تمیز اُس کو کچھ اچھے بُرے کی ہو
دل جس کسو کا پایا چٹ اُن نے اڑا رکھا

تھی مسلکِ الفت کی مشہور خطرناکی
میں دیدۂ دانستہ کس راہ میں پا رکھا

خورشید و قمر پیارے رہتے ہیں چھپے کوئی
رخساروں کو گو تو نے برقع سے چھپا رکھا

چشمک ہی نہیں تازے شیوے یہ اُسی کے ہیں
جھمکے سے دکھا دے کر عالم کو لگا رکھا

لگنے کے لئے دل کے چھڑکا تھا نمک میں نے
سو چھاتی کے زخموں نے کیا دیر مزا رکھا

کشتے کو اس ابرو کے کیا میل[۱] ہو ہستی کی
ہیں طاق بلند اوپر جینے کو اُٹھا رکھا

قطعی ہی دلیل ای میر اُس تیغ کی بے آبی
رحم اُن نے مرے حق میں مطلق نہ روا رکھا

کام میرا بھی ترے غم میں کہوں ہو جائے گا
جب یہ کہتا ہوں تو کہتا ہے کہ ہوں ہو جائیگا

خون کم کر اب کہ کشتوں کے تو پشتے لگ گئے
قتل کرتے کرتے تیرے تئیں جنوں ہو جائیگا

[۱] میل بمعنی خواہش اب بالاتفاق مذکر ہی جیسا کہ آتش کے اس شعر میں ؎

اس گل سے عرض حال کی حسرت ہی رہ گئی ٭ کانٹے پڑے زباں میں جو میل بیاں ہوا ۱۲ آسی

اب زیرِ خاک رہنا مشکل ہے کشتگاں کو | آرام کھو چلا تو ان آرمیدگاں کا

تیرِ بلا کا ہر دم اب میر ہی نشانہ
پتھر جگر ہے اُس کے آفت رسیدگاں کا

صحرا میں سیلِ اشک مرا جا بجا پھرا | مجنوں بھی اُس کی موج میں مدت بہا پھرا
طالع جو خوب تھے نہ ہوا جاہ کچھ نصیب | سر پر مرے کروڑ برس تک ہما پھرا
آنکھیں برنگِ نقشِ قدم ہو گئیں سفید | نامے کے انتظار میں قاصد بھلا پھرا
ٹک بھی نہ مڑکے میری طرف تو نے کی نگاہ | اک عمر تیرے پیچھے میں ظالم لگا پھرا

دیر و حرم میں کیونکہ قدم رکھ سکے گا میر
ایدھر تو اُس سے بت پھرے اُودھر خدا پھرا

کس شام سے اُٹھا تھا مرے دل میں درد سا | سو ہو چلا ہوں پیشتر از صبح سرد سا
بیٹھا ہوں جوں غبار ضعیف اب گریوہ میں | پھرتا رہا ہوں گلیوں میں آوارہ گرد سا
قصدِ طریقِ عشق کیا سب نے بعدِ قیس | لیکن ہوا نہ ایک بھی اُس رہ نورد سا
حاضر یراقِ بے مزگی کس گھڑی نہیں | معشوق کچھ ہمارا ہے عاشق نبرد سا

کیا میر ہی یہی جو ترے در پہ تھا کھڑا
نمناک چشم و خشک لب و رنگ زرد سا

ترے عشق میں آگے سودا ہوا تھا | پر اتنا بھی ظالم نہ رسوا ہوا تھا
خزاں التفات اس پہ کرتی بجا تھی | یہ غنچہ چمن میں ابھی وا ہوا تھا
کہاں تھا تو اس طور آنے سے میرے | گلی میں تری کل تماشا ہوا تھا
گریباں سے تب ہاتھ اُٹھایا تھا میں نے | مری اور دامانِ صحرا ہوا تھا

زہے طالع ای میر اُن نے یہ پوچھا
کہاں تھا تو اب تک تجھے کیا ہوا تھا

آہ کی میں دلِ حیران و خفا کو سونپا | میں نے یہ غنچۂ تصویر صبا کو سونپا
تیرے کوچے میں مری خاک بھی پامال ہوئی | تھا وہ بیدرد مجھے جن نے وفا کو سونپا

اب تو جاتا ہی ہے کعبے کو تو بتخانے سے
جلد پھر پہنچیوا ے میر خدا کو سونپا

تیرے کوچے کے رہنے والوں نے / یہیں سے کعبہ کو سلام کیا
اُس کے عیارپن نے میرے تئیں / خادم و بندۂ و غلام کیا
حالِ بد میں مرے بتنگ آکر / آپ کو سب میں نیک نام کیا
قطعہ ہوگیا دل مرا اکبر جب / دردنے قطعۂ پیام[1] کیا
دلّی کے کج کلاہ لڑکوں نے / کام عشاق کا تمام کیا
کوئی عاشق نظر نہیں آتا / ٹوپی والوں نے قتلِ عام کیا
عشقِ خوباں کو میر میں اپنا / قبلہ و کعبۂ و امام کیا

رات پیاسا تھا میرے لوہو کا / ہوں دِوانہ ترے سگِ کو کا
شعلۂ آہ جوں توں اب مجھ کو / فکر ہے اپنے ہر بُنِ مو کا
ہی مرے یار کے مسوں کا رشک / کشتہ ہوں سبزۂ لبِ جو کا
بوسہ دینا مجھے نہ کر موقوف / ہے وظیفہ یہی دُعا گو کا
شورِ قلقل کی ہوتی تھی مانع / ریشِ قاضی پہ رات میں تھوکا
عطر آگیں ہے بادِ صبح مگر / کھل گیا پیچ زلفِ خوشبو کا
ایک دو ہوں تو سحرِ چشم کہوں / کارخانہ ہی وھاں تو جادو کا
قطعہ میر ہر چند میں نے چاہا لیک / نہ چھپا عشق طفلِ بدخو کا
نام اُس کا لیا ادھر اودھر / اُڑ گیا رنگ ہی مرے رو کا

آیا تھا خانقہ میں وہ نورِ دیدگاں کا / تہ کر گیا مُصلّیٰ عزلت گزیدگاں کا
آخر کو خاک ہونا درپیش ہی سبھوں کو / ٹک دیکھ مُنہ کدھر ہی قامت خمیدگاں کا
جو خار دشت میں ہی سو چشمِ آبلہ ہے / دیکھا ہوا ہی تیری محنت کشیدگاں کا

[1] پیام سے مُراد شرف الدین علیخاں پیام اکبر آبادی ہیں جس قطعہ کو میر صاحب نے پیش کیا ہی وہ قطعہ اُنھیں کا ہی یہ عہد محمد شاہ بادشاہ میں زندہ تھے فارسی کے شعر خوب کہتے تھے۔ اُردو کے بعض شعر پتہ دیتے ہیں کہ ریختہ کے بھی اُستاد ہوں گے۔" میر نے لکھا ہی کہ میں نے اُن کو کئی بار دیکھا اُنکا ریختہ کا دیوان بھی تھا۔ اُنکی عبارت یہ ہی" شاعر قرار داد شاعران فارسی عہد خود بود، وصاحب دیوان ریختہ نیز از خاک پاک اکبر آباد است۔ بندہ اکثر ملاقات کردم چنانچہ بانجم الدین علی سلام کہ خلف الصدق اوست فقیر را اخلاص دلیست ہمیشہ اتفاق باہم نشستن و ذکر شعر کردن و گپ زدن می افتد ۱۲۔ انتہیٰ

خوبی کو اُس کے چہرہ کی کیا پہنچے آفتاب
ہے اس میں اُس میں فرق زمین آسمان کا

ابلہ ہے وہ جو ہووے خریدار گل رُخاں
اس سودے میں صریح ہی نقصان جان کا

کچھ اور گاتے ہیں جو رقیب اُس کے روبرو
دشمن ہیں میری جان کے یہ جی ہی تان کا

تسکین اُس کی تب ہوئی جب چُپ مجھے لگی
مت پوچھ کچھ سلوک مرے بدزبان کا

قطعہ
یہاں بلبل اور گل پہ تو عبرت سے آنکھ کھول
گلگشت سرسری نہیں اس گلستان کا

گل یادگار چہرۂ خوباں ہے بے خبر
مرغ چمن نشاں ہے کسو خوش زبان کا

تو برسوں میں کہے ہی لوں گا میں میر
یہاں کچھ کا کچھ ہے حال ابھی اُس جوان کا

مغاں مجھ مست بن پھر خندۂ ساغر نہ ہووے گا
مے گلگوں کا شیشہ ہچکیاں لیلے کے رووے گا

کیا ہے خوں مرا پامال یہ سرخی نہ چھوٹے گی
اگر قاتل تو اپنے پاؤں سَو پانی سے دھووے گا

کوئی رہتا ہے جی بے جی ترے کوچے کے آنے سے
تبھی آسودہ ہوگا میر جب جی کو کھووے گا

مجھے زنہار خوش آتا نہیں کعبہ کا ہمسایا
صنم خانہ ہی یہاں اے شیخ تو نے کیوں نہ بنوایا

زہے اے عشق کی نیرنگ سازی غیر کو اُن نے
جلایا بات کہتے وھاں ہمیں مرنے کو فرمایا

بھری ہی آگ تیرے درد دل میں میر ایسی تو
کہ کہتے روبرو اُس شوخ کے قاصد کا منہ آیا

قفس بیٹھے ہی کہاں خواہش آزادی کا
ننگ ہی نام رہائی تری صیادی کا

داد دے ورنہ ابھی جان پہ کھیلوں ہوں میں
دل جلانا نہیں دیکھا کسی فریادی کا

شہر کی سی رہی رونق اُسی کے جیتے جی
مرگیا قیس جو تھا خانہ خدا دادی کا

شیخ کیا صورتیں رہتی تھیں بھلا جب تھا دیر
رو بہ ویرانی ہوا اس کعبہ کی آبادی کا

ریختہ رتبے کو پہنچایا ہوا اس کا ہے
معتقد کون نہیں میر کی اُستادی کا

کام پل میں مرا تمام کیا
غرض اُس شوخ نے بھی کام کیا

سرو و شمشاد خاک میں مل گئے
تو نے گلشن میں کیوں خرام کیا

قطعہ
سعی طوف حرم نہ کی ہرگز
آستاں پر ترے مقام کیا

---

۵۱ ذی رزمانا مونث بولا جاتا ہے ۱۲ ۵۲ قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ + اک بات لچر سی بزبانِ دکنی تھی ۱۲

نئے طرزوں سے میخانے میں رنگِ مے جھلکتا تھا
گلابی روتی تھی واں جام ہنس ہنس کر چھلکتا تھا

ترے اس خاک اڑانے کی دھمک سے اے مری وحشت
کلیجہ ریگِ صحرا کا بھی دس دس گز تھلکتا تھا

گئی تسبیح اس کی نزع میں کب میرؔ کے دل سے
اسی کے نام کی سمرن تھی جب منکا ڈھلکتا تھا

تجھ سے ہر آن مرے پاس کا آنا ہی گیا
کیا گلہ کیجے غرض اب وہ زمانا ہی گیا

چشم بن اشک ہوئی یا نہ ہوئی یکساں ہے
خاک میں جب وہ ملا موتی کا دانا ہی گیا

ہر مجنوں میں خرد مند کوئی جا نہ سکا
عاقبت سر کو قدم کر یہ دوانا ہی گیا

ہم اسیروں کو بھلا کیا جو بہار آئی نسیم
عمر گزری کہ وہ گلزار کا جانا ہی گیا

جی گیا میرؔ کا اس لیت و لعل میں لیکن
نہ گیا ظلم ہی تیرا نہ بہانا ہی گیا

دل عشق کا ہمیشہ حریفِ نبرد تھا
اب جس جگہ کہ داغ ہے یاں آگے درد تھا

اک گردِ راہ تھا پئے محمل تمام راہ
کس کا غبار تھا کہ یہ دُنبالہ گرد تھا

دل کی شکستگی نے ڈرائے رکھا ہمیں
واں چیں جبیں پر آئی کہ یاں رنگ زرد تھا

مانندِ حرف صفحۂ ہستی سے اٹھ گیا
دل بھی مرا جریدۂ عالم میں فرد تھا

تھا پشتہ ریگ بادیہ اک وقتِ کارواں
یہ گردباد کوئی بیاباں نورد تھا

گزری بمدام اس کی جوانانِ مست میں
پیرِ مغاں بھی طرفہ کوئی پیر مرد تھا

عاشق ہیں ہم تو میرؔ کے بھی ضبطِ عشق کے
دل جل گیا تھا اور نفس لب پہ سرد تھا

گئے قیدی ہو ہم آواز جب صیاد آ ٹوٹا
یہ ویراں آشیانے دیکھنے کو ایک میں چھوٹا

مرا رنگ اڑ گیا جس وقت سنگِ محتسب آگے
بغل سے گر پڑا مینا و ساغر چور ہو پھوٹا

مرا وعدہ ہی آ پہنچا ترے آنے کے وعدے تک
ہوا میں موت سے سچا رہا اے شوخ تو جھوٹا

کفِ جاناں سے کیا امکاں رہائی میرؔ کوئی ہو
اچنبھا ہے جو اس کے ہاتھ سے رنگِ حنا چھوٹا

برقع اٹھا تھا رخ سے مرے بدگمان کا
دیکھا تو اور رنگ ہے سارے جہان کا

مت مانیو کہ ہوگا یہ بے درد اہلِ دیں
گر آوے شیخ پہن کے جامہ قرآن کا[1]

---

[1] ذوق دہلوی — جھوٹ ہی جانیں کلام اس دشمنِ ایمان کا ؎ پہن کر جامہ بھی وہ آوے اگر قرآن کا

ہونا نہ چار چشم دل اس ظلم پیشہ سے
ہشیار زینہار خبردار دیکھنا

صیاد دل ہی داغ جدائی سے رشک باغ
تجھ کو بھی ہو نصیب یہ گلزار دیکھنا

گر زمزمہ یہی ہی کوئی دن تو ہم صفیر
اس فصل ہی میں ہم کو گرفتار دیکھنا

بلبل ہمارے گل پہ نہ گستاخ کر نظر
ہو جائیگا گلے کا کہیں ہار دیکھنا

شاید ہماری خاک سے کچھ ہو بھی ای نسیم
غربال کر کے کوچۂ دلدار دیکھنا

اُس خوش نگہ کے عشق سے پرہیز کیجو میر
جاتا ہی لیکے جی ہی یہ آزار دیکھنا

غلط ہے عشق میں ای بُلہوس اندیشہ راحت کا
رواج اس ملک میں ہی درد و داغ و رنج و کلفت کا

زمین اک صفحۂ تصویر بیہوشاں سے مانا ہے
یہ مجلس جب سے ہی اچھا نہیں کچھ رنگ صحبت کا

جہاں جلوے سے اس محبوب کے یکسر لبالب ہے
نظر پیدا کر اوّل پھر تماشا دیکھ قدرت کا

ہنوز آوارۂ لیلیٰ ہے جانِ رفتہ مجنوں کی
موئے پر بھی رہا ہوتا نہیں وابستہ الفت کا

حریفِ بے جگر ہی صبر ورنہ کل کی صحبت میں
نیاز و ناز کا جھگڑا گرو تھا ایک جرأت کا

نگاہِ یاس بھی اس صید افگن پر غنیمت ہی
نہایت تنگ ہے ای صید بسمل وقت فرصت کا

خرابی دل کی اُس حد ہی کہ یہ سمجھا نہیں جاتا
کہ آبادی بھی یہاں تھی یا کہ ویرانہ تھا مدت کا

نگاہِ مست نے اُس کی لٹائین خانقہ ساری
پڑا ہی برہم اب تک کارخانہ زہد و طاعت کا

قدم ٹک دیکھ کر رکھ میر سر دل سے نکالے گا
پلک سے شوخ تر کانٹا ہے صحرائے محبت کا

جو اس شور سے میر روتا رہیگا
تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہیگا

میں وہ رونیوالا جہاں سے چلا ہوں
جسے ابر ہر سال روتا رہیگا

مجھے کام رونے سے اکثر ہی ناصح
تو کب تک مرے منہ کو دھوتا رہیگا

بس ای گریہ آنکھیں تری کیا نہیں ہیں
کہاں تک جہاں کو ڈبوتا رہیگا

مرے دل نے وہ نالہ پیدا کیا ہی
جرس کے بھی جو ہوش کھوتا رہیگا

تو یوں گالیاں غیر کو شوق سے دے
ہمیں[1] کچھ کہے گا تو ہوتا رہیگا

بس ای میر مژگاں سے پونچھ آنسوؤں کو
تو کب تک یہ موتی پروتا رہیگا

[1] مطابق اصل

تیرے کوچے کے رہنے والوں نے
یہیں سے کعبہ کو سلام کیا

اُس کے عیار پن نے میرے تئیں
خادم و بندۂ و غلام کیا

حال بد میں مرے بتنگ آکر
آپ کو سب میں نیک نام کیا

قطعہ
ہوگیا دل مرا اسیر جب
درد نے قطعۂ پیام[1] کیا

دلی کے کج کلاہ لڑکوں نے
کام عشاق کا تمام کیا

کوئی عاشق نظر نہیں آتا
ٹوپی والوں نے قتلِ عام کیا

عشقِ خوباں کو میر میں اپنا
قبلہ و کعبۂ و امام کیا

رات پیاسا تھا میرے لوہو کا
ہوں دوانہ ترے سگِ کو کا

شعلۂ آہ جوں توں اب مجھ کو
فکر ہے اپنے ہر بنِ مو کا

ہی مرے یار کے مسوں کا رشک
کشتہ ہوں سبزۂ لبِ جو کا

بوسہ دینا مجھے نہ کر موقوف
ہے وظیفہ یہی دعا گو کا

شورِ قلقل کی ہولی تھی مانع
ریش قاضی پہ رات میں تھوکا

عطر آگیں ہے بادِ صبح مگر
کھل گیا پیچ زلفِ خوشبو کا

ایک دو ہوں تو سحر چشم کہوں
کارخانہ ہی وھاں تو جادو کا

قطعہ
میر ہر چند میں نے چاہا لیک
نہ چھپا عشق طفلِ بدخو کا

نام اُس کا لیا ادھر اودھر
اُڑ گیا رنگ ہی مرے رو کا

آیا تھا خانقہ میں وہ نورِ دیدگاں کا
تہ کر گیا مصلیٰ عزلت گزیدگاں کا

آخر کو خاک ہونا درپیش ہی سبھوں کو
ٹک دیکھ منہ کدھر ہی قامت خمیدگاں کا

جو خار دشت میں ہی سو چشمِ آبلہ سے
دیکھا ہوا ہی تیری محنت کشیدگاں کا

---

[1] پیام سے مُراد شرف الدین علیخاں پیام اکبرآبادی ہیں جس قطعہ کو میر صاحب نے پیش کیا ہی وہ قطعہ انھیں کا ہی یہ عہد محمد شاہ بادشاہ میں زندہ تھے فارسی کے شعر خوب کہتے تھے۔ اردو کے بعض شعر پتہ دیتے ہیں کہ ریختہ کے بھی اُستاد ہوں گے۔ میر نے لکھا ہی کہ میں نے اُن کو کئی بار دیکھا انکا ریختہ کا دیوان بھی تھا۔ اُنکی عبارت یہ ہی "شاعر قرارداد شاعران فارسی عہد خود بود، و صاحب دیوان ریختہ نیز از خاک پاک اکبرآباد است۔ بندہ اکثر ملاقات کردم چنانچہ با نجم الدین علی سلام کہ خلف الصدق اوست فقیر را اخلاص ولیست ہمیشہ اتفاق باہم نشستن و فکر شعر کردن و گپ زدن می افتد۔ ۱۲ - آسی

خوبی کو اُس کے چہرہ کی کیا پہنچے آفتاب — ہے اس میں اُس میں فرق زمین آسمان کا

ابلہ ہے وہ جو ہووے خریدار گلرخاں — اس سودے میں صریح ہے نقصان جان کا

کچھ اور گاتے ہیں جو رقیب اُس کے روبرو — دشمن ہیں میری جان کے یہ جی کی تان کا

تسکین اُس کی تب ہوئی جب چُپ مجھے لگی — مت پوچھ کچھ سلوک مرے بدزبان کا

قطعہ

یھاں بلبل اور گل پہ تو عبرت سے آنکھ کھول — گلگشت[۵۸] سرسری نہیں اس گلستان کا

گل یادگار چہرۂ خوباں ہے بے خبر — مرغ چمن نشاں ہے کسو خوش زبان کا

تو برسوں میں کہے ہے ملوں گا میں میر
یھاں کچھ کا کچھ ہے حال ابھی اُس جوان کا

مغاں مجھ مست بن پھر خندۂ ساغر نہ ہووے گا — مے گلگوں کا شیشہ ہچکیاں لیلے کے رووے گا

کیا ہے خوں مرا پامال یہ سرخی نہ چھوٹے گی — اگر قاتل تو اپنے پاؤں سَو پانی سے دھووے گا

کوئی رہتا ہے جی بے جی ترے کوچے کے آنے سے
تبھی آسودہ ہوگا میر جب جی کو کھووے گا

مجھے زنہار خوش آتا نہیں کعبہ کا ہمسایا — صنم خانہ ہی یھاں اے شیخ تونے کیوں نہ بنوایا

زہے اے عشق کی نیرنگ سازی غیر کو اُن نے — جلایا بات کہتے وھاں ہمیں مرنے کو فرمایا

بھری ہے آگ تیرے درد دل میں میر ایسی تو
کہ کہتے روبرو اُس شوخ کے قاصد کا منھ آیا

نقش بیٹھے ہے کہاں خواہش آزادی کا — ننگ ہے نام رہائی ترے صیادی کا

داد دے ورنہ ابھی جان پہ کھیلوں ہوں میں — دل جلانا نہیں دیکھا کسی فریادی کا

شہر کی سی رہی رونق اُسی کے جیتے جی — مرگیا قیس جو تھا خانہ خدا وادی کا

شیخ کیا صورتیں رہتی تھیں بھلا جب تھا دیر — رو بہ ویرانی ہوا اس کعبہ کی آبادی کا

ریختہ[۵۹] رتبے کو پہنچایا ہوا اس کا ہے
معتقد کون نہیں میر کی اُستادی کا

کام پل میں مرا تمام کیا — غرض اُس شوخ نے بھی کام کیا

سرو و شمشاد خاک میں مل گئے — تو نے گلشن میں کیوں خرام کیا

قطعہ

سعی طوفِ حرم نہ کی ہرگز — آستاں پر ترے مقام کیا

۵۸ فی زمانا مونث بولا جاتا ہے ۱۲ ۵۹ قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ + اک بات لچر سی بزبانِ دکنی تھی ۱۲

گلہ نہیں ہے ہمیں اپنی جاں گدازی کا
جگر پہ زخم ہے اُس کی زباں درازی کا

سمندِ ناز نے اُس کے جہاں کیا پامال
وہی ہے اب بھی اُسے شوق ترکتازی کا

ستم ہیں قہر ہیں لونڈے شراب خانے کے
اُتار لیتے ہیں عمامہ ہر نمازی کا

اُلٹ پلٹ مری آہِ سحر کی کیا ہے کم
اگر خیال تمھیں ہووے نیزہ بازی کا

بتاؤ ہم سے کوئی آن تم سے کیا بگڑی
نہیں ہے تم کو سلیقہ زمانہ سازی کا

خدا کو کام تو سونپے ہیں میں نے سب لیکن
رہے ہے خوف مجھے واں کی بے نیازی کا

چلو ہو راہِ موافق کہے مخالف کے
طریق چھوڑ دیا تم نے دل نوازی کا

کسو کی بات نے آگے مرے نہ پایا رنگ
دلوں میں نقش ہے میری سخن طرازی کا

بسانِ خاک ہو پامال راہِ خلق اے میر
رکھے ہے دل میں اگر قصد سرفرازی کا

کیا کہئے کہ خوباں نے اب ہم میں ہے کیا رکھا
اُن چشم سیاہوں نے بہتوں کو سلا رکھا

جلوہ ہے اُسی کا سب گلشن میں زمانے کے
گل پھول کو ہے اُن نے پردہ سا بنا رکھا

جوں برگِ خزاں دیدہ سب زرد ہوئے ہم تو
گرمی نے ہمیں دل کی آخر کو جلا رکھا

کہئے جو تمیز اُس کو کچھ اچھے برے کی ہو
دل جس کسو کا پایا چٹ اُن نے اُڑا رکھا

تھی مسلکِ الفت کی مشہور خطرناکی
میں دیدہ و دانستہ کس راہ میں پا رکھا

خورشید و قمر پیارے رہتے ہیں چھپے کوئی
رخساروں کو گو تو نے برقع سے چھپا رکھا

چشمک ہی نہیں تازے شیوے یہ اُسی کے ہیں
جھمکے سے دکھا دے کر عالم کو لگا رکھا

لگنے کے لیے دل کے چھڑکا تھا نمک میں نے
سو چھاتی کے زخموں نے کی دیر مزا رکھا

کشتے کو اس ابرو کے کیا میل[1] ہو ہستی کی
میں طاق بلند اوپر جینے کو اُٹھا رکھا

قطعی ہے دلیل اے میر اُس تیغ کی بے آبی
رحم اُن نے مرے حق میں مطلق نہ روا رکھا

کام میرا بھی ترے غم میں کہوں ہو جائے گا
جب یہ کہتا ہوں تو کہتا ہے کہ ہوں ہو جائیگا

خون کم کر اب کہ کشتوں کے تو پشتے لگ گئے
قتل کرتے کرتے تیرے تئیں جنوں ہو جائیگا

[1] میل بمعنی خواہش اب بالاتفاق مذکر ہے جیسا کہ آتش کے اس شعر میں ہے

اس گل سے عرضِ حال کی حسرت ہی رہ گئی ⁂ کانٹے پڑے زباں میں جو میل بیاں ہوا ۱۲ آسی

اب زیرِ خاک رہنا مشکل ہے کشتگاں کو | آرام کھو چلا تو ان آرمیدگاں کا

تیرِ بلا کا ہر دم اب میر ہے نشانا
پتھر جگر ہے اُس کے آفت رسیدگاں کا

صحرا میں سیلِ اشک مرا جا بجا پھرا | مجنوں بھی اُس کی موج میں مدت بہا پھرا
طالع جو خوب تھے نہ ہوا جاہ کچھ نصیب | سر پر مرے کروڑ برس تک ہما پھرا
آنکھیں برنگِ نقشِ قدم ہو گئیں سفید | نامے کے انتظار میں قاصد بھلا پھرا
ٹک بھی نہ مڑ کے میری طرف تو نے کی نگاہ | اک عمر تیرے پیچھے میں ظالم لگا پھرا

دیر و حرم میں کیونکہ قدم رکھ سکے گا میر
ایدھر تو اُس سے بُت پھرے اُودھر خدا پھرا

کس شام سے اُٹھا تھا مرے دل میں درد سا | سو ہو چلا ہوں پیشتر از صبح سرد سا
بیٹھا ہوں جوں غبارِ ضعیف اب گرنے میں | پھرتا رہا ہوں گلیوں میں آوارہ گرد سا
قصدِ طریقِ عشق کیا سب نے بعدِ قیس | لیکن ہوا نہ ایک بھی اُس رہ نورد سا
حاضر یراق بیمزگی کس گھڑی نہیں | معشوق کچھ ہمارا ہے عاشق نبرد سا

کیا میر ہی یہی جو ترے در پہ تھا کھڑا
نمناک چشم و خشک لب و رنگ زرد سا

ترے عشق میں آگے سودا ہوا تھا | پر اتنا بھی ظالم نہ رسوا ہوا تھا
خزاں التفات اس پہ کرتی بجا تھی | یہ غنچہ چمن میں ابھی وا ہوا تھا
کہاں تھا تو اس طور آنے سے میرے | گلی میں تری کل تماشا ہوا تھا
گریباں سے تب ہاتھ اُٹھایا تھا میں نے | مری اور دامانِ صحرا ہوا تھا

زہے طالع اے میر اُن نے یہ پوچھا
کہاں تھا تو اب تک تجھے کیا ہوا تھا

آہ کی میں دلِ حیران و خفا کو سونپا | میں نے یہ غنچۂ تصویر صبا کو سونپا
تیرے کوچے میں مری خاک بھی پامال ہوئی | تھا وہ بیدرد مجھے جن نے وفا کو سونپا

اب تو جاتا ہی ہے کعبے کو تو بتخانے سے
جلد پھر پہنچیو اے میر خدا کو سونپا

مدت رہیگی یاد ترے چہرے کی جھلک
جلوے کو جس نے ماہ کے جی سے بھلا دیا

ہم نے تو سادگی سے کیا جی کا بھی زیاں
دل جو دیا تھا سو تو دیا سر جدا دیا

بوئے کباب سوختہ آئی دماغ میں
شاید جگر بھی آتشِ غم نے جلا دیا

تکلیف دردِ دل کی عبث ہمنشیں نے لی
دردِ سخن نے میرے سبھوں کو رلا دیا

اُن نے تو تیغ کھینچی تھی پر جی چلا کے میر
ہم نے بھی ایک دم میں تماشا دکھا دیا

ردیف بائے موحدہ

رکھتا ہے ہم سے وعدہ ملنے کا یار ہر شب
سو جاتے ہیں ولیکن بختِ کنار ہر شب

مدت ہوئی کہ اب تو ہم سے جدا رکھے ہے
اُس آفتاب رو کو یہ روزگار ہر شب

دیکھیں ہیں راہ کس کی یارب کہ اختروں کی
رہتی ہیں باز آنکھیں چندیں ہزار ہر شب

دھوکے ترے کسو دن میں جان دے رہونگا
کرتا ہے ماہ میرے گھر سے گزار ہر شب

دل کی کدورت اپنے اک شب بیاں ہوئی تھی
رہتا ہے آسماں پر تب سے غبار ہر شب

کس کے لگا ہے تازہ تیرِ نگاہ اُس کا
اک آہ میرے دل کی ہوتی ہے پار ہر شب

مجلس میں میں نے اپنا سوزِ جگر کہا تھا
روتی ہے شمع تب سے بے اختیار ہر شب

مایوسِ وصل اُس کے کیا سادہ مردماں ہیں
گزرے ہے میر اُن کو امیدوار ہر شب

اب وہ نہیں کہ آنکھیں تھیں پُرآب روز و شب
ٹپکا کرے ہے آنکھوں سے خونناب روز و شب

اک وقت رونے کا تھا ہمیں بھی خیال سا
آتے تھے آنکھوں سے چلے سیلاب روز و شب

اُس کیلئے نہ پھرتے تھے ہم خاک چھانتے
رہتا تھا پاس وہ درِ نایاب روز و شب

قدرت تو دیکھ عشق کی مجھ سے ضعیف کو
رکھتا ہے شاد بے خور و بے خواب روز و شب

سجدہ اُس آستاں کا نہیں یوں ہوا نصیب
رگڑا ہے سر میانۂ محراب روز و شب

اب رسم ربط اُٹھ ہی گئی ورنہ پیش ازیں
بیٹھے ہی رہتے تھے بہم احباب روز و شب

دل کس کے رو و مو سے لگایا ہے میر نے
پاتے ہیں اُس جوان کو بیتاب روز و شب

اُس شکار اندازِ خونیں کا نہیں آیا مزاج
ورنہ آہوئے حرم، صیدِ زبوں ہو جائیگا

بزمِ عشرت میں ملامت ہم نگوں بختوں کے تئیں
جوں حبابِ بادہ ساغر سرنگوں ہو جائیگا

کیا کہوں میں میرؔ اُس عاشق ستم محبوب کو
طور پر اُس کے کسو دن کوئی خوں ہو جائیگا

سینہ دشنوں سے چاک تا نہ ہوا
دل جو عقدہ تھا سخت وا نہ ہوا

سب گئے ہوش و صبر و تاب و تواں
دل سے اک داغ ہی جدا نہ ہوا

ظلم و جور و جفا ستم بیداد
عشق میں تیرے ہم پہ کیا نہ ہوا

ہم تو ناکام ہی جہاں میں رہے
یہاں کبھو اپنا مدعا نہ ہوا

میرؔ افسوس وہ کہ جو کوئی
اُس کے دروازے کا گدا نہ ہوا

یار عجب طرح نگہ کر گیا
دیکھنا وہ دل میں جگہ کر گیا

تنگ قبائی کا سماں یار کی
پیرہن غنچہ کو تہ کر گیا

جانا ہی اس بزم سے آیا تو کیا
کوئی گھڑی گو کہ تو رہ کر گیا

وصفِ خط و خال میں خوباں کے میرؔ
نامۂ اعمال سیہ کر گیا

آہِ سحر نے سوزشِ دل کو مٹا دیا
اس باد نے ہمیں تو دیا سا بجھا دیا

سمجھی نہ بادِ صبح کہ آکر اُٹھا دیا
اس فتنۂ زمانہ کو ناحق جگا دیا

پوشیدہ رازِ عشق چلا جائے تھا سو آج
بے طاقتی نے دل کی وہ پردہ اُٹھا دیا

اس موج خیز دہر میں ہم کو قضا نے آہ
پانی کے بلبلے کی طرح سے مٹا دیا

تھی لاگ اُس کی تیغ کو ہم سے سو عشق نے
دونوں کو معرکے میں گلے سے ملا دیا

سب شورِ ما و من کو لئے سر میں مر گئے
یاروں کو اس فسانے نے آخر سلا دیا

آوارگانِ عشق کا پوچھا جو میں نشاں
مشتِ غبار لیکے صبا نے اُڑا دیا

اجزا بدن کے جتنے تھے پانی ہو بہ گئے
آخر گدازِ عشق نے ہم کو بہا دیا

کیا کچھ نہ تھا ازل میں نہ طالع جو تھے درست
ہم کو دلِ شکستہ قضا نے دلا دیا

گویا محاسبہ مجھے دینا تھا عشق کا
اس طور دل سی چیز کو میں نے لگا دیا

دیکھ خورشید تجھ کو اے محبوب
عرق شرم میں گیا ہے ڈوب

آئی کنعاں سے بادِ مصر ولے
نہ گئی تا بکلبۂ یعقوبؑ

بن عصا شیخ یک قدم نہ رکھے
راہ چلتا نہیں یہ خرِ بے چوب

اس لئے عشق میں نے چھوڑا تھا
تو بھی کہنے لگا بُرا کیا خوب

پی ہوے تو لہو پیا ہوں میں
محتسب آنکھوں پر ہے کچھ آشوب

میر شاعر بھی زور کوئی تھا
دیکھتے ہو نہ بات کا اسلوب

ردیف تا

روز نہ ملوں یار سے یا شب ہو ملاقات
کیا فکر کروں میں کہ کسو ڈھب ہو ملاقات

نے بخت کی یاری ہے نہ کچھ جذب ہے کامل
وہ آپھی ملے تو ملے پھر جب ہو ملاقات

دوری میں کروں نالہ و فریاد کہاں تک
اک بار تو اُس شوخ سے یارب ہو ملاقات

جاتی ہے غشی بھی کبھو آتے ہیں بخود بھی
کچھ لطف اُٹھے بارے اگر اب ہو ملاقات

وحشت ہے بہت میر کو مل آیئے چل کر
کیا جانیے پھر یاں سے گئے کب ہو ملاقات

سب ہوئے نادم پئے تدبیر ہو جاناں سمیت
تیر تو نکلا مرے سینے سے لیکن جاں سمیت

تنگ ہو جاویگا عرصہ خفتگانِ خاک پر
گر ہمیں زیرِ زمیں سونپا دلِ نالاں سمیت

باغ کر دکھلائیں گے دامانِ دشتِ حشر کو
ہم بھی وہاں آئے اگر مژگانِ خوں افشاں سمیت

قیس و فرہاد اور وامق عاقبت جی سے گئے
سب کو مارا عشق نے مجھ خانماں ویراں سمیت

اٹھ گیا پردہ نصیحت گر کے لگ پڑنے سے میر
پھاڑ ڈالا میں گریباں رات کو داماں سمیت

پلکوں پہ تھے پارۂ جگر رات
ہم آنکھوں میں لے گئے بسر رات

اک دن تو وفا بھی کرتے وعدہ
گزری ہے اُمیدوار ہر رات

مکھڑے سے اُٹھائیں اُن نے زلفیں
جانا بھی نہ ہم گئے کدھر رات

تو پاس نہیں ہوا تو روتے
رہ رہ گئی ہے پہر پہر رات

رویا کئے ہیں غم سے ترے ہم تمام شب
پڑتی رہی ہے زور سے شبنم تمام شب

رُکنے سے دل کے آج بچا ہوں تو اب جیا
چھاتی ہی میں رہا ہے مرا دم تمام شب

یہ اتصال اشک جگر سوز کا کہاں
روتی ہے یوں تو شمع بھی کم کم تمام شب

قطعہ
شکوہ عبث ہے میر کہ کڑھتے ہیں سارے دن
یا دل کا حال رہتا ہے درہم تمام شب

گزرا کسے جہاں میں خوشی سے تمام روز
کس کی کٹی زمانے میں بے غم تمام شب

ہوتا نہ پائے سرو جو جوئے چمن میں آب
تو کون قمریوں کے چُواتا دہن میں آب

اس پہ لہو کے پیاسے ہیں تیرے لبوں کے رشک
اک نام کو رہی ہے عقیق یمن میں آب

شب سوزِ دل کہا تھا میں مجلس میں شمع سے
روئی ہے یہاں تلک کہ بھرا ہے لگن میں آب

دل لیگیا تھا زیرِ زمیں میں بھرا ہوا
آتا ہے ہر مسام سے میرے کفن میں آب

دریا میں قطرہ قطرہ ہے آب گہر کہیں
ہے میر موج زن ترے ہر اک سخن میں آب

کس کی مسجد، کیسے بتخانے کہاں کے شیخ و شاب
ایک گردش میں تری چشمِ سیہ کے سب خراب

تو کہاں اُس کی کمر کیدھر نکر یو اضطراب
ای رگِ گل دیکھیو کھاتی ہے جو تو پیچ و تاب

موند رکھنا چشم کا ہستی میں عینِ دید ہے
کچھ نہیں آتا نظر جب آنکھ کھولے ہے حباب

تو ہو اور دُنیا ہو ساقی میں ہوں مستی ہو مدام
پر بطِ صہبا نکالے اُڑ چلے رنگ شراب

ہے ملاحت تیرے باعث شور پر تجھ سے نمک
ٹک تو رہ پیری چلی آتی ہے ای عہدِ شباب

کب تھی یہ بے جُرأتی شایانِ آہوئے حرم
ذبح ہوتا تیغ سے یا آگ میں ہوتا کباب

کیا ہو رنگِ رفتہ کیا قاصد ہو جس کو خط دیا
جز جوابِ صاف اُس سے کب کوئی لایا جواب

قطعہ
وائے اس جینے پر ای مستی کہ دَورِ چرخ میں
جامِ مے پر گردش آوے اور میخانہ خراب

چوب حرفی بن الف بے میں نہیں پہچانتا
ہوں میں ابجد خواں شناسائی کو مجھ سے کیا حساب

قطعہ
مت[1] ڈھلک مژگاں سے اب تو ای سرشکِ آبدار
مفت میں جاتی رہیگی تیری موتی کی سی آب

کچھ نہیں بحرِ جہاں کی موج پر مت بھول میر
دُور سے دریا نظر آتا ہے لیکن ہے سراب

[1] یہ شعر تذکرۂ میر میں اس طرح ہے ؎ مت ڈھلک مژگاں سے میرے ای سرشکِ آبدار ؛ مفت ہی جاتی رہے گی تیری موتی کی سی آب

ایک دو چشمک ادھر گردشِ ساغر کہ مُدام
سر چڑھی رہتی ہے یہ گردشِ ایام بہت

دل خراشی و جگر چاکی و خون افشانی
ہوں تو ناکام پہ ہوتے ہیں مجھے کام بہت

پھر نہ آئے جو ہوئے خاک میں جا آسودہ
غالباً زیرِ زمیں میرؔ ہے آرام بہت

کیا کہیں اپنی اُس کی شب کی بات
کہئے ہووے جو کچھ بھی ڈھب کی بات

اب تو چپ لگ گئی ہے حیرت سے
پھر کھلے گی زبان جب کی بات

نکتہ دانانِ رفتہ کی نہ کہو
بات وہ ہے جو ہووے اب کی بات

کس کا روئے سخن نہیں ہے اُدھر
ہے نظر میں ہمارے سب کی بات

ظلم ہے قہر ہے قیامت ہے
غصے میں اُس کے زیرِ لب کی بات

کہتے ہیں آگے تھا بتوں میں رحم
ہے خدا جانئے یہ کب کی بات

گو کہ آتش زباں تھے آگے میرؔ[1]
اب کی کہئے گئی وہ تب کی بات

ہر صبحدم کروں ہوں الحاح یا انابت
تو بھی مری دعا سے ملتی نہیں اجابت

مت لے حساب طاقت اے ضعف مجھ سے ظالم
لائق نہیں ہے تیرے یہ کونسی ہے بابت

کیا کیا[2] لکھا ہے میں نے وہ میرؔ کیا کہے گا
گم ہووے نامہ بر سے یارب مری کتابت

ردیف تائے ہندی

نہ پایا دل ہوا روزِ سیہ سے جس کا جالٹ پٹ
کسو کی زلف ڈھونڈی ہو بہو کاکل کو سب لٹ لٹ

تو کن نیندوں پڑا سوتا تھا دروازہ کو موندے شب
میں چوکھٹ پر تری کرتا رہا سر کو پٹک کھٹ کھٹ

چٹیں[3] لگتی ہیں دل پر بلبلوں کے باغباں تو جو
چمن میں توڑتا ہے ہر سحر کلیوں کے تئیں چٹ چٹ

ترے ہجراں کی بیماری میں میرؔ ناتواں کو شب
ہوا ہے خواب سونا آہ اس کروٹ سے اُس کروٹ

[1] مرزا غالبؔ ~ سخن میں خامۂ غالب کی آتش افشانی ؛ یقین ہے ہم کو بھی لیکن اب اس میں دم کیا ہے۔
[2] خط لکھ کے اور بھی میں پڑا پیچ و تاب میں ؛ کیا جانے لکھ دیا اُسے کیا اضطراب میں (ذوقؔ) [3] چٹیں یعنی چوٹیں تخفیف واو متروک ہے

کیا دن تھے کہ خون تھا جگر میں / رو اُٹھتے تھے بیٹھ دو پہر رات
وھاں تم تو بناتے ہی رہے زلف / عاشق کی بھی یہاں گئی گزر رات
ساقی کے جو آنے کی خبر تھی / گزری ہمیں ساری بے خبر رات
کیا سوزِ جگر کہوں میں ہمدم / آیا جو سخن زبان پر رات
صحبت یہ رہی کہ شمع روئی / لے شام سے تا دمِ سحر رات
کھلتی ہی جب آنکھ شب کو تجھ بن / کٹتی نہیں آتی پھر نظر رات
دن وصل کا یوں کٹا کہے تو / کاٹی ہے جدائی کی مگر رات
کل تھی شبِ وصل اک ادا پر / اُس کی گئے ہوتے ہم تو مر رات
جاگے تھے ہمارے بختِ خفتہ / پہنچا تھا بہم وہ اپنے گھر رات
کرنے لگا پشت چشمِ نازک / سوتے سے اُٹھا جو چونک کر رات
تھی صبح جو منہ کو کھول دیتا / ہر چند کہ تب تھی اک پہر رات

پر زلفوں میں مُنہ چھُپا کے پوچھا
اب ہو وے گی میر کس قدر رات

جیتا ہی نہیں ہو جسے آزارِ محبت / مایوس ہوں میں بھی کہ ہوں بیمارِ محبت
امکان نہیں جیتے جی ہو قید سے آزاد / مر جائے تبھی چھوٹے گرفتارِ محبت
تقصیر نہ خوباں کی نہ جلاد کا کچھ جرم / تھا دشمنِ جانی مرا اقرارِ محبت
ہر جنس کے خواہاں ملے بازارِ جہاں میں / لیکن نہ ملا کوئی خریدارِ محبت
اس راز کو رکھ جی ہی میں تا جی بچے تیرا / زنہار جو کرتا ہو تو اظہارِ محبت
ہر نقش قدم پر ترے سر بیچے ہیں عاشق / ٹک سیر تو کر آج تو بازارِ محبت
کچھ مست ہیں ہم دیدۂ پُر خون جگر سے / آیا ہی ہے ساغرِ سرشارِ محبت
بیکار نہ رہ عشق میں تو رونے سے ہرگز / یہ گریہ ہی ہے آبِ رُخِ کارِ محبت

مجھ سا ہی ہو مجنوں بھی یہ کب مانے ہے عاقل
ہر سر نہیں اے میر سزاوارِ محبت

جی میں ہے یادِ رخ و زلفِ سیہ فام بہت / رونا آتا ہے مجھے ہر سحر و شام بہت
دستِ صیاد تلک بھی نہ میں پہنچا جیتا / بیقراری نے لیا مجھ کو تہِ دام بہت

جی لیا بوسہ رخسارِ مخطط دے کر
عاقبت اُن نے ہمیں زہر دیا پان کے بیچ

دعویٔ خوش دہنی اُس سے اسی مُنہ پر گل
سر تو ٹک ڈال کے دیکھ اپنے گریبان کے بیچ

کان رکھ رکھ کے بہت دردِ دل میرؔ کو تم
سنتے تو ہو پہ کہیں درد نہ ہو کان کے بیچ

کر نہ تاخیر تو اک شب کی ملاقات کے بیچ
دن نہ پھر جائیں گے عشاق کے اک رات کے بیچ

حرف زن مت ہو کسی سے تو کہ اے آفتِ شہر
جاتے رہتے ہیں ہزاروں کے سر اک بات کے بیچ

میری طاعت کو قبول آہ کہاں تک ہوگا
سبحہ اک ہاتھ میں ہے جام ہے اک ہات کے بیچ

سُرمگیں چشم پہ اُس شوخ کے زنہار نہ جا
ہے سیاہی مژہ میں وہ نگہ گھات کے بیچ

بیٹھیں ہم اُس کے سگِ کو کے برابر کیونکر
کرتے ہیں ایسی معیشت تو مساوات کے بیچ

قطعہ
تاب و طاقت کو تو رخصت ہوئے مدت گزری
پند گو یوں ہی نکر اب خلل اوقات کے بیچ

زندگی کسکے بھروسے پہ محبت میں کروں
ایک دل غمزدہ ہے سو بھی ہے آفات کے بیچ

بے مے و مغبچہ اک دم نہ رہا تھا کہ رہا
اب تلک میرؔ کا تکیہ ہے خرابات کے بیچ

ساتھ ہو اک بیکسی کے عالمِ ہستی کے بیچ
باز خواہ خوں ہے میرا گو اسی بستی کے بیچ

عرش پر ہے ہم نمد پوشانِ اُلفت کا دماغ
اوج دولت کا سا ہے یہاں فقر کی پستی کے بیچ

ہم سیہ کاروں کا ہنسنا دہ ہے میخانے کی اور
آ گئے ہیں میرؔ مسجد میں چلے مستی کے بیچ

ردیف حاے حطی

ہونے لگا گدازِ غمِ یار بے طرح
رہنے لگا ہے دل کو اب آزار بے طرح

اب کچھ طرح نہیں ہے کہ ہم غم زدے ہوں شاد
کہنے لگا ہے منہ سے ستمگار بے طرح

جاں بر تمھارے ہاتھ سے ہوگا نہ اب کوئی
رکھنے لگے ہو ہاتھ میں تلوار بے طرح

فتنہ اُٹھیگا ورنہ نکل گھر سے تو شتاب
بیٹھے ہیں آ کے طالبِ دیدار بے طرح

لوہو میں شور بور ہے دامان و جیبِ میرؔ
بپھرا ہے آج دیدۂ خونبار بے طرح

سنہ موافق اصل ۱۲

ردیف جیم

آئے ہیں میرؔ منھ کو بنائے جفا سے آج
شاید بگڑ گئی ہے کچھ اُس بیوفا سے آج

واشد ہوئی نہ دل کو فقیروں کے بھی ملے
کھلتی نہیں گرہ یہ کسو کی دعا سے آج

جیتے ہیں اختیار نہیں ورنہ ہمنشیں
ہم چاہتے ہیں موت تو اپنی خدا سے آج

ساقی ٹک ایک موسمِ گل کی طرف بھی دیکھ
ٹپکا پڑے ہے رنگ چمن میں ہوا سے آج

تھا جی میں اس سے ملیے تو کیا کیا نہ کہیے میرؔ
پر کچھ کہا گیا نہ غمِ دل حیا سے آج

ردیف جیم فارسی

کاش اٹھیں ہم بھی گنہگاروں کے بیچ
ہوں جو رحمت کے سزاواروں کے بیچ

جی سدا ان ابروؤں ہی میں رہا
کی بسر ہم عمر تلواروں کے بیچ

چشم ہو تو آئینہ خانہ ہے دہر
منھ نظر آتا ہے دیواروں کے بیچ

ہیں عناصر کی یہ صورت بازیاں
شعبدے کیا کیا ہیں ان چاروں کے بیچ

جب سے لے نکلا ہے تو یہ جنسِ حسن
پڑ گئی ہے دھوم بازاروں کے بیچ

عاشقی و بے کسی و رفتگی
جی رہا کب ایسے آزاروں کے بیچ

جو سرشک اُس ماہ بن جھمکے ہے شب
وہ چمک کاہے کو ہے تاروں کے بیچ

اُس کے آتشناک رخساروں بغیر
لوٹیے یوں کب تک انگاروں کے بیچ

بیٹھنا غیروں میں کب ہے ننگِ یار
پھول گل ہوتے ہی ہیں خاروں کے بیچ

یارو مت اُس کا فریبِ مہر کھاؤ
میرؔ بھی تھے اُس کے ہی یاروں کے بیچ

فائدہ مصر میں یوسف رہے زنداں کے بیچ
بھیج دے کیوں نہ زلیخا اُسے کنعاں کے بیچ

تو نہ تھا مُردنِ دشوار میں عاشق کی آہ
حسرتیں کتنی گرہ تھیں رمق اکجان کے بیچ

چشم بد دور کہ کچھ رنگ ہے اب گریہ پر
خون جھمکے ہے پڑا دیدۂ گریاں کے بیچ

حالِ گلزارِ زمانہ کا ہے جیسے کہ شفق
رنگ کچھ اور ہی ہو جائے ہے اک آن کے بیچ

تاک کی چھاؤں میں جوں مست پڑی سوتی ہیں
اینڈتی ہیں نگہیں سایۂ مژگاں کے بیچ

نہ پڑھا خط کو یا پڑھا قاصد
آخرِ کار کیا کہا قاصد

کوئی پہنچا نہ خط مرا اُس تک
میرے طالع ہیں نارسا قاصد

سرنوشتِ زبوں سے زرِ ہو خاک
راہ کھوٹی نہ کر تو جا قاصد

گر پڑا خط تو تجھ پہ حرف نہیں
یہ بھی میرا ہی تھا لکھا قاصد

یہ تو رونا ہمیشہ ہے مجھ کو
پھر کبھو پھر کبھو بھلا قاصد

اب غرض خامُشی ہی بہتر ہے
کیا کہوں تجھ سے ماجرا قاصد

شبِ کتابت کے وقت گریہ میں
جو لکھا تھا سو بہ گیا قاصد

کہنہ قصہ لکھا کروں تا کے
بھیجا کب تک کروں نیا قاصد

ہے طلسمات اُس کا کوچہ تو
جو گیا سو وہیں رہا قاصد

باد پر ہے برات جس کا جواب
اُس کو گزرے ہیں سالہا قاصد

نامہ میرؔ کو اُڑاتا ہے
کاغذِ باد گر گیا قاصد

ہوں رہگزر میں تیرے ہر نقشِ پا ہے شاہد
اُڑتی ہے خاک میری بادِ صبا ہے شاہد

طوفِ حرم میں بھی میں بھولا نہ تجھ کو اے بت
آتا تھا یاد تو ہی میرا خدا ہے شاہد

شرمندہ اثر کچھ باطن مرا نہیں ہے
وقتِ سحر ہے شاہد دستِ دُعا ہے شاہد

نالے ہیں اپنے پنہاں میں بھی ہوں ساتھ تیرے
شاہد ہے گردِ محمل، شورِ درا ہے شاہد

ایذا ہی میرؔ پہ جو وہ تو کہوں ہی گا میں
یارے یہ کہہ کہ تیری خاطر میں کیا ہے شاہد

اے گلِ نو دمیدہ کے مانند
ہے تو کس آفریدہ کے مانند

ہم اُمیدِ وفا پہ تیری ہوئے
غنچۂ دیر چیدہ کے مانند

خاک کو میری سیر کرکے پھرا
وہ غزالِ رمیدہ کے مانند

سر اُٹھاتے ہی ہو گئے پامال
سبزۂ نو دمیدہ کے مانند

نہ کٹے رات ہجر کی جو نہ ہو
نالہ تیغِ کشیدہ کے مانند

ہم گرفتارِ حال ہیں اپنے
طائرِ پر بریدہ کے مانند

دل تڑپتا ہے اشکِ خونیں میں
صیدِ در خوں طپیدہ کے مانند

خاطر کرے ہی جمع وہ ہر بار ایک طرح — کرتا ہے چرخ مجھ سے نئے یار ایک طرح
میں اور قیس و کوہ کن اب جو زباں پہ ہیں — مارے گئے ہیں سب یہ گنہگار ایک طرح
منظور اُس کو پردے میں ہیں بے حجابیاں — کس سے ہوا دُچار وہ عیار ایک طرح
سب طرحیں اس کی اپنی نظر میں تھیں کیا کہیں — پر ہم بھی ہو گئے ہیں گرفتار ایک طرح
گھر اُس کے جا کے آتے ہیں پامال ہو کے ہم — کرئیے مکاں ہی اب سر بازار ایک طرح
گہ گل ہی گاہ رنگ گہے باغ کی ہے بو — قطعہ آتا نہیں نظر وہ طرح دار ایک طرح
نیرنگِ حسنِ دوست سے کر آنکھیں آشنا — ممکن نہیں وگرنہ ہو دیدار ایک طرح

ہر طرح تو ذلیل ہی رکھتا ہے میرؔ کو
ہوتا ہے عاشقی میں کوئی خوار ایک طرح

ردیف دال مہملہ

کیا ہی یہ جو گاہے آجاتی ہی آندھی کوئی زرد — یا بگولا جو کوئی سر کھینچے ہے صحرا نورد
شوق میں یہ محملِ لیلیٰ کے ہو کر بیقرار — اک نہادِ وادیِ مجنوں سے اُٹھ چلتی ہی گرد
وجہ دم سردی نہیں میں جانتا رونے کے بعد — مینھ برسا ہی کہیں شاید ہوا آتی ہی سرد
باز رکھا باطنِ پیرِ مغاں نے شیخ کو — مل گیا اُس پیرزن کو غیب سے اک پیرمرد

ایک شب پہلو کیا تھا گرم اُن نے تیرے ساتھ
رات کو رہتا ہی اکثر میرؔ کے پہلو میں درد

آوے گی میری قبر سے آواز میرے بعد — اُبھریں گے عشقِ دل سے ترے راز میرے بعد
جینا مرا تو تجھ کو غنیمت ہے نا سمجھ — کھینچے گا کون پھر یہ ترے ناز میرے بعد
شمعِ مزار اور یہ سوزِ جگر مرا — ہر شب کریں گے زندگی ناساز میرے بعد
حسرت ہی اُس کے دیکھنے کی دل میں بے قیاس — اغلب کہ میری آنکھیں رہیں باز میرے بعد
کرتا ہوں میں جو نالے سرانجام باغ میں — مُنہ دیکھو پھر کریں گے ہم آواز میرے بعد
بن گل موا ہی میں تو پہ تو جا کے لوٹیو — صحنِ چمن میں اے پر پرواز میرے بعد

بیٹھا ہوں میرؔ مرنے کو اپنے میں مستعد
پیدا نہ ہوں گے مجھ سے بھی جانباز میرے بعد

خوب ہے خاک سے بزرگوں کی — قطعہ
چاہنا تو مرے تئیں امداد
پر مروت کہاں کی ہے ای میر
تو ہی مجھ دل جلے کو کر ارشاد

نامرادی ہو جس پہ پروانہ
وہ جلاتا پھرے چراغِ مُراد

ردیف رائے مہملہ

اُودھر تلک ہی چرخ کے مشکل ہے ٹک گزر
اے آہ پھر اثر تو ہے برچھی کی چوٹ پر[1]

دھڑکا تھا دل طپیدنِ شب سے سو آج صبح
دیکھا وہی کہ آنسوؤں میں چُو پڑا[2] جگر

ہم تو اسیرِ کُنجِ قفس ہو کے مر چلے
ای اشتیاقِ سیرِ چمن تیری کیا خبر

مت عیب کر جو ڈھونڈوں میں اُسکو کہ مدعی
یہ جی بھی یوں ہی جائیگا رہتا ہے تو کدھر

آئی ہی بوجھیو تو بلا اپنے سر صبا
دے مشکفام زلفیں پریشاں ہوئیں اگر[3]

جاتی نہیں ہے دل سے تری یادِ زلف و رُو
روتے ہی مجھ کو گزرے ہے کیا شام کیا سحر

کیا جانوں کس کے تئیں لبِ خنداں کہے ہے خلق
میں نے جو آنکھیں کھول کے دیکھیں سو چشم تر

ای سیل ٹک سنبھل کے قدم بادیے میں رکھ
ہر سمت کو ہے تشنہ لبی کا مری خطر

کرتا ہے کون منع کہ سج اپنی تو نہ دیکھ
لیکن کبھی تو میر کے کر حال پر نظر

غیروں سے وے اشارے ہم سے چھپا چھپا کر
پھر دیکھنا ادھر کو آنکھیں ملا ملا کر

ہر گام سدِّ رہ تھی بتخانے کی محبت
کعبے تلک تو پہنچے لیکن خدا خدا کر

نخچیر گہ میں تجھ سے جو نیم کشتہ چھوٹا
حسرت نے اُس کو مارا آخر لٹا لٹا کر

اک لطف کی نگہ بھی ہم نے نہ چاہی اُس سے
رکھا ہمیں تو اُن نے آنکھیں دکھا دکھا کر

ناصح مرے جنوں سے آگہ نہ تھا کہ ناحق
گو دوڑ کیا گریباں سارا سلا سلا کر

اک رنگ یاں ہی اسکا دل خون کن جبا ہے
پھبتا ہے اُس کو کرنا باتیں چبا چبا کر

جوں شمعِ صبحگاہی اکبار بجھ گئے ہم
اُس شعلہ خو نے ہم کو مارا جلا جلا کر

---

[1] یعنی پھر اثر یقینی ہے
[2] چُو پڑا۔ یعنی ٹپک پڑا۔ چونا بمعنی ٹپکنا۔ [3] ہم نکالینگے سُن اے موجِ صبا بل تیرا اسکی زلفوں کے اگر بال پریشاں ہونگے (مومن)

تجھ سے یوسف کو کیونکہ نسبت دیں | تب شنیدہ ہو دیدہ کے مانند

میر صاحب بھی اُسکے ہاں تھے لیک
بندۂ زر خریدہ کے مانند

قفس تو یہاں سے گئے پر مُدام ہے صیاد | چمن کی صبح کوئی دم کو شام ہے صیاد
بہت ہیں ہاتھ ہی تیرے نکر قفس کی فکر | مرا تو کام انھیں میں تمام ہے صیاد
چمن میں میں نہیں ایسا پھنسا کہ یوں چھوڑوں | مجھے تو ہر رگِ گل تارِ دام ہے صیاد
یہی گلوں کو تنک دیکھوں اتنی مہلت ہو | چمن میں اور تو کیا مجھ کو کام ہے صیاد

ابھی کہ وحشی ہے اس کشمکش کے بیچ ہی میر
خدا ہی اُس کا ہے جو تیرا رام ہے صیاد

میرے سنگِ مزار پر فرہاد[1] | رکھ کے تیشہ کہے ہے یا اُستاد
ہم سے بن مرگ کیا جدا ہو ملال | جان کے ساتھ ہے دلِ ناشاد
موند آنکھیں سفر عدم کا کر | بس ہے دیکھا نہ عالمِ ایجاد
فکرِ تعمیر میں نہ رہ منعم | زندگانی کی کچھ بھی ہے بُنیاد
خاک بھی سر پہ ڈالنے کو نہیں | کس خرابے میں ہم ہوئے آباد
سُنتے ہو ٹک سنو کہ پھر مجھ بعد | نہ سنوگے یہ نالہ و فریاد
لگتی ہے کچھ سموم سی تو نسیم | خاک کس دل جلے کی کی برباد
بھولا جا ہے غمِ بتاں میں جی | غرض آتا ہے پھر خدا ہی یاد
تیرے قیدِ قفس کا کیا شکوہ | نالے اپنے سے اپنی ہے فریاد
ہر طرف ہیں اسیر ہم آواز | باغ ہے گھر ترا تو اے صیاد
ہم کو مرنا یہ ہے کہ کب ہوں کہیں | اپنی قیدِ حیات سے آزاد
ایسا وہ شوخ ہے کہ اُٹھتی صبح | جانا سو جائے اُسکی ہے معتاد
نہیں صورت پذیر نقش اُس کا | یوں ہی تصدیع کھینچے ہے بہزاد

[1] فرہاد۔ یا کوہ کن ایک سنگتراش کا نام جو شیریں معشوقۂ خسرو کا عاشق تھا۔ جس نے شیریں کے لئے ایک نہر دودھ لانے کی پہاڑ میں کھود دی تھی اور خسرو پرویز نے فریب دیکر اُس کو ہلاک کرا دیا۔ اس کے قصّے کو شیریں خسرو نظامی وغیرہ میں بیان کیا ہے۔ ۱۲ آسی ؎ میر صاحب بھی اُس کی بزم میں تھے ؛ جیسے کوئی فقیر ہوتا ہے۔

مرے پاس اُس کی خاکِ پائی بیماری میں رکھا تھا
نہ آیا سر مرا بالیں پہ اودھر جو گیا ڈھل کر

تجلی جلوہ ہیں کچھ بام و درِ غم خانہ کے میرے
وہ رشکِ ماہ آیا ہمنشیں لبِ بام نکل کر

تری خاموشی سے قمری ہوا شورِ جنوں رسوا
ہلا تک طوقِ گردن کو بھی ظالم باغ میں غل کر

گدازِ عاشقی کا میرؔ کے شب ذکر آیا تھا
جو دیکھا شمع مجلس کو تو پانی ہو گئی گھل کر

کر رحم ٹک کب تک ستم مجھ پر جفا کار اس قدر
یک سینہ خنجر سیکڑوں اک جان و آزار اس قدر

بھاگے[۵۷] مری صورت سے وہ عاشق میں اُسکی شکل پر
میں اُس کا خواہاں یہاں تلک وہ مجھ سے بیزار اس قدر

منزلِ پہنچنا اک طرف نے صبر ہے نے ہے سکوں
یکسر قدم میں آبلے پھر راہِ پُرخار اس قدر

ہے جائے ہر دل میں ترے آ در گزر کر بے وفا
کر رحم ٹک اپنے اُپر مت ہو دل آزار اس قدر

جز کشمکش ہووے تو کیا عالم سے ہم کو فائدہ
یہ بے فضا ہے اک قفس ہم ہیں گرفتار اس قدر

غیر اور بغل گیری تری عید اور ہم سے بھاگنا
قطعہ ہم یار ہوں یوں غمزدے خوش ہوئیں اغیار اس قدر

طاقت نہیں ہے بات کی کہتا تھا نعرہ ماریے
کیا جانتا تھا میرؔ ہو جاوے گا بیمار اس قدر

قیامت تھا سماں اُس خشمگیں پر
کہ تلواریں چلیں ابرو کی چیں پر

نہ دیکھا آخر اُس آئینہ رو کو
نظر سے بھی نگاہِ واپسیں پر

گئے دن عجز و نالہ کے کہ اب ہے
دماغِ نالہ چرخِ ہفتمیں پر

ہوا ہے ہاتھ گلدستہ ہمارا
کہ داغِ خون بہت ہے آستیں پر

خدا جانے کہ کیا خواہش ہے جی کو
قطعہ نظر اپنی نہیں ہے مہر و کیں پر

پر افشانی قفس ہی کی بہت ہے
کہ پرواز چمن قابل نہیں پر

جگر میں اپنے باقی روتے روتے
قطعہ اگرچہ کچھ نہیں اے ہمنشیں پر

کبھو جو آنکھ سے چلتے ہیں آنسو
تو بھر جاتا ہے پانی سب زمیں پر

قدم دشتِ محبت میں نہ رکھ میرؔ
کہ سر جاتا ہے گامِ اولیں پر

۵۷ مرزا غالب دہلوی رح ؎ ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار ؛ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔

اس حرف ناشنو سے صحبت بگڑ ہی جاوے
ہر چند لاتے ہیں ہم باتیں بنا بنا کر

میں منع میر تجھ کو کرتا نہ تھا ہمیشہ
کھوئی نہ جان تو نے دل کو لگا لگا کر

نہ ہو ہرزہ درا اتنا، خموشی اے جرس بہتر
نہیں اس قافلے میں اہلِ دل ضبطِ نفس بہتر

نہ ہونا ہی بھلا تھا سامنے اُس چشمِ گریاں کے
نظر ای ابرِ تر آچھی نہ آوے گا برس بہتر

سدا ہو خار خار باغباں گل کا جہاں مانع
سمجھ ای عندلیب اُس باغ سے کنجِ قفس بہتر

بُرا ہے امتحاں لیکن نہ سمجھے تو تو کیا کریے
شہادت گاہ میں نکلیں سب اپنے بلہوس بہتر

سیہ کر دوں گا گلشن دودِ دل سے باغباں ہی کی
جلا آتش میں میرے آشیاں کے خار و خس بہتر

کیا داغوں سے رشکِ باغ ای صد آفریں الفت
یہ سینہ ہم کو بھی ایسا ہی تھا درکار بس بہتر

قدم تیرے چھوئے تھے جن نے اب وہ ہاتھ ہی سر ہے
مرے حق میں نہ ہونا ہی تھا یہاں تک دسترس بہتر

عبث پوچھے ہی مجھ سے میر میں صحرا کو جاتا ہوں
خرابی ہی یہ دل رکھا ہی جو تو نے تو بس بہتر

دیکھوں میں اپنی آنکھوں سے آوے مجھے قرار
اے انتظار تجھ کو کسی کا ہو انتظار

ساقی تو ایکبار تو توبہ مری تڑا
توبہ کروں جو پھر تو ہے توبہ ہزار بار

کیا زمزمہ کروں ہوں خوشی تجھ سے ہمصفیر
آیا جو میں چمن میں تو جاتی رہی بہار

کس ڈھب سے راہِ عشق چلوں ہی یہ ڈر مجھے
پھوٹیں کہیں نہ آبلے ٹوٹیں کہیں نہ خار

کوچے کی اُس کے راہ نہ بتلائی بعد مرگ
دل میں صبا رکھے تھی مری خاک سے غبار

اے پائے خم کی گردشِ ساغر ہو دستگیر
مرہونِ دردِ سر ہو کہاں تک مرا خمار

وسعت جہاں کی چھوڑ جو آرام چاہے میر
آسودگی رکھے ہی بہت گوشۂ مزار

یہ عشق بے اجل کُش ہے بس اے دل اب توکل کر
اگرچہ جان جاتی ہی چلی لیکن تغافل کر

سفر ہستی کا مت کر سرسری جوں باد اے رہرو
یہ سب خاک آدمی تھے ہر قدم پر ٹک تامل کر

سن اے بیدرد گلچیں غارتِ گلشن مبارک ہے
پہ ٹک گوشِ مروت جانبِ فریادِ بلبل کر

نہ وعدہ تیرے آنے کا نہ کچھ اُمید طالع سے
دلِ بیتاب کو کس مُنہ سے کہیے ٹک تحمل کر

یہ کیا جانوں کہ کیوں رونے لگا ہنسنے ہی ہنسنے میں
مگر یہ جانتا ہوں مینہ گھر آتا ہی پھر کھل کر

جی میں آوے سو کیجیو پیارے
ایک ہونا نہ درپئے آزار

حاصلِ دو جہاں ہے اک حرف
ہو مری جان آگے تم مختار

لبوں پر ہے ہر لحظہ آہِ شرربار
جلا ہی پڑا ہے ہمارا تو گھر بار

ہوئیں کس ستمدیدہ کے پاس یکجا
نگاہیں شرر ریز پلکیں جگر بار

کہو کوئی دیکھے اسے سیر کیونکر
کہ ہے اس تنِ نازک اوپر نظر بار

حلاوت سے اپنی جو آگاہ ہو تو
چپک جائیں باہم وے لعلِ شکربار

سبک کر دیا دل کی بیطاقتی نے
نجانا تھا اس کی طرف ہم کو ہر بار

گدھا سا لدا پھرتا ہے شیخ ہر سو
کہ جبہ ہے اک بار و عمامہ سر بار

مرے نخلِ ماتم پہ ہے سنگ باراں
نہایت کو لایا عجب یہ شجر بار

ہمیں بار اس در پہ کثرت سے کیا ہو
لگا ہی رہے ہے سدا واں تو دربار

یہ آنکھیں گئیں ایسی ہو کر در افشاں
کہ دیکھے سے آیا ترا ابرِ گہربار

کب اس عمر میں آدمی شیخ ہوگا
کتابیں رکھیں ساتھ گو ایک خربار

جہاں میر رہنے کی جاگہ نہیں ہے
چلا چاہیے یہاں سے اسباب کر بار

غصے سے اٹھ چلے ہو جو دامن کو جھاڑ کر
جاتے رہیں گے ہم بھی گریبان پھاڑ کر

دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے
پچھتاؤ گے سنو ہو یہ بستی اجاڑ کر

یارب رہِ طلب میں کوئی کب تلک پھرے
تسکین دے کہ بیٹھ رہوں پاؤں گاڑ کر

منظور ہو نہ پاس ہمارا تو حیف ہے
آئے ہیں آج دور سے ہم تجھ کو تاڑ کر

غالب کہ دیوے قوتِ دل اس ضعیف کو
تنکے کو جو دکھاوے ہے پل میں پہاڑ کر

نکلیں گے کام دل کے کچھ اب اہلِ ریش سے
کچھ ڈھیر کر چکے ہیں یہ آگے اکھاڑ کر

اس فن کے پہلوانوں سے کشتی رہی ہے میر
بہتوں کو ہم نے زیر کیا ہے پچھاڑ کر

مرتے ہیں تیری نرگسِ بیمار دیکھ کر
جاتے ہیں جی سے کس قدر آزار دیکھ کر

افسوس وے کہ منتظر اک عمر تک رہے
پھر مر گئے ترے تئیں اک بار دیکھ کر

دل دماغ و جگر یہ سب اک بار　　کام آئے فراق میں اے یار
کیوں نہ ہو ضعف غالب اعضا پر[1]　　مر گئے ہیں قشون کے سردار
گلِ پژمردہ کا نہیں ممنون　　ہم اسیروں کا گوشۂ دستار
مت نکل گھر سے ہم بھی راضی ہیں　　دیکھ لیں گے کبھو سرِ بازار
سیکڑوں حرف ہیں گرہ دل میں　　پر کہاں پائیے لبِ اظہار
سیر کر دشتِ عشق کا گلشن　　غنچے ہو ہو رہے ہیں ہو سو خار
روزِ محشر ہے رات ہجراں کی　　ایسی ہم زندگی سے ہیں بیزار
بحثِ نالہ بھی کیجیو بلبل　　پہلے پیدا تو کر لبِ گفتار
چاکِ دل پر ہیں چشمِ صد خوباں　　کیا کروں یک انار و صد بیمار
شکر کر داغِ دل کا اے غافل　　کس کو دیتے ہیں دیدۂ بیدار
گو غزل ہو گئی قصیدہ سی　　عاشقوں کا ہے طولِ حرف شعار
ہر سحر لگ چلی تو ہے تو نسیم　　اے سیہ مستِ ناز ٹک ہشیار
شاخسانے ہزار نکلیں گے　　جو گیا اس کی زلف کا اک تار
واجب القتل اس قدر تو ہوں　　قطعہ　　کہ مجھے دیکھ کر کہے ہے پکار
یہ تو آیا نہ سامنے میرے　　لاؤ میری میاں سپر تلوار
آ زیارت کو قبرِ عاشق پر　　قطعہ　　اک طرح کا ہے یہاں بھی جوشِ بہار
نکلے ہے میری خاک سے نرگس　　یعنی اب تک ہے حسرتِ دیدار
میر صاحب زمانہ نازک ہے　　قطعہ　　دونوں ہاتھوں سے تھامیے دستار
سہل سی زندگی پہ کام کے تئیں　　اپنے اوپر نہ کیجیے دشوار
چار دن کا ہے مجملہ یہ سب　　سب سے رکھیے سلوک ہی ناچار
کوئی ایسا گناہ اور نہیں　　یہ کہ کیجے ستم کسی پر یار
دھاں جہاں خاک کے برابر ہے　　قطعہ　　قدرِ ہفت آسمانِ ظلم شعار
یہی درخواست پاسِ دل کی ہے　　نہیں روزہ نماز کچھ درکار
درِ مسجد پہ حلقہ زن ہو تم　　قطعہ　　کہ رہو بیٹھ خانۂ خمار

[1] یہ مصرع نکات الشعراء میر میں اس طرح لکھا ہے۔ ع "کیوں نہ ہو فتح ضعف اعضا پر"

ہم اپنی آنکھوں کب تک یہ رنگِ عشق دیکھیں — آنے لگا ہے لوہو رخسار پر تو بہ کر
رنگِ شکستہ اپنا بے لطف بھی نہیں ہے — یہاں کی تو صبح دیکھی اک آدھ رات رہ کر
برسوں عذاب دیکھے قرنوں تعب اٹھائے — یہ دل حزیں ہوا ہے کیا کیا جفائیں سہ کر
ایکوں کی کھال کھینچی ایکوں کو دار کھینچا — اسرار عاشقی کا پچھتائے یار کہہ کر
طاعت کوئی کرے ہے جب ابر زور جھومے — گر ہو سکے تو زاہد اس وقت میں گنہ کر

کیوں تو نے آخر آخر اس وقت منہ دکھایا
دی جان میر نے جو حسرت سے اک نگہ کر

شیخی کا اب کمال ہے کچھ اور — حال ہے اور قال ہے کچھ اور
وعدے برسوں کے کن نے دیکھے ہیں — دم میں عاشق کا حال ہے کچھ اور
سہل مت بوجھ یہ طلسمِ جہاں — ہر جگہ یہاں خیال ہے کچھ اور
تو رگِ جاں سمجھتی ہوگی نسیم — اس کے گیسو کا بال ہے کچھ اور
نہ ملیں گو کہ ہجر میں مر جائیں — عاشقوں کا وصال ہے کچھ اور
کوزپشتی پہ شیخ کی مت جاؤ — اس پہ بھی احتمال ہے کچھ اور
اس میں اس میں بڑا تفاوت ہے — کبک کی چال ڈھال ہے کچھ اور

میر تلوار چلتی ہے تو چلے
خوش خراموں کی چال ہے کچھ اور

دل جو اپنا ہوا تھا زخمی چور — ضبطِ گریہ سے پڑ گئے ناسور
صبح اس سر دھرے کے آگئے — قرصِ خورشید ہو گیا کافور
ہم ضعیفوں کو پائمال نہ کر — دولتِ حسن پر نہ ہو مغرور
عرش پر بیٹھتا ہے کہتے ہیں — گر اٹھے ہے غبارِ خاطرِ مور

شکوۂ آبلہ ابھی سے میر
ہے پیارے ہنوز دلی دور

غیروں سے مل چلے تم مستِ شراب ہو کر — غیرت سے رہ گئے ہم یکسو کباب ہو کر
اس روئے آتشیں سے برقع سرک گیا تھا — گل بہ گیا چمن میں خجلت سے آب ہو کر
کل رات مند گئیں تھیں بہتوں کی آنکھیں غش سے — دیکھا کیا نہ کر تو سرمستِ خواب ہو کر

ناخواندہ خطِ شوق لگے چاک کرنے تو
قاصد تو کہیو ٹک کہ جفا کار دیکھکر

کوئی جو دم رہا ہے سو آنکھوں میں ہے پھر آب
کر لو ٹک ایک وعدۂ دیدار دیکھکر

دیکھیں جدھر وہ رشکِ پری پیشِ چشم ہے
حیران رہ گئے ہیں یہ اسرار دیکھکر

جاتا ہے آسماں لئے کوچے سے یار کے
آتا ہے جی بھرا در و دیوار دیکھکر

تیرے خرامِ ناز پہ جاتے ہیں جی چلے
رکھ ٹک قدم زمیں پہ ستمگار دیکھکر

طالع نے چشم پوشی کی یہاں تک کہ ہمنشیں
چھپتا ہے مجھ کو دور سے اب یار دیکھکر

جی میں تھا اُس سے ملئے تو کیا کیا نہ کہئے میرؔ
پر جب ملے تو رہ گئے ناچار دیکھکر

دیکھ اُس کو ہنستے سب کے دم سے گئے اُکھڑ کر
ٹھہری ہے آرسی بھی دانتوں زمیں پکڑ کر

کیا کیا نیاز طینت اے ناز پیشہ تجھ بن
مرتے ہیں خاک رہ سے گوڑے رگڑ رگڑ کر

قد کش چمن کے اپنی خوبی کو یوں چلے ہیں
پایا پھل اُس سے آخر کیا سرو نے اکڑ کر

وہ سر چڑھا ہے اتنا اپنی فروتنی سے
کھویا ہمیں نے اُس کو ہر لحظہ پانوں پڑ کر

پائے ثبات بھی ہے نام آوری کو لازم
مشہور ہے نگیں جو بیٹھا ہے گھر میں گڑ کر

دوری میں دلبروں کی ملتی ہے کیونکہ سبکی
آدھا نہیں رہا ہوں تجھ سے تو میں بچھڑ کر

اب کیسا زہد و تقویٰ دارو ہے اور ہم ہیں
بنت العنب کے اپنا سب کچھ گیا گھسٹ کر

دیکھو نہ چشم کم سے معمورۂ جہاں کو
بنتا ہے ایک گھر یہاں سو صورتیں بگڑ کر

اُس پشت لب کے اوپر دانے عرق کے یوں ہیں
یاقوت سے رکھے ہیں جوں موتیوں کو جڑ کر

ناسازگاری اپنے طالع کی کیا کہیں ہم
آیا کبھو نہ یہاں ٹک غیروں سے یار لڑ کر

اپنے مزاج میں بھی ہے میرؔ ضد نہایت
پھر مر کے ہی اُٹھیں گے بیٹھیں گے ہم جو اَڑ کر

کہتا ہے کون تجھ کو یہاں یہ نہ کر تو وہ کر
پر ہو سکے جو پیارے دل میں بھی ٹک جگہ کر

وہ تنگ پوش اک دن دامن کشاں گیا تھا
رکھی ہیں جا نمازیں اہلِ ورع نے تہ کر

کیا قصرِ دل کی تم سے ویرانی نقل کریے
ہو ہو گئے ہیں ٹیلے سارے مکان ڈھہ کر

۱؎ میر صاحب ہی کا دوسرا شعر ہے ۔ کہتے تو ہم یوں کہتے، یوں کہتے جو وہ آتا ؛ یہ کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا۔
ایسا ہی میر صاحب کا ایک اور شعر ہے ۔ کہتے تھے اُس سے ملئے تو کیا کیا نہ کہئے لیک ؛ وہ آگیا تو سامنے اُس کے نہ آئی بات۔

ہم بھی پھرتے ہیں یک حشم لیکر دستۂ داغ و فوجِ غم لیکر
دست کش نالہ پیش رو گریہ آہ چلتی ہے یہاں علم لیکر
مرگ اک ماندگی کا وقفہ ہے یعنی آگے چلیں گے دم لیکر
اُس کے اوپر کہ دل سے تھا نزدیک غمِ دُوری چلے ہیں ہم لیکر
بارہا صید گہ سے اُس کی گئے داغِ یاس آہوئے حرم لیکر
ضعف یہاں تک کھنچا کہ صورت گر رہ گئے ہاتھ میں قلم لیکر
دل پہ کب اکتفا کرے ہے عشق جائیگا جان بھی یہ غم لیکر
شوق اگر ہے یہی تو ای قاصد ہم بھی آتے ہیں اب رقم لیکر
میر صاحب ہی چوکے ای بدعہد
ورنہ دینا تھا دل قسم لیکر

داڑھی سفید شیخ کی تو مت نظر میں کر بگلا شکار ہو وے تو لگتے ہیں ہاتھ پر
ای ابرِ خشک مغز سمندر کا منھ نہ دیکھ سیراب تیرے ہونیکو کافی ہے چشمِ تر
آخر عدم سے کچھ بھی نہ اکھڑا مرا میاں مجھ کو تھا دستِ غیب پکڑنی تری کمر
سوتا تھا بیخبر تو نشے میں جو رات کو
سو بار میر نے تری اُٹھ اُٹھ کے لی خبر

پشت پا ماری بسکہ دُنیا پر زخم پر پڑگیا مرے پا پر
ڈوبے اُچھلے ہے آفتاب ہنوز کہیں دیکھا تھا تجھکو دریا پر
گردمے ہوں آوے شیخِ شہر ابر جھوما ہے جا ہے صحرا پر
دلِ پُر خوں تو تھا گلابی شراب جی ہے اپنا چلا نہ صہبا پر
یہاں جہاں میں کہ شہر کوراں ہے سات پردے ہیں چشمِ بینا پر
فرصتِ عیش اپنی یوں گزری کہ مصیبت پڑی تمنا پر
طارمِ تاک سے لہو ٹپکا سنگِ باراں ہوا ہے مینا پر
میر کیا بات اُس کے ہونٹھوں کی
جینا دو بھر ہوا مسیحا پر

جھوٹے بھی پوچھتے نہیں تک حال آن کر انجان اتنے کیوں ہوئے جاتے ہو جان کر

پردہ[1] رہے گا کیونکر خورشیدِ خاوری کا
نکلے ہے صبح وہ بھی اب بے نقاب ہوکر

یک قطرہ آب میں نے اس دور میں پیا ہے
نکلا ہے چشم ترسے وہ خونِ ناب ہوکر

آ بیٹھتا تھا صوفی ہر صبح میکدے میں
شکرِ خدا کہ نکلا واں سے خراب ہوکر

شرم و حیا کہاں تک ہیں میر کوئی دن کے
اب تو ملا کرو تم ٹک بے حجاب ہوکر

ہو آدمی اے چرخ ترکِ گردشِ ایام کر
خاطر سے ہی مجھ مست کی تائیدِ دورِ جام کر

دنیا ہے بے صرفہ نہ ہو رونے میں یا کڑھنے میں تو
نالہ کو ذکرِ صبح کر گریہ کو وردِ شام کر

مستِ جنوں رہ روز و شب شہرہ ہو شہر و دشت میں
محبس میں اپنی نقلِ خوشِ زنجیر کا بادام کر

جتنی ہو ذلت خلق میں اتنی ہو عزت عشق میں
ناموس سے آ درگزر بے ننگ ہوکر نام کر

مر رہ کہیں بھی میر جا گشتہ پھرنا تا کجا
ظالم کسو کا سن کہا، کوئی گھڑی آرام کر

رہنے کا پاس نہیں ایک بھی تار آخرکار
ہاتھ سے جائے گا سر رشتۂ کار آخرکار

لوحِ تربت پہ مری پہلے یہ لکھیو کہ اسے
یار دشمن ہو گیا جان سے مار آخرکار

مشتِ خاک اپنی جو پامال ہے یہاں اس پہ بجا
سر کو کھینچے گا فلک تک یہ غبار آخرکار

چشم وا دیکھ کے اس باغ میں کیجو نرگس
آنکھوں سے جاتی رہے گی یہ بہار آخرکار

اول کارِ محبت تو بہت سہل ہے میر
جی سے جاتا ہے ولے صبر و قرار آخرکار

خط میں ہے کیا سماں پسینے پر
موتی گویا جڑے ہیں مینے پر

کوئی ہوتا ہے دل طپش سے بُرا
ایک دم کے لہو نہ پینے پر

دل سے میرے شکستیں الجھی ہیں
سنگ باراں ہے آبگینے پر

چاکِ سینہ سے کھل گئے ٹانکے
کیا رفو کم ہوا ہے سینے پر

جورِ دلبر سے کیا ہوں آزردہ
میر اس چار دن کے جینے پر

[1] پردہ رہنا۔ مراد عیب چھپا رہجانا۔ شرم رہجانا۔ بات رہجانا ؎ برق لکھنوی
نام عالم میں رہے بات خدایا رہ جائے + پردۂ خاک میں چھپ جاؤں تو پردہ رہ جائے

گرمی سے بر شکال کی پروا ہی کیا ہمیں
برسوں رہی ہی جان کے رُکنے کی چال چھوڑ

بلبل کی اور چشم مروت سے دیکھ ٹک
بیدرد یوں چمن میں کسو پھول کو نہ توڑ

کچھ کوہکن ہی سے نہیں تازہ ہوا یہ کام
بہتیرے عاشقی میں ہوئے سر کو پھوڑ پھوڑ

بیطاقتی سے میر لگے چھوٹنے پران
ظالم خیال دیکھنے کا اُس کے اب تو چھوڑ

ردیف زائے معجمہ

ہوتا نہیں ہی باب اجابت کا وا ہنوز
بسمل پڑی ہے چرخ پہ میری دعا ہنوز

دن رات کو کھنچا ہے قیامت کا اور میں
پھرتا ہوں منہ پہ خاک ملے جا بجا ہنوز

خط کاڑھ لاکے تم تو منڈا بھی چلے ولے
ہوتی نہیں ہماری تمہاری صفا ہنوز

غنچے چمن چمن کھلے اس باغ دہر میں
دل ہی مرا ہے جو نہیں ہوتا ہی وا ہنوز

احوال نامہ بر سے مرا سُن کے کہہ اُٹھا
جیتا ہے وہ ستمزدہ مہجور کیا ہنوز

غنچہ نہ بوجھ دل ہی کسی مجھ سے زار کا
کھلتا نہیں جو سعی سے تیری صبا ہنوز

توڑا تھا کس کا شیشۂ دل تو نے سنگدل
ہی دل خراش کوچے میں تیرے صدا ہنوز

چلو میں اُس کے میر لہو تھا سو پی چکا
اُڑتا نہیں ہی طائرِ رنگِ حنا ہنوز

بے بال و پر اسیر ہوں کنج قفس میں میر
جاتی نہیں ہی سر سے چمن کی ہوا ہنوز

ضبط کرتا نہیں کنارہ ہنوز
ہے گریبان پارہ پارہ ہنوز

آتش دل نہیں بجھی شاید
قطرۂ اشک ہی شرارہ ہنوز

اشک جھمکا ہی جب نہ نکلا تھا
چرخ پر صبح کا ستارہ ہنوز

لب پہ آئی ہی جان کب کی ہی
اُس کے موقوف یک اشارہ ہنوز

عمر گزری دوائیں کرتے میر
درد دل کا ہوا نہ چارہ ہنوز

مرگیا میں پہ مرے باقی ہیں آثار ہنوز
تر ہیں سب سر کے لہو سے در و دیوار ہنوز

دل بھی پُر داغ چمن ہی پر اُسے کیا کیجے
جی سے جاتی ہی نہیں حسرت دیدار ہنوز

وے لوگ تم نے ایک ہی شوخی میں کھو دیے
پیدا کیے تھے چرخ نے جو خاک چھان کر

جھمکے دکھا کے باعثِ ہنگامہ ہی رہے
پر گھر سے در پہ آئے نہ تم بات مان کر

کہتے نہ تھے کہ جان سے جاتے رہیں گے ہم
اچھا نہیں ہے آ، نہ ہمیں امتحان کر

کم گو جو ہم ہوئے تو ستم کچھ نہ ہو گیا
اچھی نہیں یہ بات مت اتنی زبان کر

ہم وے ہیں جن کے خون سے تری راہ سب ہے گل
مت کر خراب ہم کو تو اوروں میں سان کر

تا کشتۂ وفا مجھے جانے تمام خلق
تربت پہ میری خون سے میرے نشان کر

ناز و عتاب و خشم کہاں تک اٹھائیے
یارب کبھو تو ہم پہ اُسے مہربان کر

افسانے ما و من کے سنیں میر کب تلک
چل اب کہ سو دیں منہ پہ دوپٹے کو تان کر

آزار دیکھے کیا کیا اُن پلکوں سے اٹک کر
جی لے گئے یہ کانٹے دل میں کھٹک کھٹک کر

سرو و تدرو دونوں پھر آپ میں نہ آئے
گلزار میں چلا تھا وہ شوخ ٹک لٹک کر

کب آنکھ کھول دیکھا تیرے تئیں سرہانے
ناچار مر گئے ہم سر کو پٹک پٹک کر

حاصل بجز کدورت اس خاک داں سے کیا ہے
خوش وہ کہ اُٹھ گئے ہیں داماں جھٹک جھٹک کر

یہ مشتِ خاک یعنی انسان ہی ہے روکش
ورنہ اُٹھائی کن نے اس آسماں کی ٹکر

دل کام چاہتا ہے اب اُس کے گیسوؤں سے
واں مر گئے ہیں کتنے برسوں اٹک اٹک کر

ٹک منھ سے اُس کے دیشب برقع سرک گیا تھا
جاتی رہی نظر سے مہتاب سی چھٹک کر

دھولا چکے تھے ملکر کل لونڈے میکدے کے
پر سر گراں ہو واعظ جاتا رہا سٹک کر

کل رقصِ شیخ مطلق دل کو لگا نہ میرے
آیا وہ حیز شرعی کتنا مٹک مٹک کر

منزل کی میر اس کی کب راہ تجھ سے نکلی
یہاں خضر سے ہزاروں مر گئے بھٹک کر

ردیف رائے ہندی

آشوب دیکھ چشم تری سر رہے ہیں جوڑ
پلکوں کی صف سے بھیڑیں گئیں منھ کو موڑ موڑ

لاکھوں جتن کیے نہوا ضبط گریہ لیک
سنتے ہی نام آنکھ سے آنسو گرے کروڑ

زخم دروں سے میرے نہ ٹک بے خبر رہو
اب ضبط گریہ سے ہے ادھر ہی کو سب نچوڑ

ردیف سین مہملہ

ای اَبرِ تر تو اور کسی سمت کو برس
اس مُلک میں ہماری ہی یہ چشمِ تر ہی بس

حیراں تو دیکھ پھول بکھیرے تھی کل صبا
اک برگِ گل گرا نہ جہاں تھا مرا قفس

مژگاں بھی بہ گئیں مرے رونے سے چشم کی
سیلاب موج مارے تو ٹھہرے ہی کوئی خس

مجنوں کا دل ہوں محملِ لیلیٰ سے ہوں جُدا
تنہا پھروں ہوں دشت میں جوں نالۂ جرس

ای گریہ اُس کے دل میں اثر خوب ہی کیا
روتا ہوں جب میں سامنے اُسکے تو دے ہی ہنس

اُس کی زباں کے عہد سے کیونکر نکل سکوں
کہتا ہوں ایک میں تو سُناتا ہے مجھکو دس

حیراں ہوں میرؔ نزع میں اب کیا کروں بھلا
احوالِ دل بہت ہی مجھے فرصت یک نفس

کیونکہ نکلا جائے بحرِ غم سے مجھ بے دل کے پاس
آکے ڈوبی جاتی ہے کشتی مری ساحل کے پاس

ہی پریشاں دشت میں کس کا غبارِ ناتواں
گرد کچھ گستاخ آتی ہے چلی محمل کے پاس

گرم ہوگا حشر کو ہنگامۂ دعویٰ بہت
کاشکے مجھ کو نہ لے جاویں مرے قاتل کے پاس

دور اس سے جوں ہوا دل پر بلا ہے مضطرب
اس طرح تڑپا نہیں جاتا کسو بسمل کے پاس

بوے خوں آتی ہی بادِ صبحگاہی سے مجھے
نکلی ہے بیدرد شاید ہو کسو گھائل کے پاس

آہ نالے مت کیا کر اس قدر بیتاب ہو
ای ستمکش میرؔ ظالم ہے جگر بھی دل کے پاس

مرگیا میں ملا نہ یار افسوس
آہ افسوس صد ہزار افسوس

ہم تو ملتے تھے جب اہا ہا ہا
نہ رہا وہ ہیں روزگار افسوس

یوں گنواتا ہے دل کوئی مجھ کو
یہی آتا ہے بار بار افسوس

قتل گر تو ہیں کرے گا خوشی
یہ توقع تھی تجھ سے یار افسوس

رخصتِ سیرِ باغ تک نہ ہوئی
یوں ہی جاتی رہی بہار افسوس

خوب بدعہد تو نہ مل لیکن
میرے تیرے تھا یہ قرار افسوس

خاک پر میرؔ تیری ہوتا دلے
نہ ہوا اتنا اقتدار افسوس

بہ گئے عمر ہوئی ابرِ بہاری کو ولے
لہو برسا رہے ہیں دیدۂ خونبار ہنوز

بد نہ لیجائیو پوچھوں ہوں تجھی سے یہ طبیب
یہ ہوا کوئی بھی اس درد کا بیمار ہنوز

بارہا چل چکی تلوار تری چال پہ شوخ
تو نہیں چھوڑتا اس طرز کی رفتار ہنوز

ایک دن بال فشاں ٹک ہوئے تھے خوش ہوکر
ہیں غمِ دل کی اسیری میں گرفتار ہنوز

کوئی تو آبلہ پا دشتِ جنوں سے گزرا
ڈوبا ہی جائے ہے لوہو میں سرِ خار ہنوز

منتظر قتل کے وعدے کا ہوں اپنے یعنی
جیتا مرنے کو رہا ہے یہ گنہگار ہنوز

اُڑ گئے خاک ہو کتنے ہی ترے کوچے سے
باز آتے نہیں پر تیرے ہوادار ہنوز

قطعہ
ایک بھی زخم کی جا جس کے نہ ہو تن پہ کہیں
کوئی دیتا ہے سنا دیسی کو آزار ہنوز

ٹک تو انصاف کر اے دشمنِ جانِ عاشق
میان سے نکلی پڑے ہی تری تلوار ہنوز

قطعہ
میر کو ضعف میں میں دیکھ کہا کچھ کہئے
ہے تجھے کوئی گھڑی قوتِ گفتار ہنوز

ابھی اک دم میں زباں چلنے سے رہجاتی ہے
دردِ دل کیوں نہیں کرتا ہے تو اظہار ہنوز

آنسو بھر لاکے بہت حزن سے یہ کہنے لگا
کیا کہوں تجھ کو سمجھ اس پہ نہیں یار ہنوز

آنکھوں میں آن رہا جی جو نکلتا ہی نہیں
دل میں میرے ہے گرہ حسرتِ دیدار ہنوز

مجھکو پوچھا بھی نہ یہ کون ہے غمناک ہنوز
ہو چکے حشر میں پھرتا ہوں جگر چاک ہنوز

اشک کی لغزشِ مستانہ پہ مت کیجو نظر
دامنِ دیدۂ گریاں ہے مرا پاک ہنوز

بھر نظر دیکھنے پاتا نہیں میں نزع میں بھی
مُنہ کے تئیں پھیرے ہی لیتا ہے وہ بیباک ہنوز

بعد مرنے کے بھی آرام نہیں میر مجھے
اُس کے کوچے میں ہے پامال مری خاک ہنوز

ہو چکا خونِ جگر رونا نہیں کچھ کم ہنوز
ہیں مژہ دستورِ سابق ہی پہ میرے نم ہنوز

دل جلوں پر روتے ہیں جن کو ہے کچھ سوزِ جگر
شمع رکھتی ہے ہماری گور پر ماتم ہنوز

وضع یکساں اس زمانے میں نہیں رہتی کہیں
قد ترا چوگاں رہا ہے کس طرح سے خم ہنوز

آرہا ہے جی مرا آنکھوں میں اک پل اور رہو
پر نہیں جاتا کسی کے دیکھنے کا غم ہنوز

وہ جو عالم اُس کے اوپر تھا سو خط نے کھو دیا
مبتلا ہے اس بلا میں میر اک عالم ہنوز

جھومے ہے بید جائے جوانانِ مے گسار ۔۔۔ بالائے خم ہے خشت سرِ پیرِ مے فروش

میر اس غزل کو خوب کہا تھا ضمیر[1] نے
پر اے زباں دراز بہت ہو چکی خموش

دل تو افگار ہے جگر ہے ریش ۔۔۔ اک مصیبت ہے میرے تئیں در پیش
پان تو لیتا جا فقیروں کے ۔۔۔ برگِ سبز ست تحفۂ درویش

فکر کر زادِ آخرت کا بھی
میر اگر تو ہے عاقبت اندیش

ردیف صاد مہملہ

شیخ ہو دشمنِ زنِ رقّاص ۔۔۔ کیوں نہ القاص[2] لا یحبُ القاص

ردیف ضاد معجمہ

سال میں ابرِ بہاری تجھ سے اکباری ہے فیض ۔۔۔ چشمِ نم دیدہ سے عاشق کی سدا جاری ہے فیض

ردیف طائے مہملہ

سب سے آئینہ نمط رکھتے ہیں خوباں اختلاط ۔۔۔ ہوتے ہیں یہ لوگ بھی کتنے پریشاں اختلاط
تنگ آیا ہوں میں رشکِ تنگ پوشی سے تری ۔۔۔ اس تنِ نازک سے یہ جامے کو چسپاں اختلاط

ردیف ظائے معجمہ

غیر مجھ کو جو کہتے ہیں محظوظ ۔۔۔ تجھ سے ملتے ہیں رہتے ہیں محظوظ

[1] ضمیر سے مراد شیخ مداری ہیں جن کا تخلص ضمیر تھا۔ اکبر آباد کے رہنے والے تھے اپنا ابتدائی کلام ولی محمد نظیر اکبر آبادی کو دکھایا بعد ازاں محمدی بیدار کے شاگرد ہوئے میر کے معاصرین میں تھے یہ دو شعر انھیں کے ہیں ؎

چشم بد دور جدھر آپ گزر کیجئے گا ۔۔۔ ایک عالم کے تئیں زیر و زبر کیجئے گا
وہ ابھی تو نوگلِ آرزو، وہ ہنوز تازہ بہار ہے ۔۔۔ نہ کچھ اپنے ہی سے اُسے خبر نہ حنا سے کچھ سروکار ہے

[2] قصہ گو، قصہ گو کو دوست نہیں رکھتا۔

ردیف شین معجمہ

ہر جزر و مد سے دست و بغل اُٹھتے ہیں خروش — کس کا ہے راز بحر میں یارب کہ لے ہیں جوش
ابروئے کج ہے موج کوئی چشم ہے حباب — موتی کسی کی بات ہے سیپی کسی کا گوش
ان مغبچوں کے کوچے ہی سے میں کیا سلام — کیا مجھ کو طوفِ کعبے میں رندِ دُرد نوش
حیرت سے ہووے پرتوِ مہ نورِ آئینہ — تو چاندنی میں نکلے اگر ہو سفید پوش
قطعہ
کل ہم نے سیرِ باغ میں دل ہاتھ سے دیا — اک سادہ[۵۱] گل فروش کا آکر سبد بدوش
جاتا رہا نگاہ سے جوں موسمِ بہار — آج اُس بغیر داغِ جگر ہیں سیاہ پوش
قطعہ
شب اس دلِ گرفتہ کو وا کر بزورِ مے — بیٹھے تھے شیرہ[۵۲] خانہ میں ہم کتنے ہرزہ کوش
آئی صدا کہ یاد کرو دورِ رفتہ کو — عبرت بھی ہے ضرور ٹک اے جمع تیز ہوش
جمشید[۵۳] جس نے وضع کیا جام۔ کیا ہوا — وے صحبتیں کہاں گئیں کیدھر وے ناؤ نوش
جُز لالہ اُس کے جام سے پاتے نہیں نشاں — ہے کوکنار اُس کی جگہ اب سبو بدوش

۵۱ اک سادہ گلفروش کا یعنی گلفروش کا ایک سادہ روڑکا ۔ ۵۲ شیرہ خانہ شراب خانہ ۔

۵۳ جمشید۔ جم۔ جمشاسپ۔ جمشیدوں۔ یہ سب ایک معنی میں آتے ہیں اور ان سب سے مُراد شاہ جمشید بن ونیکان بن تہمورس بن ایران بن ہوشنگ بن آدم ہے۔ تواریخ قدیم کی روایات کی بموجب اُس نے سات سو سولہ سال تمام ایران پہ حکومت کی یہانتک کہ ضحاک برادرِ شداد بن عاد علوانی نے جو صابئین کے آئین کا پیرو اور مخالفِ مذہب مروجہ تھا خروج کیا۔ اور جمشید پر غالب ہوا۔ جمشید سیستان کی طرف بھاگ گیا۔ اور کورنگ شاہ کی دختر کو اپنے عقد میں لاکر رہنے لگا۔ اجداد رستم اُسی کی اولاد سے ہیں اس کے بعد ضحاک کے ہاتھ سے مارا گیا۔ نہایت عادل، نیکدل، موحد، بادشاہ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ شہروں کی آبادی کے طریقے۔ آداب حرب۔ سلاح وغیرہ کا وہ موجد تھا اور ہبوط آدم کے دو ہزار چار سو انتیس سال بعد اس کی حکومت کا زمانہ تھا۔ ترکیب شراب بھی اُسی کے زمانے میں دریافت ہوئی۔ واضح ہو کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو بھی جم کہا جاتا ہے مگر آپ کا زمانہ جمشید سے دو ہزار اور کچھ سال بعد کا ہے لہذا جہاں کہیں دیو و دد اور خاتم وغیرہ کے ساتھ جم کا لفظ آئے وہاں حضرت سلیمان علیہ السلام سے مُراد ہو گی اور جم سے بعض جگہ سکندر بھی مُراد ہے۔ جامِ جم سے مراد یہ ہے کہ زمانہ جمشید میں جام ایجاد ہوا۔ اور جامِ گیتی نما دوسری چیز تھا کہ اس کو ریاضی اور ہیئت کی رُو سے خطوط وغیرہ کھینچکر تیار کیا گیا تھا۔ جس سے احوال عالم معلوم ہوتا تھا۔ ۱۲۔ انتہی (مستفاد از کتب تواریخ و لغت)

ہم نے تو پر فشانی نہ جانی کہ ایک بار
پرواز کی چمن سے سو صیاد کی طرف

حیران کار عشق ہی شیریں کا نقش میرؔ
کچھ یوں ہی دیکھنا نہیں فرہاد کی طرف

جو دیکھو مرے شعر تر کی طرف
تو مائل نہ ہو پھر گہر کی طرف

کوئی داد دل آہ کس سے کرے
ہر اک ہے سو اُس فتنہ گر کی طرف

محبت نے شاید کہ دی دل میں آگ
دُھواں سا ہے کچھ اس نگر کی طرف

لگیں ہیں ہزاروں ہی آنکھیں ادھر
اک آشوب ہے اُس کے گھر کی طرف

بہت رنگ ملتا ہے دیکھو کبھو
ہماری[1] طرف سے سحر کی طرف

بخود کس کو اُس تاب رخ نے رکھا
کرے کون شمس و قمر کی طرف

قطعہ
نہ سمجھا گیا ابر کیا دیکھ کر
ہوا تھا مری چشم تر کی طرف

ٹپکتا ہے پلکوں سے خوں متصل
نہیں دیکھتے ہم جگر کی طرف

مناسب نہیں حال عاشق سے صبر
رکھے ہے یہ دارو ضرر کی طرف

کسے منزل دلکش دھر میں
نہیں میل خاطر سفر کی طرف

رگ جاں کب آئی ہے آنکھوں میں میرؔ
گئے ہیں مزاج اُس کمر کی طرف

ردیف قاف

درد ہی خود ہے خود دوا ہے عشق
شیخ کیا جانے تو کہ کیا ہے عشق

تو نہ ہووے تو نظم کل اُٹھ جائے
سچے ہیں شاعراں خدا ہے عشق

ردیف کاف تازی

بے چین مجھ کو چاہتا ہر دم ہے زیر خاک
چھاتی پہ بعد مرگ بھی دل جم ہے زیر خاک

آسودگی جو چاہے تو مرنے پہ دل کو رکھ
آشفتگی طبع بہت کم ہے زیر خاک

تنہا تو اپنی گور میں رہنے پہ بعد مرگ
مت اضطراب کر تو کہ عالم ہے زیر خاک

[1] ہماری طرف سے دیکھو۔ یعنی ہماری خاطر سے یا ہمارے کہنے سے دیکھو۔

ردیف عین مہملہ

سب پہ روشن ہے کہ شب مجلس میں جب آتی ہے شمع
اس بھبھوکے سے کو بیٹھا دیکھ جلجاتی ہے شمع

ردیف غین معجمہ

ہم اور تیری گلی سے سفر دروغ دروغ
کہاں دماغ ہمیں اس قدر دروغ دروغ

تم اور ہم سے محبت تمھیں خلاف خلاف
ہم اور الفتِ خوبِ دگر دروغ دروغ

غلط غلط کہ رہیں تم سے ہم تنک غافل
تم اور پوچھو ہماری خبر دروغ دروغ

فروغ کچھ نہیں دعوی کو صبح صادق کے
شب فراق کو کب ہے سحر دروغ دروغ

کسو کے کہنے سے مت بدگماں ہو میر سے تو
وہ اور اُس کو کسو پر نظر دروغ دروغ

شیخ سچ خوب ہے بہشت کا باغ
جائیں گے گر وفا کرے گا دماغ

ردیف فا

آجکل کاہے کو بتلاتے ہو گستاخی معاف
راستی یہ ہے کہ وعدے ہیں تمھارے سب خلاف

آہ برچھی سی لگی تھی تیر سی دل کی طپش
ہجر کی شب مجھ پہ گزری غیرت روز مصاف

ایک دن میں نے لکھا تھا اُس کو اپنا دردِ دل
آج تک جاتا نہیں سینے سے خامے کے شگاف

پانوں پر سے اپنے میرا سر اُٹھانے مت مجھکو
تیغ باندھی ہے میاں تم نے کمر میں خوش غلاف

صف اُلٹ جا عاشقوں کی گر ترے ابرو ہلیں
ایک دم تلوار کے چلنے میں ہو وے ملک صاف

شیخ مت رو کش ہو مستوں کا تو اس جُبے اُپر
لینے استنجے کو ڈھیلا تیری ٹل جاتی ہے ناف

عشق کے بازار میں سودا نہ کیجو تو تو میر
سر کو جب واں بیچ چکتے ہیں تو یہ ہے دست لاف

غالب ہے تیرے عہد میں بیداد کی طرف
ہر خون گرفتہ جائے ہے جلاد کی طرف

کن نے لیا ہے تم سے محلکہ کہ داد دو
ملک کان ہی رکھا کرو فریاد کی طرف

ہر تار زلف قیمت فردوس ہے ترا
کرتا ہے کون طرۂ شمشاد کی طرف

میر گم کردہ چمن زمزمہ پرداز ہے ایک
جس کی لے دام سے تا گوشِ گل آواز ہی ایک

کچھ ہوا ای مرغِ قفس لطف نہ جاوے اُس سے
نوحہ یا نالہ ہر اک بات کا انداز ہی ایک

ناتوانی سے نہیں بال فشانی کا دماغ
ورنہ تا باغ قفس سے مری پرواز ہی ایک

گوش کو ہوش کی ٹک کھول کے سُن شورِ جہاں
سب کی آواز کے پردے میں سخن ساز ہی ایک

چاہے جس شکل سے تمثال صفت اُس میں در آ
عالمِ آئینہ کے مانند در باز ہے ایک

بالیں پہ میری آوے گا تو گھر سے جب تلک
کر جاؤں گا سفر ہی میں دُنیا سے تب تلک

اتنا دن اور دل سے طپش کرلیں کاوشیں
یہ مجھلہ[1] تمام ہی ہے آج شب تلک

نقاش کیونکہ کھینچ چکا تو شبیہِ یار
کھینچوں ہوں ایک ناز ہی اسکا میں اب تلک

شب کوتہ اور قصہ مری جان کا دراز
القصہ اب کہا کروں تجھ سے میں کب تلک

باقی یہ داستان ہی اور کل کی رات ہے
گر جان میری میر نہ آپہنچے لب تلک

شوق ہے تو ہے اُس کا گھر نزدیک
دوری رہ ہے راہ بر نزدیک

آہ کرنے میں دم کو سادھے رہ
کہتے ہیں دل سے ہی جگر نزدیک

ڈوبیں دریا و کوہ و شہر و دشت
تجھ سے سب کچھ ہی چشمِ تر نزدیک

حرف دوری ہی گرچہ انشا لیک
دیجو خط جا کے نامہ بر نزدیک

دور اب بیٹھتے ہیں مجلس میں
ہم جو تم سے تھے بیشتر نزدیک

خبر آتی ہے سو بھی دور سے یہاں
آؤ یکبار بے خبر نزدیک

توشۂ آخرت کا فکر رہے
جی سے جانے کا ہی سفر نزدیک

دور پھرنے کا ہم سے وقت ہی کیا
پوچھ کچھ حال بیٹھ کر نزدیک

مر بھی رہ[2] میر شب بہت رویا
ہی مری جان اب سحر نزدیک

کہیں پہنچو جو مجھ بے پا و سر تک
کہ پہنچا شمع ساں داغ اب جگر تک

کچھ اپنی آنکھ میں یہاں کا نہ آیا
خزف سے لیکے دیکھا دُرِّ تر تک

جسے شب آگ سا دیکھا سُلگتے
اُسے پھر خاک ہی پایا سحر تک

[1] مجھلہ مجازاً بمعنی جھگڑا جھمیلا۔ عوام اسکو جھبلا کہتے ہین

[2] سودا تری فریاد سے آنکھوں میں کٹی رات + ہونیکو سحر آئی ہے ظالم کہیں مر بھی

رویا تھا نزع میں میں اُسے یاد کر بہت
اب تک مری ہر ایک مژہ نم ہے زیرِ خاک

کیا آسماں پہ کھینچے کوئی میرؔ آپ کو
جانا جہاں سے سب کو مسلّم ہے زیرِ خاک

اب وہ نہیں کہ شورش رہتی تھی آسماں تک
آشوبِ نالہ اب تو پہنچا ہے لامکاں تک

یہ بھی گیا بدن کا سب ہو کے گوشت پانی
اب کار دا اے عزیزاں پہنچی ہے استخواں تک

تصویر کی سی شمعیں خاموش جلتے ہیں ہم
سوزِ دروں ہمارا آتا نہیں زباں تک

روتے پھرے ہیں لوہو اک عمر اس گلی میں
باغ و بہار ہی ہو جاوے نظر جہاں تک

آنکھیں جو روتے روتے جاتی رہیں بجا ہے
انصاف کر کہ کوئی دیکھے ستم کہاں تک

بے لطف تیرے کیونکر تجھ تک پہنچ سکیں ہم
ہیں سنگِ راہ اپنے کتنے یہاں سے وہاں تک

ہم بے نصیب سر کو تجھ سے کیوں نہ پھوڑیں
پہنچا کبھو نہ جبہہ اُس سنگِ آستاں تک

مانند طیرِ نوپر اٹھے جہاں سے گئے ہم
دشوار ہے ہمارا آنا پھر آشیاں تک

تن کام میں ہمارے دیتا نہیں وہی کچھ
حاضر ہیں میرؔ ہم تو اپنی طرف سے جاں تک

ہے بعد مرے مرگ کے آثار سے اب تک
سوکھا نہیں لوہو در و دیوار سے اب تک

رنگینیِ عشق اُس کی ملے پر ہوئی معلوم
صحبت نہ ہوئی تھی کسی خونخوار سے اب تک

کب سے متحمل ہے جفاؤں کا دلِ زار
زنہار وفا ہو نہ سکی یار سے اب تک

ابرو ہی کی جنبش نے یہ ستھراؤ کئے ہیں
مارا نہیں اُن نے کوئی تلوار سے اب تک

وعدہ بھی قیامت کا بھلا کوئی ہے وعدہ
پر دل نہیں خالی غمِ دیدار سے اب تک

مدت ہوئی گھٹ گھٹ کے ہیں شہر میں مرتے
واقف نہ ہوا کوئی اس اسرار سے اب تک

برسوں ہوئے دل سوختہ بلبل کو موئے لیک
اک دود سا اُٹھتا ہے چمن زار سے اب تک

کیا جانیے ہوتے ہیں سخن لطف کے کیسے
پوچھا نہیں اُن نے تو ہمیں پیار سے اب تک

اس باغ میں اغلب ہے کہ سرزد نہ ہوا ہو
یوں نالہ کسو مرغِ گرفتار سے اب تک

خط آئے پہ ہے دن ہی سیہ تم سے ہمارا
جاتا نہیں اندھیر یہ سرکار سے اب تک

نکلا تھا کہیں وہ گلِ نازک شبِ مہ میں
سو کوفت نہیں جاتی ہے رخسار سے اب تک

دیکھا تھا کہیں سایہ ترے قد کا چمن میں
ہیں میرؔ جی آوارہ پریدار[1] سے اب تک

[1] پریدار ۔۔ آسیب زدہ ۔ جس پر پری کا سایہ ہو۔

ہم نے تو پر فشانی نہ جانی کہ ایک بار
پرواز کی چمن سے سو صیاد کی طرف

حیران کارِ عشق ہی شیریں کا نقش میرؔ
کچھ یوں ہی دیکھتا نہیں فرہاد کی طرف

جو دیکھو مرے شعرِ تر کی طرف
تو مائل نہ ہو پھر گہر کی طرف

کوئی داد دل آہ کس سے کرے
ہر اک ہی سو اُس فتنہ گر کی طرف

محبت نے شاید کہ دی دل میں آگ
دُھواں سا ہی کچھ اِس نگر کی طرف

لگیں ہیں ہزاروں ہی آنکھیں ادھر
اک آشوب ہے اُس کے گھر کی طرف

بہت رنگ ملتا ہی دیکھو کبھو
ہماری[1] طرف سے سحر کی طرف

بخود کس کو اُس تابِ رُخ نے رکھا
کرے کون شمس و قمر کی طرف

نہ سمجھا گیا ابر کیا دیکھکر
ہوا تھا مری چشمِ تر کی طرف قطعہ

ٹپکتا ہے پلکوں سے خوں متصل
نہیں دیکھتے ہم جگر کی طرف

مناسب نہیں حال عاشق سے صبر
رکھے ہی یہ دارو ضرر کی طرف

کسے منزلِ دلکش دہر میں
نہیں میل خاطر سفر کی طرف

رگِ جاں کب آئی ہی آنکھوں میں میرؔ
گئے ہیں مزاج اُس کمر کی طرف

ردیف قاف

درد ہی خود ہی خود دوا ہے عشق
شیخ کیا جانے تو کہ کیا ہے عشق

تو نہ ہووے تو نظم کل اُٹھ جائے
سچے ہیں شاعراں خدا ہے عشق

ردیف کاف تازی

بے چین مجھ کو چاہتا ہردم ہی زیرِ خاک
چھاتی پہ بعد مرگ بھی دل جم ہی زیرِ خاک

آسودگی جو چاہے تو مرنے پہ دل کو رکھ
آشفتگی طبع بہت کم ہی زیرِ خاک

تنہا تو اپنی گور میں رہنے پہ بعدِ مرگ
مت اضطراب کریو کہ عالم ہی زیرِ خاک

[1] ہماری طرف سے دیکھو۔ یعنی ہماری خاطر سے یا ہمارے کہنے سے دیکھو۔

ردیف عین مہملہ

سب پہ روشن ہے کہ شب مجلس میں جب آئی ہے شمع
اس بھبوکے سے کو بیٹھا دیکھ جلجاتی ہے شمع

ردیف غین معجمہ

ہم اور تیری گلی سے سفر دروغ دروغ
کہاں دماغ ہمیں اس قدر دروغ دروغ

تم اور ہم سے محبّت تمھیں خلاف خلاف
ہم اور اُلفتِ خوبِ دگر دروغ دروغ

غلط غلط کہ رہیں تم سے ہم تنک غافل
تم اور پوچھو ہماری خبر دروغ دروغ

فروغ کچھ نہیں دعوی کو صبح صادق کے
شبِ فراق کو کب ہے سحر دروغ دروغ

کسو کے کہنے سے مت بدگماں ہو میرؔ سے تو
وہ اور اُس کو کسو پر نظر دروغ دروغ

شیخ سچ خوب ہے بہشت کا باغ
جائیں گے گر وفا کرے گا دماغ

ردیف فا

آجکل کا ہے کو بتلاتے ہو[1] گستاخی معاف
راستی یہ ہے کہ وعدے ہیں تمھارے سب خلاف

آہ برچھی سی لگی تھی تیر سی دل کی طپش
ہجر کی شب مجھ پہ گزری غیرتِ روزِ مصاف

ایک دن میں نے لکھا تھا اُس کو اپنا دردِ دل
آج تک جاتا نہیں سینے سے خامے کے شگاف

پاؤں پر سے اپنے میرا سر اُٹھانے مت مجھکو
تیغ باندھی ہے میاں تم نے کمر میں خوش غلاف

صف اُلٹ جا عاشقوں کی گر ترے ابرو ہلیں
ایک دم تلوار کے چلنے میں ہووے ملک صاف

شیخ مت روکش ہو مستوں کا تو اس جبّے اُپر
لینے استنجے کو ڈھیلا تیری ٹل جاتی ہے ناف

عشق کے بازار میں سودا نہ کیجو تو تو میرؔ
سر کو جب واں بیچ چکتے ہیں تو یہ ہے دستِ لاف

غالب ہے تیرے عہد میں بیداد کی طرف
ہر خون گرفتہ جائے ہے جلاد کی طرف

کن نے لیا ہے تم سے مچلکہ کہ داد دو
ملک کان ہی رکھا کرو فریاد کی طرف

ہر تار زلف قیمتِ فردوس ہے ترا
کرتا ہے کون طرّہ شمشاد کی طرف

[1] آجکل بتلانا - وعدہ خلافی کرنا۔

میرؔ گم کردہ چمن زمزمہ پرداز ہے ایک
جس کی لے دام سے تا گوش گل آواز ہی ایک

کچھ ہوا ای مرغ قفس لطف نہ جاوے اُس سے
نوحہ یا نالہ ہر اک بات کا انداز ہی ایک

ناتوانی سے نہیں بال فشانی کا دماغ
ورنہ تا باغ قفس سے مری پرواز ہی ایک

گوش کو ہوش کی ٹک کھول کے سُن شور جہاں
سب کی آواز کے پردے میں سخن ساز ہی ایک

چاہے جس شکل سے تمثال صفت اُس میں در آ
عالم آئینہ کے مانند در باز ہے ایک

بالیں پہ میری آوے گا تو گھر سے جب تلک
کر جاؤں گا سفر ہی میں دُنیا سے تب تلک

اتنا دن اور دل ہے طپش کر لیں کاوشیں
یہ مجہلہ[۱] تمام ہی ہے آج شب تلک

نقاش کیونکہ کھینچ چکا تو شبیہ یار
کھینچوں ہوں ایک ناز ہی اُسکا میں اب تلک

شب کوتہ اور قصہ مری جان کا دراز
القصہ اب کہا کروں تجھ سے میں کب تلک

باقی یہ داستان ہی اور کل کی رات ہے
گر جان میری میرؔ نہ آ پہنچے لب تلک

شوق ہے تو ہے اُس کا گھر نزدیک
دوری رہ ہے راہ بر نزدیک

آہ کرنے میں دم کو سادھے رہ
کہتے ہیں دل سے ہی جگر نزدیک

ڈوبیں دریا و کوہ و شہر و دشت
تجھ سے سب کچھ ہی چشم تر نزدیک

حرف دوری ہی گرچہ انشا لیک
دیجو خط جا کے نامہ بر نزدیک

دور اب بیٹھتے ہیں مجلس میں
ہم جو تم سے تھے بیشتر نزدیک

خبر آتی ہے سو بھی دور سے یہاں
آؤ یکبار بے خبر نزدیک

توشۂ آخرت کا فکر رہے
جی سے جانے کا ہی سفر نزدیک

دور پھرنے کا ہم سے وقت ہی کیا
پوچھ کچھ حال بیٹھ کر نزدیک

مر بھی رہ میرؔ شب بہت رویا
ہی مری جان اب سحر نزدیک

کہیں پہنچو جو مجھ بے پا و سر تک
کہ پہنچا شمع ساں داغ اب جگر تک

کچھ اپنی آنکھ میں یہاں کا نہ آیا
خزف سے لے کے دیکھا دُرِّ تر تک

جسے شب آگ سا دیکھا سُلگتے
اُسے پھر خاک ہی پایا سحر تک

[۱] مجہلہ مجازاً مخمصہ جھگڑا، جھمیلا۔ عوام اسکو مجہلا کہتے ہیں

رویا تھا نزع میں میں اُسے یاد کر بہت ‏ ‏ اب تک مری ہر ایک مژہ نم ہے زیرِ خاک

کیا آسماں پہ کھینچے کوئی میرؔ آپ کو
جانا جہاں سے سب کو مسلّم ہے زیرِ خاک

اب وہ نہیں کہ شورش رہتی تھی آسماں تک ‏ ‏ آشوبِ نالہ اب تو پہنچا ہے لامکاں تک

یہ بھی گیا بدن کا سب ہو کے گوشت پانی ‏ ‏ اب کارد اے عزیزاں پہنچی ہے استخواں تک

تصویر کی سی شمعیں خاموش جلتے ہیں ہم ‏ ‏ سوزِ درون ہمارا آتا نہیں زباں تک

روتے پھرے ہیں لوہو اک عمر اس گلی میں ‏ ‏ باغ و بہار ہی ہے جاوے نظر جہاں تک

آنکھیں جو روتے روتے جاتی رہیں بجا ہے ‏ ‏ انصاف کر کہ کوئی دیکھے ستم کہاں تک

بے لطف تیرے کیونکر تجھ تک پہنچ سکیں ہم ‏ ‏ ہیں سنگِ راہ اپنے کتنے یہاں سے وہاں تک

ہم بے نصیب سر کو تجھ سے کیوں نہ پھوڑیں ‏ ‏ پہنچا کبھو نہ جبہہ اُس سنگِ آستاں تک

مانند طیرِ نوپر اٹھے جہاں سے گئے ہم ‏ ‏ دشوار ہے ہمارا آنا پھر آشیاں تک

تن کام میں ہمارے دیتا نہیں وہی کچھ
حاضر ہیں میرؔ ہم تو اپنی طرف سے جاں تک

ہے بعد مرے مرگ کے آثار سے اب تک ‏ ‏ سوکھا نہیں لوہو در و دیوار سے اب تک

رنگینیِ عشق اُس کی ملے پر ہوئی معلوم ‏ ‏ صحبت نہ ہوئی تھی کسی خونخوار سے اب تک

کب سے متحمل ہے جفاؤں کا دلِ زار ‏ ‏ زنہار وفا ہو نہ سکی یار سے اب تک

ابرو ہی کی جنبش نے یہ سب کام کیے ہیں ‏ ‏ مارا نہیں اُن نے کوئی تلوار سے اب تک

وعدہ بھی قیامت کا بھلا کوئی ہے وعدہ ‏ ‏ پر دل نہیں خالی غمِ دیدار سے اب تک

مدت ہوئی گھٹ گھٹ کے ہمیں شہر میں مرتے ‏ ‏ واقف نہ ہوا کوئی اس اسرار سے اب تک

برسوں ہوئے دل سوختہ بلبل کو موے لیک ‏ ‏ اک دود سا اُٹھتا ہے چمن زار سے اب تک

کیا جانئے ہوتے ہیں سخن لطف کے کیسے ‏ ‏ پوچھا نہیں اُن نے تو ہمیں پیار سے اب تک

اس باغ میں اغلب ہے کہ سرزد نہ ہوا ہو ‏ ‏ یوں نالہ کسو مرغِ گرفتار سے اب تک

خط آئے پہ ہے دن ہی سیہ تم سے ہمارا ‏ ‏ جاتا نہیں اندھیر یہ سرکار سے اب تک

نکلا تھا کہیں وہ گلِ نازک شبِ مہ میں ‏ ‏ سو کوفت نہیں جاتی ہے رخسار سے اب تک

دیکھا تھا کہیں سایہ ترے قد کا چمن میں ‏ ‏ ہیں میرؔ جی آوارہ پریدار[۱] سے اب تک

[۱] پریدار - آسیب زدہ - جس پر پری کا سایہ ہو -

ردیف کاف فارسی

جب سے خط ہے سیاہ خال کے تھانگ
تب سے لٹتی ہے ہند چاروں دانگ

بات اہل کی چلی ہی جاتی ہے
ہے مگر عوج[1] بن عنق کی ٹانگ

بن جو کچھ بن سکے جوانی میں
رات تو تھوڑی ہے بہت ہے سانگ

عشق کا شور کوئی چھپتا ہے
نالۂ عندلیب ہے گل بانگ

اس ذقن میں بھی سبزی ہے خط کی
دیکھو جیدھر کوئی پڑی ہے بھانگ

کس طرح ان سے کوئی گرم ملے
سیم تن پگھلے جاتے ہیں جوں رانگ

چلی جاتی ہے حسب قدر بلند
دُور تک اس پہاڑ کی ہے ڈانگ

نقرہ باطل تھا طور پر اپنے
ورنہ جاتے یہ دوڑ ہم بھی پھلانگ

میں نے کیا اس غزل کو سہل کیا
قافیے ہی تھے اس کے اوٹ پٹانگ

میر بندوں سے کام کب نکلا
مانگنا ہے جو کچھ خدا سے مانگ

ردیف لام

فصلِ خزاں میں سیر جو کی ہم نے جائے گل
چھانی چمن کی خاک نہ تھا نقشِ پائے گل

اللہ رے عندلیب کی آوازِ دل خراش
جی ہی نکل گیا جو کہا اُن نے ہائے گل

مقدور تک شراب سے رکھ انکھڑیوں میں رنگ
یہ چشمک پیالہ ہے ساقی ہوائے گل

یہ دیکھ سینہ داغ سے رشکِ چمن ہے یہاں
بلبل ستم ہوا نہ جو تو نے بھی کھائے گل

بلبل ہزار جی سے خریدار اُس کی ہے
ای گلفروش کر تو سمجھ کر بہائے گل

نکلا ہے ایسی خاک سے کس سادہ رو کی یہ
قابل درود بھیجنے کے ہے صفائے گل

بارے سرشکِ سرخ کے داغوں سے رات کو
بستر پر اپنے سوتے تھے ہم بھی بچھائے گل

---

[1] عوج بن عنق ایک طویل القامت آدمی کا نام جو زمانۂ حضرت آدم علیہ السلام میں پیدا ہوا اور موسیٰ علیہ السلام کے زمانے تک زندہ رہا۔ اس کی عمر تین ہزار برس کی ہوئی۔ کہتے ہیں کہ طوفانِ نوحؑ میں پانی کمر تک آیا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا اُس کے ٹخنے پر مارا۔ اُس صدمے سے وہ مر گیا۔ اہلِ لغت کہتے ہیں کہ اُس کے باپ کا نام عوق (بالضم) ہے عنق جو عام طور پر مشہور ہے یہ غلط ہے ۱۲ آسی (فرہنگ آنندراج)

ترا منھ چاند سا دیکھا ہے شاید / کہ انجم رہتے ہیں ہر شب ادھر تک
جب آیا آہ تب اپنے ہی سر پر / گیا یہ ہاتھ کب اُس کی کمر تک
ہم آوازوں کو سیر اب کی مبارک / پر و بال اپنے ایسے ہی تھے پر تک
کھنچی کیا کیا خرابی زیر دیوار / ولے آیا نہ وہ ٹک گھر سے در تک
گلی تک تیری لایا تھا ہمیں شوق / کہاں طاقت کہ اب پھر جائیں گھر تک

قطعہ

یہی دردِ جدائی ہے جو اس شب / تو آتا ہے جگر مژگانِ تر تک
دکھائی دیں گے ہم میت کے رنگوں / اگر رہ جائیں گے جیتے سحر تک
کہاں پھر شور و شیون جب گیا میر / یہ ہنگامہ ہے اُس ہی نوحہ گر تک

دست و پا مارے وقتِ بسمل تک / ہاتھ پہنچا نہ پائے قاتل تک
کعبہ پہنچا تو کیا ہوا اے شیخ / سعی کر ٹک پہنچ کسی دل تک
درپئے محمل اُس کے جیسے جرس / میں بھی نالاں ہوں ساتھ منزل تک
بجھ گئے ہم چراغ سے باہر / کہیو اے بادِ شمعِ محفل تک
نہ گیا میر اپنی کشتی سے / ایک بھی تختہ پارہ ساحل تک

جاتے ہیں لے خرابے کو سیل آسماں تلک / طوفاں ہے میرے اشک ندامت سے یہاں تلک
شاید کہ دیوے رخصتِ گلشن ہو بے قرار / میرے قفس کو لے تو چلو باغباں تلک
قیدِ قفس سے چھوٹ کے دیکھا جلا ہوا / پہنچے نہ ہوتے کاشکے ہم آشیاں تلک
اتنا ہوں ناتواں کہ در دل سے اب گلہ / آتا ہی ایک عمر میں میری زباں تلک
میں ترکِ عشق کرکے ہوا گوشہ گیر میر / ہوتا پھروں خراب جہاں میں کہاں تلک

کب دسترس ہے لعل کو تیرے سخن تلک / رسوائیاں گئی ہیں عقیقِ یمن تلک
آزادگی یہ چھوڑ قفس ہم نہ جا سکے / حسنِ سلوکِ ضعف سے صحنِ چمن تلک
تر دستیاں ہوں دست و گریباں ہاتھ کے / زیر زمیں بھی پہنچیں گے چاک کفن تلک
مارا گیا خرامِ بتاں پر سفر میں میر / اے کبک کہتا جائیو اس کے وطن تلک

میر گم کردہ چمن زمزمہ پرداز ہے ایک
جس کی بے دام سے تا گوش گل آواز ہی ایک

کچھ ہوا ای مرغِ قفس لطف نہ جاوے اُس سے
نوحہ یا نالہ ہر اک بات کا انداز ہی ایک

ناتوانی سے نہیں بال فشانی کا دماغ
ورنہ تا بائع قفس سے مری پرواز ہی ایک

گوش کو ہوش کی ٹک کھول کے سُن شورِ جہاں
سب کی آواز کے پردے میں سخن ساز ہی ایک

چاہے جس شکل سے تمثال صفت اُس میں درآ
عالمِ آئینہ کے مانند در باز ہے ایک

بالیں پہ میری آوے گا تو گھر سے جب تلک
کر جاؤں گا سفر ہی میں دُنیا سے تب تلک

اتنا دن اور دل سے طپش کر لیں کاوشیں
یہ مُجھلہ[1] تمام ہی ہے آج شب تلک

نقاش کیونکہ کھینچ چکا تو شبیہِ یار
کھینچوں ہوں ایک ناز ہی اُسکا میں اب تلک

شب کوتہ اور قصہ مری جان کا دراز
القصّہ اب کہا کروں تجھ سے میں کب تلک

باقی یہ داستان ہی اور کل کی رات ہے
گر جان میری میر نہ آپہنچے لب تلک

شوق ہے تو ہے اُس کا گھر نزدیک
دوری رہ ہے راہ بر نزدیک

آہ کرنے میں دم کو سادھے رہ
کہتے ہیں دل سے ہی جگر نزدیک

ڈوبیں دریا و کوہ و شہر و دشت
تجھ سے سب کچھ ہی چشمِ تر نزدیک

حرف دوری ہی گرچہ انشا لیک
دیجو خط جا کے نامہ بر نزدیک

دور اب بیٹھتے ہیں مجلس میں
ہم جو تم سے تھے بیشتر نزدیک

خبر آتی ہے سو بھی دور سے یہاں
آؤ یکبار بے خبر نزدیک

توشۂ آخرت کا فکر رہے
جی سے جانے کا ہی سفر نزدیک

دور پھرنے کا ہم سے وقت ہی کیا
پوچھ کچھ حال بیٹھ کر نزدیک

مر بھی رہ میر شب بہت رویا
ہی مری جان اب سحر نزدیک

کہیں پہنچو جو مجھ بے پا و سر تک
کہ پہنچا شمع ساں داغ اب جگر تک

کچھ اپنی آنکھ میں یہاں کا نہ آیا
خزف سے لیکے دیکھا دُرِّ تر تک

جسے شب آگ سا دیکھا سُلگتے
اُسے پھر خاک ہی پایا سحر تک

[1] مجھلہ مجازاً مخمصہ، جھگڑا، جھمیلا۔ عوام اسکو جھبلا کہتے ہیں

رویا تھا نزع میں میں اُسے یاد کر بہت
اب تک مری ہر ایک مژہ نم ہے زیرِ خاک

کیا آسماں پہ کھینچے کوئی میرؔ آپ کو
جانا جہاں سے سب کو مسلّم ہے زیرِ خاک

اب وہ نہیں کہ شورش رہتی تھی آسماں تک
آشوبِ نالہ اب تو پہنچا ہے لامکاں تک

یہ بھی گیا بدن کا سب ہو کے گوشت پانی
اب کار دا اے عزیزاں پہنچی ہے استخواں تک

تصویر کی سی شمعیں خاموش جلتے ہیں ہم
سوزِ دروں ہمارا آتا نہیں زباں تک

روتے پھرے ہیں لوہو اک عمر اس گلی میں
باغ و بہار ہی ہے جاوے نظر جہاں تک

آنکھیں جو روتے روتے جاتی رہیں بجا ہے
انصاف کر کہ کوئی دیکھے ستم کہاں تک

بے لطف تیرے کیونکر تجھ تک پہنچ سکیں ہم
ہیں سنگِ راہ اپنے کتنے یہاں سے وہاں تک

ہم بے نصیب سر کو تجھ سے کیوں نہ پھوڑیں
پہنچا کبھو نہ جبہہ اُس سنگِ آستاں تک

مانندِ طیرِ نو پر اٹھے جہاں سے گئے ہم
دشوار ہے ہمارا آنا پھر آشیاں تک

تن کام میں ہمارے دیتا نہیں وہی کچھ
حاضر ہیں میرؔ ہم تو اپنی طرف سے جاں تک

ہے بعد مرے مرگ کے آثار سے اب تک
سوکھا نہیں لوہو در و دیوار سے اب تک

رنگینیٔ عشق اُس کی ملے پر ہوئی معلوم
صحبت نہ ہوئی تھی کسی خونخوار سے اب تک

کب سے متحمل ہے جفاؤں کا دلِ زار
زنہار وفا ہو نہ سکی یار سے اب تک

ابرو ہی کی جنبش نے یہ پتھراؤ کئے ہیں
مارا نہیں اُن نے کوئی تلوار سے اب تک

وعدہ بھی قیامت کا بھلا کوئی ہے وعدہ
پر دل نہیں خالی غمِ دیدار سے اب تک

مدت ہوئی گھٹ گھٹ کے ہمیں شہر میں مرتے
واقف نہ ہوا کوئی اس اسرار سے اب تک

برسوں ہوئے دل سوختہ بلبل کو موئے لیک
اک دود سا اُٹھتا ہے چمن زار سے اب تک

کیا جانئے ہوتے ہیں سخن لطف کے کیسے
پوچھا نہیں اُن نے تو ہمیں پیار سے اب تک

اس باغ میں اغلب ہے کہ سرزد نہ ہوا ہو
یوں نالہ کسو مرغِ گرفتار سے اب تک

خط آئے پہ ہے دن ہی سیہ تم سے ہمارا
جاتا نہیں اندھیر یہ سرکار سے اب تک

نکلا تھا کہیں وہ گلِ نازک شبِ مہ میں
سو کوفت نہیں جاتی ہے رخسار سے اب تک

دیکھا تھا کہیں سایہ ترے قد کا چمن میں
ہیں میرؔ جی آوارہ پریدار[۵] سے اب تک

---

۵ پریدار - آسیب زدہ جس پر پری کا سایہ ہو۔

ردیف کاف فارسی

جب سے خط ہے سیاہ خال کے تھانگ ۔۔۔ تب سے لٹتی ہے ہند چاروں دانگ
بات اہل کی چلی ہی جاتی ہے ۔۔۔ ہے مگر عوج[1] بن عنق کی ٹانگ
بن جو کچھ بن سکے جوانی میں ۔۔۔ رات تو تھوڑی ہے بہت ہے سانگ
عشق کا شور کوئی چھپتا ہے ۔۔۔ نالۂ عندلیب ہے گل بانگ
اس ذقن میں بھی سبزی ہے خط کی ۔۔۔ دیکھو جیدھر کوئی پڑی ہی بھانگ
کس طرح اُن سے کوئی گرم ملے ۔۔۔ سیم تن پگھلے جاتے ہیں جوں رانگ
چلی جاتی ہے حسب قدر بلند ۔۔۔ دُور تک اس پہاڑ کی ہے ڈانگ
نقرہ باطل تھا طور پر اپنے ۔۔۔ ورنہ جاتے یہ دَوڑ ہم بھی پھلانگ
میں نے کیا اس غزل کو سہل کیا ۔۔۔ قافیے ہی تھے اس کے اوٹ پٹانگ

میر بندوں سے کام کب نکلا
مانگنا ہے جو کچھ خدا سے مانگ

ردیف لام

فصلِ خزاں میں سیر جو کی ہم نے جائے گل ۔۔۔ چھانی چمن کی خاک نہ تھا نقشِ پائے گل
اللہ رے عندلیب کی آوازِ دل خراش ۔۔۔ جی ہی نکل گیا جو کہا اُن نے ہائے گل
مقدور تک شراب سے رکھ انکھڑیوں میں رنگ ۔۔۔ یہ چشمکِ پیالہ ہے ساقی ہوائے گل
یہ دیکھ سینہ داغ سے رشکِ چمن ہے یہاں ۔۔۔ بلبل ستم ہوا نہ جو تو نے بھی کھائے گل
بلبل ہزار جی سے خریدار اس کی ہے ۔۔۔ اے گلفروش کریو سمجھ کر بہائے گل
نکلا ہے ایسی خاک سے کس سادہ رو کی یہ ۔۔۔ قابل درود بھیجنے کے ہے صفائے گل
بارے سرشکِ سرخ کے داغوں سے رات کو ۔۔۔ بستر پر اپنے سوتے تھے ہم بھی بچھائے گل

[1] عوج بن عنق ایک طویل القامت آدمی کا نام جو زمانۂ حضرت آدم علیہ السلام میں پیدا ہوا اور موسیٰ علیہ السلام کے زمانے تک زندہ رہا۔ اس کی عمر تین ہزار برس کی ہوئی۔ کہتے ہیں کہ طوفانِ نوح ہیں اُس کی کمر تک آیا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا اس کے ٹخنے پر مارا۔ اُس صدمے سے وہ مر گیا۔ اہلِ لغت کہتے ہیں کہ اس کے باپ کا نام عوق (بالضم) ہے عنق جو عام طور پر مشہور ہے یہ غلط ہے ۱۲ آسی (فرہنگ آنندراج)

ترا منہ چاند سا دیکھا ہے شاید
کہ انجم رہتے ہیں ہر شب ادھر تک

جب آیا آہ تب اپنے ہی سر پر
گیا یہ ہاتھ کب اُس کی کمر تک

ہم آوازوں کو سیر اب کی مبارک
پر و بال اپنے ایسے ہی تھے پر تک

کھنچی کیا کیا خرابی زیرِ دیوار
ولے آیا نہ وہ ٹک گھر سے در تک

گلی تک تیری لایا تھا ہمیں شوق
کہاں طاقت کہ اب پھر جائیں گھر تک

قطعہ

یہی دردِ جُدائی ہے جو اس شب
تو آتا ہے جگر مژگانِ تر تک

دکھائی دیں گے ہم میت کے رنگوں
اگر رہ جائیں گے جیتے سحر تک

کہاں پھر شور و شیون جب گیا میرؔ
یہ ہنگامہ ہے اُس ہی نوحہ گر تک

دست و پا مارے وقتِ بسمل تک
ہاتھ پہنچا نہ پائے قاتل تک

کعبہ پہنچا تو کیا ہوا اے شیخ
سعی کر ٹک پہنچ کسی دل تک

در پے محمل اُس کے جیسے جرس
میں بھی نالاں ہوں ساتھ منزل تک

بجھ گئے ہم چراغ سے باہر
کہیو اے باد شمعِ محفل تک

نہ گیا میرؔ اپنی کشتی سے
ایک بھی تختہ پارہ ساحل تک

جاتے ہیں لے خرابے کو سیل آسماں تلک
طوفاں ہے میرے اشک ندامت سے یہاں تلک

شاید کہ دلوے رخصتِ گلشن ہو بے قرار
میرے قفس کو لے تو چلو باغباں تلک

قیدِ قفس سے چھوٹ کے دیکھا جلا ہوا
پہنچے نہ ہوتے کاشکے ہم آشیاں تلک

اتنا ہوں ناتواں کہ در دل سے اب گلہ
آتا ہے ایک عمر میں میری زباں تلک

ہیں ترکِ عشق کر کے ہوا گوشہ گیر میرؔ
ہوتا پھرے خراب جہاں میں کہاں تلک

کب دسترس ہے لعل کو تیرے سخن تلک
رسوائیاں گئی ہیں عقیق یمن تلک

آزادگی یہ چھوڑ قفس ہم نجا سکے
حُسنِ سلوک ضعف سے صحنِ چمن تلک

تر دستیاں ہوں دست و گریبان ہاتھ کے
زیرِ زمیں بھی پہنچیں گے چاک کفن تلک

مارا گیا خرامِ بتاں پر سفر میں میرؔ
اے کبک کہتا جائیو اُس کے وطن تلک

ردیف کاف فارسی

جب سے خط ہے سیاہ خال کے تھانگ — تب سے لٹتی ہے ہند چاروں دانگ

بات اہل کی چلی ہی جاتی ہے — ہے مگر عوج[1] بن عنق کی ٹانگ

بن جو کچھ بن سکے جوانی میں — رات تو تھوڑی ہے بہت ہے سانگ

عشق کا شور کوئی چھپتا ہے — نالۂ عندلیب ہے گل بانگ

اس ذقن میں بھی سبزی ہے خط کی — دیکھو جیدھر کوئی پڑی ہے بھانگ

کس طرح اُن سے کوئی گرم ملے — سیم تن پگھلے جاتے ہیں جوں رانگ

چلی جاتی ہے حسب قدر بلند — دُور تک اس پہاڑ کی ہے ڈانگ

نقرہ باطل تھا طور پر اپنے — ورنہ جاتے یہ دُوڑ ہم بھی پھلانگ

میں نے کیا اس غزل کو سہل کیا — قافیے ہی تھے اس کے اوٹ پٹانگ

میرؔ بندوں سے کام کب نکلا — مانگنا ہے جو کچھ خدا سے مانگ

ردیف لام

فصلِ خزاں میں سیر جو کی ہم نے جائے گل — چھانی چمن کی خاک نہ تھا نقشِ پائے گل

اللہ رے عندلیب کی آوازِ دل خراش — جی ہی نکل گیا جو کہا اُن نے ہائے گل

مقدور تک شراب سے رکھ انکھڑیوں میں رنگ — یہ چشمکِ پیالہ ہے ساقی ہوائے گل

یہ دیکھ سینہ داغ سے رشکِ چمن ہے یہاں — بلبل ستم ہوا نہ جو تونے بھی کھائے گل

بلبل ہزار جی سے خریدار اُس کی ہے — اے گلفروش کریو سمجھ کر بہائے گل

نکلا ہے ایسی خاک سے کس سادہ رو کی یہ — قابل درود بھیجنے کے ہے صفائے گل

بارے سرشکِ سرخ کے داغوں سے رات کو — بستر پر اپنے سوتے تھے ہم بھی بچھائے گل

[1] عوج بن عنق ایک طویل القامت آدمی کا نام جو زمانۂ حضرت آدم علیہ السلام میں پیدا ہوا اور موسیٰ علیہ السلام کے زمانے تک زندہ رہا۔ اس کی عمر تین ہزار برس کی ہوئی۔ کہتے ہیں کہ طوفانِ نوحؑ میں پانی کمر تک آیا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا اُس کے ٹخنے پر مارا۔ اُس صدمے سے وہ مر گیا۔ اہل لغت کہتے ہیں کہ اُس کے باپ کا نام عوق (بالضم) ہے عنق جو عام طور پر مشہور ہے یہ غلط ہے ۱۲ آسی (فرہنگ آنند راج)

ترا منھ چاند سا دیکھا ہے شاید — کہ انجم رہتے ہیں ہر شب ادھر تک
جب آیا آہ تب اپنے ہی سر پر — گیا یہ ہاتھ کب اُس کی کمر تک
ہم آوازوں کو سیر اب کی مبارک — پر و بال اپنے ایسے ہی تھے پر تک
کھنچی کیا کیا خرابی زیرِ دیوار — ولے آیا نہ وہ ٹک گھر سے در تک
گلی تک تیری لایا تھا ہمیں شوق — کہاں طاقت کہ اب پھر جائیں گھر تک
یہی دردِ جدائی ہے جو اس شب — قطعہ — تو آتا ہے جگر مژگانِ تر تک
دکھائی دیں گے ہم میت کے رنگوں — اگر رہ جائیں گے جیتے سحر تک

کہاں پھر شور و شیون جب گیا میر
یہ ہنگامہ ہے اُس ہی نوحہ گر تک

دست و پا مارے وقتِ بسمل تک — ہاتھ پہنچا نہ پائے قاتل تک
کعبہ پہنچا تو کیا ہوا اے شیخ — سعی کر ٹک پہنچ کسی دل تک
درپئے محمل اُس کے جیسے جرس — میں بھی نالاں ہوں ساتھ منزل تک
بجھ گئے ہم چراغ سے باہر — کہیو اے باد شمعِ محفل تک

نہ گیا میر اپنی کشتی سے
ایک بھی تختہ پارہ ساحل تک

جاتے ہیں لے خرابے کو سیل آسماں تلک — طوفاں ہے میرے اشکِ ندامت سے یہاں تلک
شاید کہ دیوے رخصتِ گلشن ہو بے قرار — میرے قفس کو لے تو چلو باغباں تلک
قیدِ قفس سے چھوٹ کے دیکھا جلا ہوا — پہنچے نہ ہوتے کاشکے ہم آشیاں تلک
اتنا ہوں ناتواں کہ در دل سے اب گلہ — آتا ہے ایک عمر میں میری زباں تلک

میں ترکِ عشق کر کے ہوا گوشہ گیر میر
ہوتا پھروں خراب جہاں میں کہاں تلک

کب دسترس ہے لعل کو تیرے سخن تلک — رسوائیاں گئی ہیں عقیقِ یمن تلک
آزادگی یہ چھوڑ قفس ہم نجا سکے — حسنِ سلوک ضعف سے صحنِ چمن تلک
تر دستیاں ہوں دست و گریباں ہاتھ کے — زیرِ زمیں بھی پہنچیں گے چاک کفن تلک
مارا گیا خرامِ بتاں پر سفر میں میر — اے کبک کہتا جائیو اُس کے وطن تلک

جانیں ہیں فرشِ رہ تری مت ہال ہال[۱] چل
اے رشکِ حور آدمیوں کی سی چال چل

اک آن میں بدلتی ہے صورت جہاں کی
جلد اس نگار خانہ سے کر انتقال چل

سالک بہر طریق بدن ہے وبالِ جاں
یہ بوجھ تیرے ساتھ جو ہے اس کو ڈال چل

آوارہ میرے ہونیکا باعث وہ زلف ہے
کافر ہوں اس میں ہووے اگر ایک بال چل

دُنیا ہے میر حادثہ گاہِ مقرری
یہاں سے تو اپنا پانوں شتابی نکال چل

شرط یہ ابر میں ہم میں ہے کہ رو دیں گے کل
صبحگہ اُٹھتے ہی عالم کو ڈبو دیں گے کل

آج آوارہ ہواے بالِ اسیرانِ قفس
یہ گل و باغ و خیابان نہ ہو دیں گے کل

وعدۂ وصل رہا ہے شبِ آئندہ پہ میر
بخت خوابیدہ جو ٹک جاگتے سو دیں گے کل

مندا ہے اختلاط کا بازار آج کل
لگتا نہیں ہے دل کا خریدار آج کل

اس مہلتِ دو روزہ میں خطرے ہزار ہیں
اچھا ہے رہ سکو جو خبردار آج کل

اُوباشوں ہی کے گھر تجھے پانے لگے ہیں روز
مارا پڑے گا کوئی طلبگار آج کل

ملنے کی رات داخلِ ایام کیا نہیں
برسوں ہوئی کہاں تئیں اے یار آج کل

گلزار ہو رہا ہے مری دم سے کوئی یار
اک رنگ پر ہے دیدۂ خونبار آج کل

تا شام اپنا کام کھنچے کیونکہ دیکھیے
پڑتی نہیں ہے جی کو جفا کار آج کل

کعبہ تلک تو سنتے ہیں ویرانہ و خراب
آباد ہے سو خانۂ خمار آج کل

ٹھوکر دلوں کو لگنے لگی ہے خرام میں
لاوے گی اک بلا تری رفتار آج کل

ایسا ہی مغبچوں میں جو آتا ہے شیخ جی
تو جا رہے ہیں جبہ و دستار آج کل

حیران میں ہی حال کی تدبیر میں نہیں
ہر اک کو شہر میں ہے یہ آزار آج کل

اچھا نہیں ہے میر کا احوال ان دنوں
غالب کہ ہو چکے گا یہ بیمار آج کل

کرو تم یاد گر ہم کو رہے تم میں بھی اکثر دل
مثل مشہور ہے یہ تو کہ ہے دُنیا میں دل بر دل

بھلا تم نقد دل لیکر ہمیں دشمن گنو اب تو
کبھو کچھ ہم بھی کرلیں گے حسابِ دوستاں در دل

[۱] ہال ہال ۔ جلدی جلدی ۱۲

آ عندلیب صلح کریں جنگ ہو چکی
لے ای زباں دراز تو سب کچھ سوائے گل

گلچیں سمجھ کے چینیو کہ گلشن میں میر کے
لخت جگر پڑے ہیں نہیں برگہائے گل

گل کی جفا بھی جانی دیکھی وفائے بلبل
یکمشت پر پڑے ہیں گلشن میں جائے بلبل

کر سیر جذب الفت گلچیں نے کل چمن میں
توڑا تھا شاخ گل کو نکلی صدائے بلبل

کھٹکے ہیں خار ہو کر ہر شب دل چمن میں
اتنے لب و دہن پر یہ نالہائے بلبل

یکرنگیوں کی راہیں طے کرکے مر گیا ہے
گل میں رگیں نہیں یہ ہیں نقش پائے بلبل

آئی بہار و گلشن گل سے بھرا ہے لیکن
ہر گوشۂ چمن میں خالی ہے جائے بلبل

پیغام بے غرض بھی سنتے نہیں ہیں خوباں
پہنچی نہ گوش گل تک آخر دعائے بلبل

یہ دلخراش نالے ہر شب کے میر تیرے
کر دیں گے بے نمک ہی شور نوائے بلبل

کیسا چمن اسیری میں کس کو ادھر خیال
پرواز خواب ہو گئی ہے بال و پر خیال

مشکل ہے مٹ گئے ہوئے نقشوں کی پھر نمود
جو صورتیں بگڑ گئیں ان کا نہ کر خیال

مو کو عبث ہے تاب کلی یوں ہی تنگ ہے
اس کا دہن ہے وہم و گمان و کمر خیال

رخسار پر ہمارے ڈھلکنے کو اشک کے
دیکھے ہے جو کوئی سو کرے ہے گہر خیال

کس کو دماغ شعر و سخن ضعف میں کہ میر
اپنا رہے ہے اب تو ہمیں بیشتر خیال

سیر کر عندلیب کا احوال
ہیں پریشاں چمن میں کچھ پر و بال

تپ غم تو گئی طبیب و لے
پھر نہ آیا کبھو مزاج بحال

سبزۂ نو رستہ رہگذار کا ہوں
سر اٹھایا کہ ہو گیا پامال

کیوں نہ دیکھوں چمن کو حسرت سے
آشیاں تھا مرا بھی یاں پر سال

سرد مہری کی بسکہ گلرو نے
اوڑھی ابر بہار نے بھی شال

ہجر کی شب کو یاں تئیں تڑپا
کہ ہوا صبح ہوتے میرا وصال

ہم تو سہ گزرے کجروی تیری
نہ نبھے گی پر اے فلک یہ چال

دیدۂ تر پہ شب رکھا تھا میر
لکۂ ابر ہے مرا رومال

ہو عاشقوں میں اُس کے تو آؤ میر صاحب | قطعہ گردن کو اپنی موسے باریک ترکرو تم

کیا لطف ہو وگرنہ جس دم وہ تیغ کھینچے
سینہ سپر کریں ہم قطعِ نظر کرو تم

جاناکہ شغل رکھتے ہو تیر و کماں سے تم | پر مل چلا کرو بھی کسو خستہ جاں سے تم
ہم اپنی چاک جیب کو سی رہتے یا نہیں | پھاٹے میں پانوں بیچ کو آئے کہاں سے تم
اب دیکھتے ہیں خوب تو وہ بات ہی نہیں | کیا کیا وگرنہ کہتے تھے اپنی زباں سے تم
تنکے بھی تم ٹھہرتے کہیں دیکھے ہیں تنک | چشمِ وفا رکھو نہ خسانِ جہاں سے تم
جاؤ نہ دل سے منظرِ تن میں ہے جا یہی | پچھتاؤ گے اُٹھو گے اگر اس مکاں سے تم
قصہ مرا سنوگے تو جاتی رہے گی نیند | آرامِ چشم مت رکھو اس داستاں سے تم
کھل جائیں گی پھر آنکھیں جو مرجائیگا کوئی | آتے نہیں ہو باز مرے امتحاں سے تم
جتنے تھے کل تم آج نہیں پاتے اتنا ہم | ہردم چلے ہی جاتے ہو اب پرماں سے تم

رہتے نہیں ہو بن گئے میر اس گلی میں رات
کچھ راہ بھی نکالو سگِ پاسباں سے تم

کرتے نہیں ہیں دوری سے اب اس کی باک ہم | نزدیک اپنے کب کے ہوئے ہیں ہلاک ہم
بیٹھے ہم اپنے طور پہ مستوں میں جب اُٹھے | جوں ابرِ تر لئے اُٹھے دامن کو پاک ہم
آہستہ اے نسیم کہ اطرافِ باغ کے | مشتاقِ پر فشانی ہیں اک مشتِ خاک ہم
شمع و چراغ و شعلہ و آتش شرار و برق | رکھتے ہیں دل جلے یہ بہم سب تپاک ہم
مستی میں ہم کو ہوش نہیں نشاتین کا | گلشن میں اینڈتے ہیں پڑے زیرِ تاک ہم
جوں برق تیرے کوچہ سے ہنستے نہیں گئے | مانندِ ابر جب اُٹھے تب گریہ ناک ہم

مدت ہوئی کہ چاکِ قفس ہی سے اب تو میر
دکھلا رہے ہیں گل کو دلِ چاک چاک ہم

نہ پھر رکھیں گے تیری رہ میں پا ہم | گئے گزرے ہیں آخر ایسے کیا ہم
کھنچے گی کب وہ تیغِ ناز یارب | رہے ہیں دیر سے سر کو جھکا ہم
نہ جانا یہ کہ کہتے ہیں کسے پیار | رہیں بے لطفیاں ہی یہاں تو باہم

لہ پھٹے میں پانوں ڈالنا کسی کے معاملہ میں خواہ مخواہ دخل دینا۔

رہتا نہیں ہے کوئی گھڑی اب تو یار دل | آزار دل ستمزدہ دل بیقرار دل
ن آزردہ

ردیف میم

کیا کہوں کیا رکھتے تھے تجھ سے تری بیمار چشم | تجھ کو بالیں پر نہ دیکھا کھولی سو سو بار چشم
ہجر میں پاتا نہیں گریہ کے سر رشتے کو میں | ہر سحر اُٹھ باندھے ہی آنسوؤں کا تار چشم
گویا ناسور زخم دل تھی یہ ای ہمنشیں | پیش ازیں کیا کیا ہمیں دکھلاتی تھی خونبار چشم
سیکڑوں ہوں کشتنی تو لاویں کچھ تاب نگاہ | ایک دو کا کام کب ہے اُس سے ہو ملچار چشم
جرم کیا غیروں کا طالع چشم پوشی کرتے ہیں | دیکھ کر احوال میرا موندلے ہی یار چشم

روز و شب وا رہنے سے پیدا ہی میر آثار شوق
ہی کسو نظارگی کا رخنۂ دیوار چشم

کیا بلبل اسیر ہے بے بال و پر کہ ہم | گل کب رکھے ہی ٹکڑے جگر اس قدر کہ ہم
خورشید صبح نکلے ہی اس نور سے کہ تو | شبنم گرہ میں رکھتی ہی یہ چشم تر کہ ہم
جیتے ہیں تو دکھاویں گے دعوائی عندلیب | گل بن خزاں میں اب کی وہ رہتی ہی مر کہ ہم
یہ تیغ ہی یہ طشت ہی یہ ہم ہیں کشتنی | کھیلے ہے کون ایسی طرح جان پر کہ ہم
تلوار س تم لگاتے ہو ہم ہیں گے دم بخود | دنیا میں یہ کرے ہی کوئی در گذر کہ ہم
اس جستجو میں اور خرابی تو کیا کہیں | اتنی نہیں ہوئی ہی صبا دربدر کہ ہم

جیتے ہیں اور روتے ہیں لخت جگر ہے میر
کرتے سنا ہے یوں کوئی قیمہ جگر کہ ہم

آئے تو ہو طبیباں تدبیر گر کرو تم | ایسا نہ ہو کہ میرے جی کا ضرر کرو تم
رنگ شکستہ میرا بے لطف بھی نہیں ہی | ایک آدھ رات کو تو یھاں بھی سحر کرو تم
تھی چشم داشت مجھ کو ای دلبراں یہ تم سے | دل کو مرے اڑا کر آنکھوں میں گھر کرو تم
اُس بزم خوش کے محرم نا آشنا ہیں سارے | کس کو کہوں کہ وھاں تک میری خبر کرو تم
ہی پیچدار از بس راہ وصال و ہجراں | ان دو ہی منزلوں میں برسوں سفر کرو تم
یہ ظلم ہی تو ہم بھی اس زندگی سے گزرے | سوگند ہی تمھیں اب جو در گزر کرو تم
روئے سخن کہاں تک غیروں کی اور آخر | ہم بھی تو آدمی ہیں ٹک منہ ادھر کرو تم

حذر کہ آہِ جگر تفتگاں بلا ہے گرم
ہمیشہ آگ ہی برسی ہے یہاں ہوا ہے گرم

ہزار حیف کہ درگیر صحبت[1] اُس سے نہیں
جگر کی آگ نے ہنگامہ کر رکھا ہے گرم

کہاں ہے تیغ و سپر آفتاب کی بارے
وہ سرد مہر ہمارا بھی اب ہوا ہے گرم

نہ اتنی دارو پی ظالم کہ اس خمار میں ہوں
مزاج گرم ہے پھر اور یہ ہوا ہے گرم

گیا جہان سے خورشید ساں اگرچہ میر
ولیک مجلسِ دُنیا میں اُس کی جا ہے گرم

کرتے ہیں گفتگو سحر اُٹھ کر صبا سے ہم
لڑنے لگے ہیں ہجر میں اُس کے ہوا سے ہم

ہوتا نہ دل کا تا یہ سرانجام عشق میں
لگتے ہی جی کے مر گئے ہوتے بلا سے ہم

چھوٹا نہ اُس کا دیکھنا ہم سے کسو طرح
پایانِ کار مارے گئے اِس ادا سے ہم

داغوں ہی سے بھری رہی چھاتی تمام عمر
یہ پھول گل چنا کئے باغِ وفا سے ہم

غافل نہ اپنی دیدہ درائی سے ہم کو جان
سب دیکھتے ہیں پر نہیں کہتے حیا سے ہم

دو چار دن تو اور بھی آ تو کراہتا
اب ہو چکے ہیں روز کی تیری جفا سے ہم

آئینے کی مثال پس از صد شکست میر
کھینچا بغل میں یار کو دستِ دعا سے ہم

ردیف نون

بیکلی بے خودی کچھ آج نہیں
ایک مدت سے وہ مزاج نہیں

درد اگر یہ ہے تو مجھے بس ہے
اب دوا کی بھی احتیاج نہیں

ہم نے اپنی سی کی بہت لیکن
مرضِ عشق کا علاج نہیں

شہرِ خوبی کو خوب دیکھا میر
جنسِ دل کا کہیں رواج نہیں

وحشت میں ہوں بلا گر وادی پہ اپنی آؤں
مجنوں کی محنتیں سب میں خاک میں ملاؤں

ہنسکر کبھو بلایا تو برسوں تک رُلایا
اُس کی ستم ظریفی کس کے تئیں دکھاؤں

[1] صحبت درگیر ہونا فارسی محاورہ درگیر شدن صحبت کا ترجمہ ہے۔ یعنی صحبت کا قایم رہنا اور نبھنا۔
محسن تاثیر ؎ دیدہ تا بستم خیال آں پری تسخیر شد + تا بگل ایں درگرفتم صحبتم درگیر شد

بنے کیا خال و زلف و خط سے دیکھیں | ہوئے ہیں کتنے یہ کافر فراہم
مرض ہی عشق کا بیڈول ہے کچھ | بہت کرتے ہیں اپنی سی دوا ہم
کہیں پیوند ہوں یارب زمیں کے | پھریں گے اُس سے یوں کبتک جدا ہم
ہوس تھی عشق کرنے میں ولیکن | بہت نادم ہوئے دل کو لگا ہم
کب آگے کوئی مرتا تھا کسی پر | جہاں میں کر گئے رسم وفا ہم
تعارف کیا رہا اہلِ چمن سے | ہوئے اک عمر کے پیچھے رہا ہم

مُوا جس کے لئے اُس کو نہ دیکھا
نہ سمجھے میر کا کچھ مُدعا ہم

اگر راہ میں اُس کی رکھا ہی گام | گئے گزرے خضر علیہ السلام
دہن یار کا دیکھ چپ لگ گئی | سخن یہاں ہوا ختم حاصل کلام
مجھے دیکھ مُنہ پر پریشاں کی زلف | غرض یہ کہ جا تو ہوئی اب تو شام
سرِ شام سے رہتی ہیں کاہشیں | ہمیں شوق اُس ماہ کا ہی تمام
قیامت ہی یہاں چشم و دل سے رہی | چلے بس تو وھاں جاکے کریے قیام قطعہ
نہ دیکھے جہاں کوئی آنکھوں کی اور | نہ لیوے کوئی جس جگہ دل کا نام

جہاں میر زیر و زبر ہو گیا
خراماں ہوا تھا وہ محشر خرام

گرچہ آوارہ جوں صبا ہیں ہم | لیک لگ چلنے میں بلا ہیں ہم
کام کیا آتے ہیں گے معلومات | یہ تو سمجھے ہی نہ کہ کیا ہیں ہم
ای بتاں اس قدر جفا ہم پر | عاقبت بندۂ خدا ہیں ہم
سرمہ آلودہ مت رکھا کر چشم | دیکھ اس وضع سے خفا ہیں ہم
ہے نمک سود سب تنِ مجروح | تیرے کشتوں میں بیرزا ہیں ہم
خوف ہم کو نہیں جنوں سے کچھ | یوں تو مجنوں کے بھی چچا ہیں ہم
آستاں پر ترے ہی گزری عمر | اسی دروازے کے گدا ہیں ہم

کوئی خواہاں نہیں ہمارا میر
گویا جنس ناروا ہیں ہم

دل لیکے رو بھی ٹک نہیں دیتے کہیں گے کیا — خوبانِ بر معاملہ یوم الحساب میں
جاکر درِ طبیب پہ بھی میں گرا و لے — جز آہ اُن نے کچھ نہ کیا میرے باب میں
عیش و خوشی ہی شیب میں ہو گو پہ وہ کہاں — قطعہ لذت جو ہی جوانی کے رنج و عتاب میں
دیں عمرِ خضر موسمِ پیری میں تو نہ لے — مرنا ہی اس سے خوب ہی عہدِ شباب میں
آنکلے تھے جو حضرتِ میر اس طرف کہیں — قطعہ میں نے کیا سوال یہ اُنکی جناب میں
حضرت سنو تو میں بھی تعلق کروں کہیں — فرمانے لاگے رو کے یہ اُس کے جواب میں

تو جان لیک تجھ سے بھی آگے جو کل تھے یہاں
ہیں آج صرف خاک جہاں خراب میں

بے روے و زلفِ یار ہی رونے سے کام یہاں — دامن ہی منھ پہ ابر نمط صبح و شام یہاں
آوازہ ہی جہاں میں ہمارا سنا کرو — عنقا[1] کے طور زیست ہی اپنی بنام یہاں
وصف دہن سے اس کے نہ آگے قلم چلے — یعنی کیا ہی خامہ نے ختم کلام یہاں
غالب[2] یہ ہی کہ موسمِ خط وھاں قریب ہی — آنے لگا ہی متصل اُس کا پیام یہاں
مت کھا فریبِ عجزِ عزیزانِ حال کا — پنہاں کئے ہیں خاک میں یاروں نے دام یہاں
کوئی ہوا نہ دست بسر شہرِ حسن میں — شاید نہیں ہی رسم جوابِ سلام یہاں

ناکام رہنے ہی کا تمھیں غم ہے آج میر
بہتوں کے کام ہو گئے ہیں کل تمام یہاں

نہ گیا خیال زلفِ سیہ جفا شعاراں — نہ ہوا کہ صبح ہووے شبِ تیرہ روزگاراں
نہ کہا تھا اے رفوگر ترے ٹانکے ہونگے ڈھیلے؟ — نہ سیا گیا نہ آخر دلِ چاک بیقراراں
ہوئی عید سب نے پہنے طرب و خوشی کے جامے — نہ ہوا کہ ہم بھی بدلیں یہ لباسِ سوگواراں
خطرِ عظیم میں ہیں مری آہ و اشک سے سب — کہ جہاں رہ چکا پھر جو یہی ہی باد و باراں
کہیں خاک کو کو اُس کی تو صبا نہ دیجو جنبش — کہ بھرے ہیں اُس زمیں میں جگرِ جگر فگاراں
رکھے تاجِ زر کو سر پہ چمنِ زمانہ میں گل — نہ شگفتہ ہو تو اتنا کہ خزاں ہی یہ بہاراں
نہیں تجھ کو چشمِ عبرت یہ نمود میں ہی ورنہ — کہ گئے ہیں خاک میں مل کئی تجھ سے تاجداراں

[1] حکماء کے نزدیک عنقا صرف ایسی چیز کا نام ہی جس کا وجود نہو اور یہ کہ وہ ایک جانور ہی ایک غلط خیال مشہور ہو گیا ہے ورنہ
[2] لا اعلم سے صاف تھا اُس سے بھی جب تک جواب صاف تھا ، اب تو خط آنے لگا شاید کہ خط آنے لگا۔

فریادی ہوں تو ٹپکے لوہو مری زباں سے — تالے کو بلبلاؤں کے خاطر میں بھی نہ لاؤں
پوچھو نہ دل کے غم کو ایسا نہ ہووے یاراں — مانند روضہ خواں کے مجلس کے تئیں رلاؤں
اک دم تو چونک بھی پڑ شور و فغاں سے میرے — ای بخت خفتہ کب تک تیرے تئیں جگاؤں
از خویش رفتہ ہر دم فکرِ وصال میں ہوں — کتنا میں کھویا جاؤں یارب کہ تجھ کو پاؤں
عریاں تنی کی شوخی وحشت میں کیا بلا تھی — تہ گرد کی نہ بیٹھی تا تن کے تئیں چھپاؤں
اگلے خطوں نے میرے مطلق اثر نہ بخشا — قاصد کے بدلے اب کے جادو مگر چلاؤں
دل لفتگی نے مارا مجھ کو کہاں شرہ دے — اک قطرہ آب تا میں اس آگ کو بجھاؤں

آسودگی تو معلوم ای میر جیتے جی یہاں
آرام تب ہی پاؤں جب جی سے ہاتھ اٹھاؤں

سوزشِ دل سے مفت گلتے ہیں — داغ جیسے چراغ جلتے ہیں
اس طرح دل گیا کہ اب تک ہم — بیٹھے روتے ہیں ہاتھ ملتے ہیں
بھری آتی ہیں آج یوں آنکھیں — جیسے دریا کہیں ابلتے ہیں
دمِ آخر ہے بیٹھ جا مت جا — صبر کر ٹک کہ ہم بھی چلتے ہیں
تیرے بیخود جو ہیں سو کیا چیتیں — ایسے ڈوبے کہیں اچھلتے ہیں
فتنہ در سر بتانِ حشر خرام — ہائے رے کس ٹھسک سے چلتے ہیں
نظر اٹھتی نہیں کہ جب خوباں — سوتے سے اٹھ کے آنکھ ملتے ہیں
اس سرِ زلف کا خیال نہ چھوڑ — سانپ کے سر ہی یہاں کچلتے ہیں
تھے جو اغیار سنگ سینے کے — اب تو کچھ ہم کو دیکھ ٹلتے ہیں
شمع رو موم کے بنے ہیں مگر — گرم ٹک ملیے تو پگھلتے ہیں

میر صاحب کو دیکھیے جو بنے
اب بہت گھر سے کم نکلتے ہیں

آیا کمال نقص مرے دل کی تاب میں — جاتا ہے جی چلا ہی مرا اضطراب میں
دوزخ کیا ہے سینہ مرا سوزِ عشق سے — اس دل جلے ہوئے کے سبب ہوں عذاب میں
مت کر نگاہِ خشم یہی موت ہے مری — ساقی نہ زہر دے تو مجھے تو شراب میں
بیدار شورِ حشر نے سب کو کیا و لے — ہیں خونِ خفتہ اُس کے شہیدوں کے خواب میں

تجھ بن اس جان مصیبت زدہ غمدیدہ پہ ہم / کچھ نہیں کرتے تو افسوس کیا کرتے ہیں

کیا کہیں میر جی ہم تم سے معاش اپنی غرض
غم کو کھایا کریں ہیں لوہو پیا کرتے ہیں

مستوجبِ ظلم و ستم و جور و جفا ہوں / ہر چند کہ جلتا ہوں پہ سرگرم وفا ہوں

آتے ہیں مجھے خوب سے دونوں ہنر عشق / رونے کے تئیں آندھی ہوں کڑھنے کو بلا ہوں

اس گلشنِ دُنیا میں شگفتہ نہ ہوا میں / ہوں غنچۂ افسردہ کہ مردودِ صبا ہوں

ہم چشم ہے ہر آبلۂ پا کا مرا اشک / از بسکہ تری راہ میں آنکھوں سے چلا ہوں

دامن نہ جھٹک ہاتھ سے میرے کہ ستم گر / ہوں خاکِ سرِ راہ کوئی دم میں ہوا ہوں

دل خواہ جلا اب تو مجھے اے شبِ ہجراں / میں سوختہ بھی منتظرِ روزِ جزا ہوں

گو طاقت و آرام و خور و خواب گئے سب / بارے یہ غنیمت ہے کہ جیتا تو رہا ہوں

اتنا ہی مجھے علم ہے کچھ میں بھی بہر چیز / معلوم نہیں خوب مجھے بھی کہ میں کیا ہوں

تب گرم سخن کہنے لگا ہوں میں کہ اک عمر / جوں شمع سرِ شام سے تا صبح جلا ہوں

سینہ تو کیا فضلِ الٰہی سے سبھی چاک
ہے وقتِ دُعا میر کہ اب دل کو لگا ہوں

جنس گراں کو تجھ سے جو لوگ چاہتے ہیں / دے روگ اپنے جی کو ناحق بساہتے ہیں

اس میکدے میں ہم بھی مدت سے ہیں ولیکن / خمیازہ کھینچتے ہیں ہر دم جماہتے ہیں

ناموسِ دوستی سے گردن بندھی ہے اپنی / جیتے ہیں جب تلک ہم تب تک نباہتے ہیں

سہل اس قدر نہیں ہے مشکل پسندی میری / جو تجھ کو دیکھتے ہیں مجھ کو سراہتے ہیں

وے دن گئے کہ راتیں نالوں سے کاٹتے تھے
بیڈول میر صاحب اب کچھ کراہتے ہیں

یہ ترک ہو کے خشن کج اگر کلاہ کریں / تو بلہوس نہ کبھو چشم کو سیاہ کریں

تمھیں بھی چاہیے ہے کچھ تو پاس چاہت کا / ہم اپنی اور سے یوں کب تلک نباہ کریں

رکھا ہے اپنے تئیں روک روک کر ورنہ / سیاہ کر دیں زمانے کو ہم جو آہ کریں

جو اُس کی اور کو جانا ملے تو ہم بھی ضعیف / ہزار سجدے ہر اک گام سر بہ راہ کریں

ہوائے میکدہ یہ ہے تو فوتِ وقت سے ظلم / نماز چھوڑ دیں اب کوئی اور گناہ کریں

تو جہاں سے دل اُٹھا یھاں نہیں رسم دردمندی　　کسی نے بھی یوں نہ پوچھا ہوئے خاک یاں ہزاراں
یہ سُنا تھا میرؔ ہم نے کہ فسانہ خواب لائے
تری سرگزشت سنکر گئے اور خواب یاراں

اُس کے کوچے سے جو اُٹھ اہلِ وفا جاتے ہیں　　تا نظر کام کرے رو بقفا جاتے ہیں
متصل روتے ہی رہیے تو بجھے آتشِ دل　　ایک دو آنسو تو اور آگ لگا جاتے ہیں
وقتِ خوش اُن کا جو ہمبزم ہیں تیرے ہم تو　　در و دیوار کو احوال سُنا جاتے ہیں
جائیگی طاقتِ پا آہ تو کرئے گا کیا　　اب تو ہم حال کبھو تم کو دکھا جاتے ہیں
ایک بیمارِ جدائی ہوں میں آپھی تس پر　　پوچھنے والے جدا جان کو کھا جاتے ہیں
غیر کی تیغِ زباں سے تری مجلس میں تو ہم　　آکے روز ایک نیا زخم اُٹھا جاتے ہیں
عرض وحشت نہ دیا کر تو بگولے اتنی　　اپنی دادی پہ کبھو یار بھی آ جاتے ہیں
میرؔ صاحب بھی ترے کوچہ میں شب آتے ہیں لیک
جیسے دریوزہ گری کرنے گدا جاتے ہیں

کہیو قاصد جو وہ پوچھے ہمیں کیا کرتے ہیں　　جان و ایمان و محبت کو دعا کرتے ہیں
عشق آتش بھی جو دیوے تو نہ دم ماریں ہم　　شمعِ تصویر ہیں خاموش جلا کرتے ہیں
جائے ہی نہ مرضِ دل تو نہیں اس کا علاج　　اپنے مقدور تلک ہم تو دوا کرتے ہیں
اُس کے کوچے میں نکر شورِ قیامت کا ذکر　　شیخ یھاں ایسے تو ہنگامے ہوا کرتے ہیں
بے لبسی سے تو تری بزم میں ہم بہرے بنے　　نیک و بد کوئی کہے بیٹھے سنا کرتے ہیں
رخصتِ جنبشِ لب عشق کی حیرت سے نہیں　　مدتیں گزری کہ ہم چپ ہی رہا کرتے ہیں
تو پری شیشے سے نازک ہے نہ کر دعوی مہر　　دل ہیں پتھر کے انھوں کے جو وفا کرتے ہیں
تجھ سے لگ جا کے یہ یوں جاتے رہیں مجھ سے حیف　　دیدہ و دل نے نہ جانا کہ دغا کرتے ہیں
فرصتِ خواب نہیں ذکرِ بتاں میں ہم کو　　رات دن رام کہانی سی کہا کرتے ہیں
مجلسِ حال میں موزوں حرکت شیخ کی دیکھ　　غیر شرعی بھی دم رقص مزا کرتے ہیں
یہ زمانہ نہیں ایسا کہ کوئی زلیست کرے　　چاہتے ہیں جو برا اپنا بھلا کرتے ہیں
محض ناکارہ بھی مت جان ہمیں تو کہ کہیں　　ایسے ناکام بھی بیکار پھرا کرتے ہیں

۵ میر صاحب بھی اُس کی بزم میں تھے۔ جیسے کوئی فقیر ہوتا ہے۔ ۵ اپنی دادی پہ آنا اپنی ضد پہ آنا۔

جاؤ گے بھول عہد کو فرہاد و قیس کے | گر پہنچیں ہم شکستہ دلوں کی بھی باریاں

بچ جاتا ایک رات جو کٹ جاتی اور میر
کاٹیں تھیں کوہکن نے بہت راتیں بھاریاں

گر کچھ ہو درد آئینہ یوں چرخ زشت میں | ان صورتوں کو صرف کرے خاک و خشت میں
رہتا ہے سوزِ عشق سے دوزخ میں روز و شب | لیجائے گا یہ سوختہ دل کیا بہشت میں
آسودہ کیونکہ ہوں میں کہ مانند گرد باد | آوارگی تمام ہے میری سرشت میں
کب تک خراب سعی طواف حرم رہوں | دل کو اٹھا کے بیٹھ رہوں گا کنشت میں
ماتم کے ہوں زمین پہ خرمن تو کیا عجب | ہوتا ہے نیل چرخ کی اس سبز کشت میں
سرمست ہم ہیں آنکھوں کے دیکھے سے یار کے | کب یہ نشہ ہے دخترِ رز تجھ پلشت میں

نامے کو چاک کر کے کرے نامہ بر کو قتل
کیا یہ لکھا تھا میر مری سرنوشت میں

درد و اندوہ میں ٹھہرا جو رہا میں ہی ہوں | رنگ رو جس کے کبھی منھ نہ چڑھا میں ہی ہوں
بد کہا میں نے رقیبوں کو تو تقصیر ہوئی | کیوں ہے بخشو بھی بھلا سب میں برا میں ہی ہوں
اپنے کوچے میں فغاں جس کی سنو ہو ہر رات | وہ جگر سوختہ و سینہ جلا میں ہی ہوں
خار کو جن نے لڑی موتی کی کر دکھلایا | اس بیابان میں وہ آبلہ پا میں ہی ہوں
لطف آنے کا ہے کیا بس نہیں اب تابِ جفا | اتنا عالم ہے بھرا جاؤ نہ کیا میں ہی ہوں
اس ادا کو تو ٹک اک سیر کر انصاف کرو | قطعہ وہ برا ہے گا بھلا دوستو یا میں ہی ہوں
میں یہ کہتا تھا کہ دل جن نے لیا کون ہے وہ | یک بیک بول اٹھا اس طرف آ میں ہی ہوں
جب کہا میں نے کہ تو ہی ہے تو پھر کہنے لگا | کیا کرے گا تو مرا دیکھوں تو جا میں ہی ہوں
سنتے ہی ہنس کے ٹک اک سوچیو کیا تو ہی تھا | جن نے شب رو کے سب احوال کہا میں ہی ہوں
میر آوارۂ عالم جو سنا ہے تو نے | خاک آلودہ وہ اے بادِ صبا میں ہی ہوں

کاسۂ سر کو لئے مانگتا دیدار پھرے
میر وہ جان سے بیزار گدا میں ہی ہوں

نکلے ہے جنسِ حسن کسی کاروان میں | یہ وہ نہیں متاع کہ ہو ہر دکان میں
جاتا ہے اک ہجومِ غمِ عشق جی کے ساتھ | ہنگامہ لے چلے ہیں ہم اس بھی جہان میں

ہمیشہ کون تکلف ہے خوب ویوں کا
گزار ناز سے ایدھر بھی گاہ گاہ کریں

اگر اٹھیں گے اسی حال سے تو کہیو تو
جو روزِ حشر تجھی کو نہ عذر خواہ کریں

بڑی بلا ہیں ستم کشتۂ محبت ہم
جو تیغ برسے تو سر کو نہ کچھ پناہ کریں

اگرچہ سہل ہیں پر دیدنی ہیں ہم بھی میر
ادھر کو یار تامل سے گر نگاہ کریں

راضی ہوں گو کہ بعد از صد سال و ماہ دیکھوں
اکثر نہیں تو تجھ کو میں گاہ گاہ دیکھوں

جی انتظار کش ہے آنکھوں میں رہگذر پر
آجا نظر کہ کب تک میں تیری راہ دیکھوں

آنکھیں جو کھل رہی ہیں مرنے کے بعد میری
حسرت یہ تھی کہ اس کو میں اک نگاہ دیکھوں

یہ دل وہ جا ہے جس میں دیکھا تھا تجھ کو بستے
کن آنکھوں سے اب اجڑا اس گھر کو آہ دیکھوں

دیکھوں تو چاند اب کا گزرے ہے مجھ کو کیسا
دل ہے کہ تیرے منہ پر بے مہر و ماہ دیکھوں

چشم و دل و جگر یہ سارے ہوئے پریشاں
کس کس کی تیرے غم میں حالت تباہ دیکھوں

آنکھیں تو تو نے دی ہیں اے جرم بخش عالم
کیا تیری رحمت آگے اپنے گناہ دیکھوں

قطعہ

مرنا ہے یا تماشا ہر اک کی ہے زباں پر
اس مجھلے کو چل کر میں خواہ نخواہ دیکھوں

دیکھوں ہوں آنکھ اٹھا کر جس کو تو یہ کہے ہے
ہوتا ہے قتل کیونکر یہ بے گناہ دیکھوں

ہوں میں نگاہ بسمل گو اک مژہ تھی فرصت
تا میر روئے قاتل تا قتل گاہ دیکھوں

مشہور ہیں دلوں کی مرے بیقراریاں
جاتی ہیں لامکاں کو دل شب کی زاریاں

چہرے پہ جیسے زخم ہے ناخن کا ہر خراش
اب دیدنی ہوئی ہیں مری دستکاریاں

سو بار ہم نے گل کی کہی پر چمن کے بیچ
بھر دی ہیں آب چشم سے راتوں کو کیاریاں

کشتے کی اس کے خاک بھری جسم زار پر
خالی نہیں ہیں لطف سے لوہو کی دھاریاں

تربت سے عاشقوں کے نہ اٹھا کبھو غبار
جی سے گئے وے نہ گئیں رازداریاں

اب کس کس اپنی خواہش مردہ کو روئیے
تھی ہم کو اس سے سیکڑوں امیدواریاں

پڑھتے پھریں گے گلیوں میں ان ریختوں کو لوگ
مدت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں

کیا جانتے تھے ایسے دن آجائیں گے شتاب
روتے گزرتیاں ہیں ہمیں راتیں ساریاں

گل نے ہزار رنگ سخن سر کیا دلے
دل سے گئیں نہ باتیں تری پیاری پیاریاں

جاگہ سے بھی جاتے ہو منھ سے بھی خشن ہوکر قطعہ | وے حرف نہیں ہیں جو شایان نکلتے ہیں
سو کاہے کو اپنی تو جوگی کی سی پھیری ہے | برسوں میں کبھو ایدھر ہم آن نکلتے ہیں

ان آئنہ رویوں کے کیا میرؔ بھی عاشق ہیں
جب گھر سے نکلتے ہیں حیران نکلتے ہیں

تو گلی میں اُس کی جا آوے اے صبا نہ چنداں | کہ گڑے ہوئے ہیں پھر اکھڑیں دلِ چاک دردمنداں
ترے تیرِ ناز کے جو یہ ہدف ہوئے ہیں ظالم | مگر آہنی توے ہیں جگرِ نیازمنداں
کبھو زلف سے بتاں کی نہ ہوا رہا ہیں ہرگز | یہی ہیں شکارِ خستہ یہی عنبریں کمنداں
تبھی کوندا اتنا تو زمیں سے جائے مل مل | نہیں دیکھے برق تو نے دمِ خندہ اُس کی دنداں
ہیں صفا کیا دل اتنا کہ دکھائی دیوے منھ بھی | ولے مفت اس آئینہ کو نہیں لیتے خودپسنداں
کھلیں آنکھیں ہیں جو دیکھا سو غم اور چشم گریاں | کسے کہتے ہیں نہ جانا دلِ شاد و روئے خنداں

تو زبوں شکار تو تھا ولے میرؔ قتلگہ میں
ترے خوں سے ہیں حنائی کفِ پائے صیدبنداں

کوئی نہیں جہاں میں جو اندوہگیں نہیں | اس غم کدہ میں آہ دلِ خوش کہیں نہیں
کرتا ہے ابر دعویِ دریا دلی عبث | دامن نہیں مرا تو تری آستیں نہیں
آگے تو لعل تو خطِ خوباں کے دم نہ مار | ہر چند اے مسیح وے باتیں رہیں نہیں
یہ درد اُس کے کیونکہ کروں دل نشیں کہ آہ | کہتا ہوں جس طرح سے کہے ہے نہیں نہیں
ماتھا گیا ہے صرفِ سجودِ درِ بتاں | مانندِ ماہِ نو کے مرے اب جبیں نہیں
گھر گھر ہے ملکِ عشق میں دوزخ کی تاب و تب | بھڑکا نہ ہم کو شیخ یہ آتش یہیں نہیں

فکرِ بلند سے میں کیا آسماں اسے
ہر اک سے میرؔ خوب ہو یہ وہ زمیں نہیں

وعدے کو یار آگے معیوب کر چکے ہیں | اس ریختے کو ورنہ ہم خوب کر چکے ہیں
مرنے سے تم ہمارے خاطر نچنت رکھیو | اس کام کا بھی ہم کچھ اسلوب کر چکے ہیں
حسنِ کلام کھینچے کیونکر نہ دامنِ دل | اس کام کو ہم آخر محبوب کر چکے ہیں
ہنگامۂ قیامت تازہ نہیں جو ہوگا | ہم اس طرح کے کتنے آشوب کر چکے ہیں
رنگِ پریدہ قاصد بادِ سحر کبوتر | کس کس کے ہم حوالے مکتوب کر چکے ہیں

یارب کوئی تو واسطہ سرگشتگی کا ہو
اک عشق بھر رہا ہے تمام آسمان میں

ہم اُس سے آہ سوزِ دل اپنا نہ کہہ سکے
تھے آتشِ دروں سے پھپھولے زبان میں

(قطعہ)
غم کھینچنے کو کچھ تو توانائی چاہیے
سو یاں نہ دل ہے نے تاب نہ طاقت ہے جان میں

غافل نہ رہیو ہم سے کہ ہم وے نہیں رہے
ہوتا ہے اب تو حال عجب ایک آن میں

وے دن گئے کہ آتشِ غم دل میں تھی نہاں
سوزش رہے ہے اب تو ہر اک استخوان میں

دل نذر و دیدہ پیشکش اے باعثِ حیات
سچ کہہ کہ جی لگے ہے ترا کس مکان میں

کھینچا نہ کر تو تیغ کہ اک دن نہیں ہیں ہم
ظالم قباحتیں ہیں بہت امتحان میں

پھاڑا ہزار جا سے گریبانِ صبر میر
کیا کہہ گئی نسیمِ سحر گل کے کان میں

زباں رکھ غنچہ ساں اپنے دہن میں
بندھی مٹھی چلا جا اس چمن میں

نہ کھول اے یار میرا گور میں منہ
کہ حسرت ہے مری جاگہ کفن میں

رکھا کر ہاتھ دل پر آہ کرتے
نہیں رہتا چراغ ایسی پون میں

جلے دل کی مصیبت اپنی سن کر
لگی ہے آگ سارے تن بدن میں

نہ تجھ بن ہوش میں ہم آئے ساقی
مسافر ہی رہے اکثر وطن میں

خردمندی ہوئی زنجیر ورنہ
گزرتی خوب تھی دیوانہ پن میں

کہاں کے شمع و پروانے گئے مر
بہت آتش بجاں تھے اس چمن میں

کہاں عاجز سخن قادر سخن ہوں
ہمیں ہے شبہ یاروں کے سخن میں

گدازِ عشق میں یہ بھی گیا میر
یہی دھوکا سا ہے اب پیرہن میں

جن کیلئے اپنے تو یوں جان نکلتے ہیں
اس راہ میں وے جیسے انجان نکلتے ہیں

کیا تیرِ ستم اُس کے سینے میں بھی ٹوٹے تھے
جس زخم کو چیروں ہوں پیکان نکلتے ہیں

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

کس کا ہے قماش ایسا گودڑ بھرے ہیں سارے
دیکھو نہ جو لوگوں کے دیوان نکلتے ہیں

(قطعہ)
گہ لوہو ٹپکتا ہے گہ لختِ دل آنکھوں سے
یا ٹکڑے جگر ہی کے ہر آن نکلتے ہیں

کریے تو گلہ کس سے جیسی تھی ہمیں خواہش
اب ویسے ہی یہ اپنے ارمان نکلتے ہیں

جاگہ سے بھی جاتے ہو منھ سے بھی خشن ہو کر — وے حرف نہیں ہیں جو شایان نکلتے ہیں

قطعہ

سو کاہے کو اپنی تو جوگی کی سی پھیری ہے — برسوں میں کبھو ایدھر ہم آن نکلتے ہیں

ان آئنہ رویوں کے کیا میرؔ بھی عاشق ہیں
جب گھر سے نکلتے ہیں حیران نکلتے ہیں

تو گلی میں اُس کی جا آوے اے صبا نہ چنداں — کہ گڑے ہوئے پھر اکھڑیں دلِ چاک دردمنداں
ترے تیرِ ناز کے جو یہ ہدف ہوئے ہیں ظالم — مگر آہنی توے ہیں جگرِ نیازمنداں
کبھو زلف سے بتاں کی نہ ہوا رہا میں ہرگز — یہی ہیں شکارِ خستہ یہی عنبریں کمنداں
تبھی کوند کوندا اتنا تو زمیں سے جائے مل مل — نہیں دیکھے برق تو نے دمِ خندہ اُس کی دنداں
ہیں صفا کیا دل اتنا کہ دکھائی دیوے منھ بھی — ولے مفت اس آئینہ کو نہیں لیتے خودپسنداں
کھلیں آنکھیں میں جو دیکھا سو غم اور چشمِ گریاں — کسے کہتے ہیں نہ جانا دلِ شاد و روئے خنداں

تو زبوں شکار تو تھا ولے میرؔ قتلگہ میں
ترے خوں سے ہیں حنائی کفِ پائے صیدبنداں

کوئی نہیں جہاں میں جو اندوہگیں نہیں — اس غم کدہ میں آہ دل خوش کہیں نہیں
کرتا ہے ابر دعوئ دریا دلی عبث — دامن نہیں مرا تو تری آستیں نہیں
آگے تو لعلِ نوخطِ خوباں کے دم نہ مار — ہر چند اے مسیح وے باتیں رہیں نہیں
یہ درد اُس کے کیونکہ کروں دل نشیں کہ اُو — کہتا ہوں جس طرح سے کہے ہے نہیں نہیں
ماتھا کیا ہے صرفِ سجودِ درِ بتاں — مانند ماہِ نو کے مرے اب جبیں نہیں
گھر گھر ہے ملکِ عشق میں دوزخ کی تاب و تب — بھڑکا نہ ہم کو شیخ یہ آتش یہیں نہیں

فکرِ بلند سے میں کیا آسماں اسے
ہر اک سے میرؔ خوب ہو یہ وہ زمیں نہیں

وعدے کو یار آگے معیوب کر چکے ہیں — اس ریختے کو ورنہ ہم خوب کر چکے ہیں
مرنے سے تم ہمارے خاطر نچنت رکھیو — اس کام کا بھی ہم کچھ اسلوب کر چکے ہیں
حسنِ کلام کھینچے کیونکر نہ دامنِ دل — اس کام کو ہم آخر محبوب کر چکے ہیں
ہنگامۂ قیامت تازہ نہیں جو ہو گا — ہم اس طرح کے کتنے آشوب کر چکے ہیں
رنگِ پریدہ قاصد بادِ سحر کبوتر — کس کس کے ہم حوالے مکتوب کر چکے ہیں

یارب کوئی تو واسطہ سرگشتگی کا ہے
اک عشق بھر رہا ہے تمام آسمان میں

ہم اُس سے آہ سوزِ دل اپنا نہ کہہ سکے
تھے آتش دروں سے پھپھولے زبان میں

غم کھینچنے کو کچھ تو توانائی چاہئے
سو یھاں نہ دل میں تاب نہ طاقت ہے جان میں

قطعہ

غافل نہ رہیو ہم سے کہ ہم وے نہیں رہے
ہوتا ہے اب تو حال عجب ایک آن میں

وے دن گئے کہ آتشِ غم دل میں تھی نہاں
سوزش رہے ہے اب تو ہر اک استخوان میں

دل نذر و دیدہ پیشکش اے باعثِ حیات
سچ کہہ کہ جی لگے ہے ترا کس مکان میں

کھینچا نہ کر تو تیغ کہ اک دن نہیں ہیں ہم
ظالم قباحتیں ہیں بہت امتحان میں

پھاڑا ہزار جا سے گریبانِ صبر میر
کیا کہہ گئی نسیمِ سحر گل کے کان میں

زباں رکھ غنچہ ساں اپنے دہن میں
بندھی مٹھی چلا جا اس چمن میں

نہ کھول اے یار میرا گور میں منہ
کہ حسرت ہے مری جاگہ کفن میں

رکھا کر ہاتھ دل پر آہ کرتے
نہیں رہتا چراغ ایسی پون میں

جلے دل کی مصیبت اپنی سن کر
لگی ہے آگ سارے تن بدن میں

نہ تجھ بن ہوش میں ہم آئے ساقی
مسافر ہی رہے اکثر وطن میں

خردمندی ہوئی زنجیر ورنہ
گزرتی خوب تھی دیوانہ پن میں

کہاں کے شمع و پروانے گئے مر
بہت آتش بجاں تھے اس چمن میں

کہاں عاجز سخن قادر سخن ہوں
ہمیں ہے شبہ یاروں کے سخن میں

گدازِ عشق میں بہ بھی گیا میر
یہی دھوکا سا ہے اب پیرہن میں

جن کیلئے اپنے تو یوں جان نکلتے ہیں
اس راہ میں وے جیسے انجان نکلتے ہیں

کیا تیر ستم اُس کے سینے میں بھی ٹوٹے تھے
جس زخم کو چیروں ہوں پیکان نکلتے ہیں

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

کس کا ہے قماش ایسا گودڑ بھرے ہیں سارے
دیکھو نہ جو لوگوں کے دیوان نکلتے ہیں

گہ لوہو ٹپکتا ہے گہ لختِ دل آنکھوں سے
یا ٹکڑے جگر ہی کے ہر آن نکلتے ہیں

قطعہ

کریے تو گلہ کس سے جیسی تھی ہمیں خواہش
اب ویسے ہی یہ اپنے ارمان نکلتے ہیں

چاہے ہے آج ہوویں ہفت آسماں کے اوپر
دل کے مزاج میں بھی کتنی شتابیاں ہیں
جی بھرے دل ڈھہے ہے سر بھی گرا پڑے ہے
خانہ خراب تجھ بن کیا کیا خرابیاں ہیں

مہمان میر مت ہو خوانِ فلک پہ ہرگز
خالی یہ مہر و مہ کی دونوں رکابیاں ہیں

سن گوشِ دل سے اب تو سمجھ بے خبر کہیں
مذکور ہو چکا ہے مرا حال ہر کہیں
اب فائدہ سراغ سے بلبل کے باغباں
اطرافِ باغ ہونگے پڑی مشت پر کہیں
عاشق ترے ہوئے تو ستم کچھ نہ ہو گیا
مرنا پڑا ہے ہم کو خدا سے تو ڈر کہیں
کچھ کچھ کہوں گا روز یہ کہتا تھا دل میں میں
قطعہ
آشفتہ طبع میر کو پایا اگر کہیں
سو کل ملا مجھے وہ بیاباں کی سمت کو
جاتا تھا اضطراب زدہ سا اُدھر کہیں
ٹک چل کے میں برنگ صبا یہ اُسے کہا
ای خانماں خراب ترا بھی ہے گھر کہیں
آشفتہ جا بجا جو پھرے ہے تو دشت میں
جاگہ نہیں ہے شہر میں تجھ کو مگر کہیں
خوں بستہ اپنی کھول مژہ پوچھتا بھی گر
رکھ ٹک تو اپنے حال کو مدِ نظر کہیں
آسودگی سی جنس کو کرتا ہے کون سوخت
جانے ہے نفع کوئی بھی جی کا ضرر کہیں
موتی سے تیری اشک ہیں غلطاں کسو طرف
یاقوت کے سے ٹکڑے ہیں لختِ جگر کہیں
تا کے یہ دشت گردی و کبتک یہ خستگی
اس زندگی سے کچھ تجھے حاصل بھی مر کہیں
کہنے لگا وہ ہوکے پر آشفتہ یک بیک
مسکن کرے ہے دہر میں مجھ سا بشر کہیں
آوار گو نکا ننگ ہے سننا نصیحتیں
مت کہیو ایسی بات تو بارِ دگر کہیں
تعئین جا کو بھول گیا ہوں پہ یہ ہے یاد
کہتا تھا ایک روز یہ اہلِ نظر کہیں
بیٹھے اگرچہ نقش ترا تو بھی دل اٹھا
کرتا ہے جائے باش کوئی رہگزر کہیں

کتنے ہی آئے لیکے سر پر خیال پر
ایسے گئے کہ کچھ نہیں اُن کا اثر کہیں

اب کچھ ہمارے حال پہ تم کو نظر نہیں
یعنی تمہاری ہم سے وہ آنکھیں نہیں رہیں

اس بزم کے چراغ بجھے تھے جو یار میر
اُن کے فروغ باغ میں گل ہیں کہیں کہیں

پلکوں سے ترے شائق ہم سر جو پٹکتے ہیں
ہر دم جگروں میں کچھ کانٹے سے کھٹکتے ہیں

تنکا نہیں رہا ہے کیا اب نثار کریے　　آگے ہی ہم تو گھر کو جاروب کر چکے ہیں

کیا جانئے کہ کیا ہے اے میر وجہ ضد کی
سو بار ہم تو اُس کو محجوب کر چکے ہیں

جو حیدری نہیں اُسے ایماں ہی نہیں　　ہو گر شریف مکہ مسلماں ہی نہیں

وہ ترک صید پیشہ مرا قصد کیا کرے　　دُبلے پنے سے تن میں مرے جان ہی نہیں

خال و خط ایسے فتنے نگاہیں یہ آفتیں　　کچھ اک بلا وہ زلفِ پریشان ہی نہیں

ہیں جزوِ خاک ہم تو غبارِ ضعیف سے　　سر کھینچے کا ہم کنے سامان ہی نہیں

دیکھی ہو جس نے صورتِ دلکش وہ ایک آن　　پھر صبر اُس سے ہو سکے امکان ہی نہیں

خورشید و ماہ و گل سبھی اودھر رہے ہیں دیکھ　　اس چہرہ کا اک آئینہ حیران ہی نہیں

یکساں ہے تیرے آگے جو دل اور آرسی　　کیا خوب و زشت کی تجھے پہچان ہی نہیں

سجدہ اُس آستاں کا نہ جس کو ہوا نصیب　　وہ اپنے اعتقاد میں انسان ہی نہیں

کیا تجھکو بھی جنوں تھا کہ جامے میں تیرے میر
سب کچھ بچا ہے ایک گریبان ہی نہیں

ہم آپ ہی کو اپنا مقصود جانتے ہیں　　اپنے سوائے کس کو موجود جانتے ہیں

عجز و نیاز اپنا اپنی طرف ہے سارا　　اس مشتِ خاک کو ہم مسجود جانتے ہیں

صورت پذیر ہم بن ہرگز نہیں وے معنی　　اہلِ نظر ہمیں کو معبود جانتے ہیں

عشق اُن کی عقل کو ہے جو ما سوا ہمارے　　ناچیز جانتے ہیں نابود جانتے ہیں

اپنی ہی سیر کرنے ہم جلوہ گر ہوئے تھے　　اس رمز کو و لیکن معدود جانتے ہیں

یارب کسے ہے ناقہ ہر غنچہ اس چمن کا　　راہِ وفا کو ہم تو مسدود جانتے ہیں

یہ ظلم بے نہایت دشوار تر کہ خوباں　　بد وضعیوں کو اپنی محمود جانتے ہیں

کیا جانے داب صحبت از خویش رفتگاں کا　　مجلس میں شیخ صاحب کچھ کود جانتے ہیں

مر کر بھی ہاتھ آوے تو میر مفت ہے وہ
جی کے زیاں کو بھی ہم سود جانتے ہیں

تلوار غرقِ خوں ہے آنکھیں گلابیاں ہیں　　دیکھیں تو تیری کب تک یہ بد شرابیاں ہیں

جب لے نقاب منہ پر تب دید کر کہ کیا کیا　　در پردہ شوخیاں ہیں پھر بے محابیاں ہیں

گیا نظر سے جو وہ گرم طفل آتش باز — ہم اپنے چہرے پہ اُڑتی ہوائیاں دیکھیں
ترے وصال کے ہم شوق میں ہو آوارہ — عزیز دوست سبھوں کی جدائیاں دیکھیں
ہمیشہ مائل آئینہ ہی تجھے پایا — جو دیکھیں ہم نے یہی خودنمائیاں دیکھیں
شہاں کہ کحل جواہر تھی خاک پا جنکی — انھیں کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھیں

بنی نہ اپنی تو اُس جنگجو سے ہرگز میر
لڑائیں جب سے ہم آنکھیں لڑائیاں دیکھیں

خوش قداں جب سوار ہوتے ہیں — سرو قمری شکار ہوتے ہیں
تیرے بالوں کے وصف میں میرے — شعر سب پیچدار ہوتے ہیں
آؤ یادِ بتاں پہ بھول نہ جاؤ — یہ تغافل شعار ہوتے ہیں
دیکھ لیویں گے غیر کو تجھ پاس — صحبتوں میں بھی یار ہوتے ہیں
صدقے ہو لیویں ایک دم تیرے — پھر تو تجھ پر نثار ہوتے ہیں
ہفت اقلیم ہر گلی ہے کہیں — دلی سے بھی دیار ہوتے ہیں
رفتہ رفتہ یہ طفل خوش ظاہر — فتنۂ روزگار ہوتے ہیں

اُس کے نزدیک کچھ نہیں عزت
میر جی یوں ہی خوار ہوتے ہیں

وے جو حسن و جمال رکھتے ہیں — سارے تیرا خیال رکھتے ہیں
شب جو وہ مہ کبھو سہی ہے یہاں — مدتوں یار سال رکھتے ہیں
ان لبوں کا جواب وہ ہی لعل — ہم تجھی سے سوال رکھتے ہیں
گل ترے روزگار خوبی میں — منہ طمانچوں سے لال رکھتے ہیں
دہنِ تنگ کے ترے مشتاق — آرزوے محال رکھتے ہیں
خاکِ آدم ہی ہے تمام زمین — پاؤں کو ہم سنبھال رکھتے ہیں
یہ جو سر کھینچتے قیامت ہے — دل کو ہم پائمال رکھتے ہیں
اہلِ دل چشم سب تری جانب — آئینہ کی مثال رکھتے ہیں

گفتگو ناقصوں سے ہے ورنہ
میر جی بھی کمال رکھتے ہیں

میں پھاڑ گریباں کو درویش ہوا آخر — وے ہاتھ سے دامن کو اب تک بھی جھٹکتے ہیں
یاد آوے ہے جب شب کو وہ چہرۂ مہتابی — آنسو مرے پلکوں سے تارے سے جھمکتے ہیں
کی راہبری میری صحرائے محبت میں — یھاں حضرت خضرؑ آپھی مدت سی بھٹکتے ہیں
جاتے نہ کوئی دیکھا اُس تیغ کے منھ اوپر — وھاں میان سے وہ لے ہی یھاں پا سٹکتے ہیں
کیا تم کو اچنبھا ہی سختی کا محبت میں — دشوار ہی ہوتا ہی دل جن کے اٹکتے ہیں
تو طرۂ جاناں سے چاہے ہی ابھی مقصد
برسوں سے پڑے ہم تو ای میر لٹکتے ہیں

سب خوبیاں ہیں شیخ مشیخت پناہ میں — پر ایک حیلہ سازی ہی اُس دستگاہ میں
مانند شمع ہم نے حضور اپنے یار کے — کارِ وفا تمام کیا ایک آہ میں
میں صید جو ہوا تو ندامت اُسے ہوئی — اک قطرہ خون بھی نہ گرا صیدگاہ میں
پہنچے نہیں کہیں کہ نہیں وھاں سے اُٹھ چلے — القصہ ایک عمر سے ہم ہیں گے راہ میں
نکلا تھا آستین سے کل مغبچے کا ہاتھ — بہتوں کے خرقے چاک ہوئے خانقاہ میں
بخت سیہ تو دیکھو کہ ہم خاک میں ملے — سرمے کی جا ہوئے تری چشم سیاہ میں
بیٹھے تھے میر یار کے دیدار کو سو ہم
اپنا یہ حال کر کے اُٹھے اک نگاہ میں

کیا جو عرض کہ دل سا شکار لایا ہوں — کہا کہ ایسے تو میں مفت مار لایا ہوں
کہے تو نخلِ صنوبر ہوں اس چمن میں میں — کہ سر سے پانوں تلک دل ہی بار لایا ہوں
جہاں میں گریہ نہ پہنچا بہم مجھے دلخواہ — پہ نوحؑ کے سے تو طوفاں ہزار لایا ہوں
نہ تنگ کر اسے ای فکر روزگار کہ میں — دل اُس سے دم کیلئے مستعار لایا ہوں
پھر اختیار ہی آگے ترا یہ ہے مجبور — کہ دل کو تجھ تئیں بے اختیار لایا ہوں
یہ جی جو میرے گلے کا ہی ہار تو ہی لے — ترے گلے کے لئے میں یہ ہار لایا ہوں
چلا نہ اُٹھ کے وہیں چپکے چپکے پھر تو میر
ابھی تو اُس کی گلی سے پکار لایا ہوں

جفائیں دیکھ لیاں بیوفائیاں دیکھیں — بھلا ہوا کہ تری سب بُرائیاں دیکھیں
تری گلی ست سدا اے کشندۂ عالم — ہزاروں آتی ہوئی چارپائیاں دیکھیں

رو ہت اپنی اس گلی میں کم نہیں ہر جگہ ہر بار ماریں کھائیاں
بوسہ لینے کا کیا جس دم سوال اُن نے باتیں ہی ہمیں بتلائیاں
رو کشی کو اُس کے منہ بھی چاہیے ماہ کے چہرہ پہ ہیں سب جھائیاں
مضطرب ہو کر کیا سب میں سبک دل نے آخر خفتیں دلوائیاں
چل چمن میں یہ بھی ہے کوئی روش ناز تا کے ۔ چند بے پروائیاں
شوق قامت میں ترے اے نونہال گل کی شاخیں لیتی ہیں انگڑائیاں

پاس مجھ کو بھی نہیں ہے میر اب
دور پہنچی ہیں مری رُسوائیاں

دیکھیں تو تیری کب تک یہ کج ادائیاں ہیں اب ہم نے بھی کسو سے آنکھیں لڑائیاں ہیں
ٹک سن کہ سو برس کی ناموسِ خامشی کھو دو چار دل کی باتیں اب منہ پہ آئیاں ہیں
ہم وے ہیں خواں گرفتہ ظالم جنھوں نے تیری ابرو کی جنبش اوپر تلواریں کھائیاں ہیں
آئینہ ہو کے صورت معنی سے ہے لبالب رازِ نہان حق میں کیا خود نمائیاں ہیں

کعبے میں میر ہم پر یا سر گراں ہے زاہد
یا بتکدے میں ہم نے دھولیں لگائیاں ہیں

میں کون ہوں اے ہمنفساں سوختہ جاں ہوں اک آگ مرے دل میں ہے جو شعلہ فشاں ہوں
لایا ہے مرا شوق مجھے پردے سے باہر میں ورنہ وہی خلوتیِ رازِ نہاں ہوں
جلوہ ہے مجھی سے لبِ دریائے سخن پر صد رنگ مری موج ہے میں طبع رواں ہوں
پنجہ ہے مرا پنجۂ خورشید میں ہر صبح میں شانہ صفت سایۂ زلفِ بتاں ہوں
دیکھا ہے مجھے جن نے سو دیوانہ ہے میرا میں باعثِ آشفتگیِ طبع جہاں ہوا
تکلیف نہ کر آہ مجھے جنبشِ لب کی میں صد سخن آغشتہ بخوں زیرِ زباں ہوں
ہوں زرد غمِ تازہ نہالانِ چمن سے اس باغِ خزاں دیدہ میں میں برگِ خزاں ہوں
رکھتی ہے مجھے خواہشِ دل بلکہ پریشاں درپے نہو ۔ اس وقت خدا جانے کہاں ہوں
اک وہم نہیں بیش مری ہستیِ موہوم اس پر بھی تری خاطرِ نازک پہ گراں ہوں

خوش باشی و تنزیہ و تقدس تھی مجھے میر
اسباب پڑے یوں کہ کئی روز سے یہاں ہوں

صبر و طاقت کو کڑھوں یا خوشدلی کا غم کروں
اس میں حیراں ہوں بہت کس کس کا میں ماتم کروں

ہو سہم حیرت ہی دل بھر کر تو رونا ٹل چکا
اتنے بھی آنسو بہم پہنچیں کہ مژگاں نم کروں

ہوں سیہ مستِ سرِ زلفِ صنم معذور رکھ
شیخ اگر کعبے سے آوے گفتگو درہم کروں

ریزۂ الماس[1] یا مشتِ نمک ہے کیا بُرا
جو میں اپنے اپنے زخمِ سینہ کو مرہم کروں

گرچہ کس گنتی میں ہوں پر ایک دم مجھ تک تو آ
یا اُدھر ہوں یا اُدھر کب تک شمارِ دم کروں

بس بہت رسوا ہوا میں اب نہیں مقدور کچھ
وہ طرح ڈھونڈوں ہوں جس میں ربط تجھ سے کم کروں

گو دھواں اُٹھنے لگا دل سے مرے پر پیچ و تاب
میر اس پر قطعِ ربطِ زلفِ خم در خم کروں

کیا میں نے رو کر فشارِ گریباں
رگِ ابر تھا تار تارِ گریباں

کہیں دستِ چالاک ناخن نہ لاگے
کہ سینہ ہی قربِ جوارِ گریباں

نشاں اشکِ خونیں کے اُڑتے چلے ہیں
خزاں ہو چلی ہے بہارِ گریباں

جنوں تیری منت ہے مجھ پر کہ تو نے
نہ رکھا مرے سر پہ بارِ گریباں

زیارت کروں دل سے خستہ جگر کی
کہاں ہوگا یارب مزارِ گریباں

کہیں جائے یہ دور دامن بھی جلدی
کہ آخر ہوا روزگارِ گریباں

پھروں میر عریاں نہ دامن کا غم ہو
نہ باقی رہے خار خارِ گریباں

بارہا وعدوں کی راتیں آئیاں[2]
طالعوں نے صبح کر دکھلائیاں

عشق میں ایذائیں سب سے پائیاں
رہ گئے آنسو تو آنکھیں آئیاں

ظلِ حق ہم کو بھی وہ ہی چاہیئے
جوں ہماری ہوتی ہیں پرچھائیاں

اُس مژہ برہم زدہ نے بارہا
عاشقوں میں برچھیاں چلوائیاں

نونہال آگے ترے ہیں جیسے ہوں
ڈالیاں ٹوٹی ہوئیں مرجھائیاں

ایک بھی چشمک اُس مہ کی سی کی
آنکھیں تاروں نے بہت جھمکائیاں

ایک نے صورت نہ پکڑی پیشِ یار
دل میں شکلیں سیکڑوں ٹھہرائیاں

[1] مرزا غالب دہلوی سے فراغت کس قدر ہوتی مجھے تشویشِ مرہم سے ÷ بہم گر صلح کرتے پارہائے دل نمکداں پر
[2] صیغہ ہائے جمع مونث کو فی زمانا اس طرح استعمال کرنا متروک ہے

ایک کہتا ہوں میں تو منہ پہ رقیب
تیری پشتی سے سو سناتے ہیں

دیدہ و دل شتاب گم ہوں میر
سر پہ آفت ہمیشہ لاتے ہیں

آتا ہے دل میں حال بد اپنا بھلا کہوں
پھر آپھی آپ سوچ کے کہتا ہوں کیا کہوں

پروانہ پھر نہ شمع کی خاطر جلا کرے
گر بزم میں یہ اپنا ترا ماجرا کہوں

مت کر خرام سر پہ اٹھالے گا خلق کو
بیٹھا اگر گلی میں ترا نقشِ پا کہوں

دل اور دیدہ باعثِ ایذا و نورِ عین
کس کے تئیں بُرا کہوں کس کو بھلا کہوں

آوے سموم جائے صبا باغ سے سدا
گر شمہ اپنے سوزِ جگر کا میں جا کہوں

جاتا ہوں میر دشتِ جنوں کو میں اب یہ کہ
مجنوں کہیں ملے تو تری بھی دعا کہوں

مرے آگے نہ شاعر نام پاویں
قیامت کو مگر عرصے میں آویں

پری سمجھے تجھے وہم و گماں سے
کہاں تک اور ہم اب دل چلاویں

مزاج اپنا غیور از بس پڑا ہے
ترے غم میں کسے خاطر میں لاویں

پھرے ہے شیخ مجلس ہی میں رقصاں
ادھر آ نکلے تو ہم بھی نچاویں

نظر اے ابر اب مت آ مبادا
کہیں میری بھی آنکھیں ڈبڈباویں

قدم بوسی تلک مختار ہیں غیر
زیادہ لگ چلیں تو سر میں کھاویں

نہ آیا وہ تو کیا ہم نیم جاں بھی
قطعہ بغیر اُس کے ملے دُنیا سے جاویں

چلے ہی تو تو اے جانِ الم ناک
ٹک اک رہ جا کہ ہم رخصت ہو آویں

چلا مقدور سے غم میر آگے
زمیں پھٹ جائے یارب ہم سماویں

مثالِ سایہ محبت میں جال اپنا ہوں
تمھارے ساتھ گرفتار حال اپنا ہوں

سرشکِ سرخ کو جاتا ہوں جو پیے ہر دم
لہو کا پیاسا علی الاتصال اپنا ہوں

اگرچہ نشہ ہوں سب میں خُم جہاں میں لیک
برنگِ مے عرقِ انفعال اپنا ہوں

مری نمود نے مجھ کو کیا برابرِ خاک
میں نقشِ پا کی طرح پائمال اپنا ہوں

ہوئی ہے زندگی دشوار مشکل آساں کر
پھروں چلوں تو ہوں بیچ میں وبال اپنا ہوں

اب آنکھوں میں خوں دمبدم دیکھتے ہیں ۔ نہ پوچھو جو کچھ رنگ ہم دیکھتے ہیں
جو بے اختیاری یہی ہے تو قاصد ۔ ہمیں آکے اس کے قدم دیکھتے ہیں
لگے داغ رہتا ہے دل کہ جگر خوں ۔ ان آنکھوں سے کیا کیا ستم دیکھتے ہیں
اگر جان آنکھوں میں اس بن ہے تو ہم ۔ ابھی اور بھی کوئی دم دیکھتے ہیں
لکھیں حال کیا اس کو حیرت ہے ہم تو ۔ لگے کاغذ و کہ قلم دیکھتے ہیں
وفا پیشگی قیس تک تھی بھی کچھ کچھ ۔ اب اس طور کے لوگ کم دیکھتے ہیں

کہاں تک بھلا روؤگے میر صاحب
اب آنکھوں کے گرد اک ورم دیکھتے ہیں

بہت ہی اپنے تئیں ہم تو خوار پاتے ہیں ۔ وہ کوئی اور ہیں جو اعتبار پاتے ہیں
تری گلی میں میں رو دیا تھا دل جلا یکشب ۔ ہنوز وہاں سے دل داغدار پاتے ہیں
نہ ہووے شیفتہ کیوں اضطراب پر عاشق ۔ کہ جی کو کھو کے دل بیقرار پاتے ہیں
گلہ عبث ہے تری آستانہ بوسی کا ۔ مسیح و خضر بھی وہاں کم ہی بار پاتے ہیں
تڑپ ہے قیس کے دل میں تہ زمیں اس سے ۔ قطعہ ۔ غزال دشت نشان مزار پاتے ہیں
دگرنہ خاک ہوئے کتنے ہی محبت میں ۔ کسی کا بھی کہیں مشت غبار پاتے ہیں

شتابی آوے اجل میر جاوے یہ رونا
کہ میرے شور سے تصدیع یار پاتے ہیں

عام حکم شراب کرتا ہوں ۔ محتسب کو کباب کرتا ہوں
ٹک تو رہ اے بنائے ہستی تو ۔ تجھ کو کیسا خراب کرتا ہوں
کوئی بجھتی ہے یہ بھڑک میں عبث ۔ قطعہ ۔ تشنگی پر عتاب کرتا ہوں
سر تلک آب تیغ میں ہوں غرق ۔ اب تئیں آب آب کرتا ہوں

جی میں پھرتا ہے میر وہ میرے
جاگتا ہوں کہ خواب کرتا ہوں

ہم تو مطرب پسر کے جاتے ہیں ۔ گو رقیباں کچھ اور گاتے ہیں
خاک میں لوٹتے تھے کل تجھ بن ۔ آج لوہو میں ہم نہاتے ہیں
اے عدم ہونے والو تم تو چلو ۔ ہم بھی اب کوئی دم میں آتے ہیں

نہ اک یعقوب رویا اس الم میں
کنواں اندھا ہوا یوسف کے غم میں

کہوں کب تک دم آنکھوں میں ہے میرے
نظر آوے ہی گا اب کوئی دم میں

دیا عاشق نے جی تو عیب کیا ہے
یہی میر اک ہنر ہوتا ہے ہم میں

چاہتے ہیں یہ بتاں ہم پہ کہ بیداد کریں
کس کے ہوں کس سے کہیں کس کنے فریاد کریں

ایک دم پر ہی بنا تیری سو آیا کہ نہیں
وہ بچھ اس زندگی میں کر کہ تجھے یاد کریں

کعبہ ہوتا ہے دوانوں کا مری گور سے دشت
مجھ سے دو چار دوانے یہاں تو سب آباد کریں

ہم تو راہب نہیں ہیں واقفِ رسمِ سجدہ
ہیں کدھر شیخ حرم کچھ ہمیں ارشاد کریں

ریختہ خوب ہی کہتا ہے جو انصاف کریں
چاہیئے اہل سخن میر کو استاد کریں

ہجراں کی کو نت کھینچے بے دم سے ہو چلے ہیں
سر مار مار یعنی اب ہم بھی سو چلے ہیں

جوئیں رہیں گی جاری گلشن میں ایک مدت
سایہ میں ہر شجر کے ہم زور رو چلے ہیں

لبریز اشک آنکھیں ہر بات میں رہا کیں
رو رو کے کام اپنے سب ہم ڈبو چلے ہیں

پچھتائیے نہ کیونکر جی اس طرح سے دے کر
یہ گوہر گرامی ہم مفت کھو چلے ہیں

قطع طریق مشکل ہے عشق کا نہایت
وے میر جانتے ہیں اس راہ جو چلے ہیں

جب[1] دردِ دل کا کہنا میں دل میں ٹھانتا ہوں
کہتا ہے بن سنے ہی میں خوب جانتا ہوں

شاید نکل بھی آوے دل گم جو ہو گیا ہے
اس کی گلی میں بیٹھا میں خاک چھانتا ہوں

اس دردِ سر کا لیکا سر سے لگا ہے میرے
سو سر کا ہووے صندل میں میر جانتا ہوں

ملنے لگے ہو دیر دیر دیکھیے کیا ہے کیا نہیں
تم تو کرو ہو صاحبی بندہ میں کچھ رہا نہیں

بوئے[2] گل اور رنگ گل دونوں ہیں دلکش اے نسیم
لیک بقدر یک نگاہ دیکھیے تو وفا نہیں

شکوہ کروں ہوں بخت کا اتنے غضب نہ ہو بتاں
مجھ کو خدا نخواستہ تم سے تو کچھ گلا نہیں

[1] مرزا غالب دہلوی سے نہ ہے کرشمہ کہ یوں دے رکھا ہے ہم کو فریب ¶ کہ بن کہے ہی ہمیں سب خبر ہے کیا کہیے۔
[2] محمد قلی تذکرہ میر میں اس طرح ملتا ہے ۔ بوئے گل اور رنگ گل لشہی اللہ ہے نسیم ¶ لیک بقدر یک نگاہ دیکھیے تو وفا نہیں

ترا ہے وہم کہ یہ ناتواں ہی جامے میں ۔۔۔ وگرنہ میں نہیں اب اک خیال اپنا ہوں

بلا ہوئی ہے مری گو کہ طبع روشن میر

ہوں آفتاب ولیکن زوال اپنا ہوں

کھودیں ہیں نیند میری مصیبت بیانیاں ۔۔۔ تم بھی تو ایک رات سنو یہ کہانیاں

کیا آگ دیجے طور کو کی ترک سرکشی ۔۔۔ اُس شعلہ کی وہی ہیں شرارت کی بانیاں

صحبت رکھا کیا وہ سفیہ و ضلال سے ۔۔۔ دل ہی میں خوں ہوا کیں مری کاردانیاں

ہم سے تو کینے ہی کی ادائیں چلی گئیں ۔۔۔ بے لطفیاں یہی یہی نامہربانیاں

تلوار کے تلے ہی گیا عہد انبساط ۔۔۔ مر مر کے ہم نے کاٹی ہیں اپنی جوانیاں

گالی سوائے مجھ سے سخن مت کیا کرو ۔۔۔ اچھی لگی ہیں مجھ کو تری بد زبانیاں

غیروں ہی کے سخن کی طرف گوش یار تھی ۔۔۔ اس حرف ناشنو نے ہماری نہ مانیاں

یہ بیقراریاں نہ کبھو اُن نے دیکھیاں ۔۔۔ جاں کاہیاں ہماری بہت سہل جانیاں

مارا مجھے بھی سان کے غیروں میں ان نے میر

کیا خاک میں ملائیں مری جاں فشانیاں

تا پھو کیجئے نہ خرقۂ طامات کے تئیں ۔۔۔ حسن قبول کیا ہو مناجات کے تئیں

کیفیتیں اٹھی ہیں یہ کب خانقاہ میں ۔۔۔ بدنام کر رکھا ہے خرابات کے تئیں

ڈریئے خرامِ ناز سے خوباں کے ہمنشیں ۔۔۔ ٹھوکر سے یہ اُٹھاتے ہیں آفات کے تئیں

ہم جانتے ہیں یا کہ دل آشنا زدہ ۔۔۔ کہیے سو کس سے عشق کے حالات کے تئیں

خوبی کو اُس کی ساعدِ سیمیں کی دیکھ کر ۔۔۔ صورت گروں نے کھینچ رکھا ہات کے تئیں

اتنی بھی حرف ناشنوی غیر کے لئے ۔۔۔ رکھ کان ٹک سنا بھی کرو بات کے تئیں

سید ہو یا چمار ہو اس جا وفا ہے شرط ۔۔۔ کب عاشقی میں پوچھتے ہیں ذات کے تئیں

آخر کے یہ سلوک ہم اب تیرے دیکھ کر ۔۔۔ کرتے ہیں یاد پہلی ملاقات کے تئیں

آنکھوں نے میر صاحب و قبلہ ورم کیا

حضرت بکا کیا نہ کرو رات کے تئیں

ے جامی ے بندۂ عشق شدی ترک نسب کن جامی ؛ کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

ہندی شاعر کہتا ہے ے ذات پات پوچھے نہ کوئے ؛ ہر کو بھجے سو ہر کا ہوئے۔

تجھ عشق میں[۱] تو مرنے کو تیار بہت ہیں — یہ جرم ہے تو ایسے گنہگار بہت ہیں
اک زخم کو ہیں ریزۂ الماس سے چیرا — دل پر ابھی جراحتِ نوکار بہت ہیں
کچھ انکھڑیاں ہی اسکی نہیں اک بلا کہ بس — دل زینہار دیکھ خبردار بہت ہیں
بیگانہ خو رقیب سے وسواس کچھ نہ کر — فریاد کے ٹک یاں سے تو پھر یار بہت ہیں

کوئی تو زمزمہ کرے میر آسا دلخراش
یوں تو قفس میں اور گرفتار بہت ہیں

جنوں میرے کی باتیں دشت اور گلشن میں جب چلیاں — نہ چوبِ گل نے دم مارا نہ چھڑیاں بید کی ہلیاں
گریباں شورِ محشر کا اڑایا دھجیاں کر کر — فغاں پر ناز کرتا ہوں کہ بل بے تیری ہتھ بلیاں
تفاوت کچھ نہیں شیریں و شکر اور یوسفؑ میں — سبھی معشوق اگر پوچھے کوئی مصری کی ہیں ڈلیاں
ترے غمزے نے جور و ظلم سے آنکھیں غزالوں کی — بیاباں میں دکھا مجنوں کو پاؤں کے تلے ملیاں
چمن کو آج مارا ہے یہاں تک رشکِ گل رو نے — کہ بلبل سر پٹکتی ہے نہیں منہ کھولتیں کلیاں
مری آہِ سحر کی برچھیاں سختی کے ترچھوں پر — نگاہیں کر کے گر پڑتی ہے بجلی کی بھی اچھلیاں
صنم کی زلف میں کوچہ ہے سربستہ ہر اک مو پر — نہ دیکھی ہونگی تو نے خضر یہ ظلمات میں گلیاں

دوانہ ہو گیا تو میر آخر ریختہ کہہ کہہ
نہ کہتا تھا میں اے ظالم کہ یہ باتیں نہیں بھلیاں

ایسے محروم گئے ہم تو گرفتارِ چمن — کہ موئے قید میں دیوار بدیوارِ چمن
سینہ پر داغ کا احوال میں پوچھوں ہوں نسیم — یہ بھی تختہ کبھو ہووے گا سزاوارِ چمن
باغباں باغ اجاڑے ہی اگر دینا تھا — تھے زرِ داغ سے ہم بھی تو خریدارِ چمن
وے گنہگار ہیں ہم کہ جنھیں کہتے ہیں — عاشقِ زارِ چمن مرغِ گرفتارِ چمن
خون ٹپکے ہے پڑا نوک سے ہر اک کی ہنوز — کس ستمدیدہ کی مژگاں ہیں یہ خارِ چمن
باغباں ہم سے خشونت سے نہ پیش آیا کر — عاقبت نالہ کشاں بھی تو ہیں درکارِ چمن
کم نہیں ہے دلِ پر داغ بھی اے مرغِ اسیر — گل میں کیا ہے جو ہوا ہے تو طلبگارِ چمن
گل پر ایسی تو پڑی اوس خزاں میں کہ نسیم — سرد ہی ہو گئی وھاں گرمی بازارِ چمن

کیا جزا ٹھہرتی ہے دیکھیے کل حشر کو میر
داغ ہر ایک مرے دل پہ ہے خوندارِ چمن

۱۔ اصل نسخوں میں یہ غزل اسی طرح ہے۔

نالے کیا نہ کر سُنا نوحے مرے پہ عندلیب ۔۔۔ بات میں بات عیب ہے میں نے تجھے کہا نہیں
چشم سفید و اشک سرخ آہ دلِ حزیں ہے یہاں ۔۔۔ شیشہ نہیں ہے مے نہیں ابر نہیں ہوا نہیں
ایک فقط ہے سادگی تس پہ بلائے جاں ہے تو ۔۔۔ عشوہ کرشمہ کچھ نہیں آن نہیں ادا نہیں
آب و ہوائے ملکِ عشق تجربہ کی ہے میں بہت ۔۔۔ کر کے دوائے دردِ دل کوئی بھی پھر جیا نہیں
ہووے زمانہ کچھ سے کچھ چھوٹے ہے دل لگا مرا ۔۔۔ شوخ کسی ہی آن میں تجھ سے تو میں جدا نہیں

نازِ بتاں اُٹھا چکا دیر کو میرؔ ترک کر
کعبے میں جا کے رہ میاں تیرے مگر خدا نہیں

خوبرو سب کی جان ہوتے ہیں ۔۔۔ آرزوئے جہان[1] ہوتے ہیں
گوش دیوار تک تو جا نالے ۔۔۔ اس میں گل کو بھی کان ہوتے ہیں
کبھو آتے ہیں آپ میں تجھ بن ۔۔۔ گھر میں ہم میہمان ہوتے ہیں
دشت کے پھوٹے مقبروں پہ نہ جا ۔۔۔ روضے سب گلستان ہوتے ہیں
غمزۂ چشم خوش قدانِ زمیں ۔۔۔ فتنۂ آسمان ہوتے ہیں
کیا رہا ہے مشاعرے میں اب ۔۔۔ قطعہ لوگ کچھ جمع آن ہوتے ہیں

میرؔ و مرزا رفیع[2] و خواجہ میر[3]
کتنے یہ اک جوان ہوتے ہیں

[1] اعلانِ نون بعد عطف و اضافت اب فصحا جائز نہیں رکھتے۔ [2] یعنی مرزا رفیع سودا

[3] خواجہ میر یعنی حضرت خواجہ میر درد دہلوی جو میر تقی میرؔ کے معاصر ہی نہیں بلکہ خاص کرم فرما تھے اور آپ ہی کے والد ماجد خواجہ ناصر عندلیب نے میرؔ صاحب کو دُعا دی تھی "کہ میر تو میرِ مجلس خواہی شد"۔ یہ غالباً اسی مشاعرہ کا ذکر ہے جو خواجہ میر دردؔ کے مکان پر منعقد ہوتا تھا اور جو انھوں نے خوشی سے میرؔ صاحب کے یہاں منتقل کر دیا تھا اور میر صاحب بھی اُس کو مدتوں نباہتے رہے۔

خواجہ میر دردؔ اُردو اور فارسی کے زبردست اُستاد اور نہایت مستند تھے۔ میرؔ صاحب نے اپنے تذکرے میں اُن کے متعلق رائے لکھی ہے۔ "شاعر زور آور ریختہ۔ درکمال علاقگی وارستہ خلیق متواضع۔ آشنائے درست شعر فارسی ہم میگوید۔ اما بیشتر باعثِ گرمی بازار وسعت مشرب اوست۔ غرض از آشنائی مطلب اوست متوطن شاہجہان آباد۔ بزرگ و بزرگ زادہ جوان صالح از درویشی بہرہ وافی دارد و فقیر را بخدمت او بندگی خاص است" الخ۔ عمر بھر دہلی میں رہے انتقال بھی دہلی ہی میں ہوا۔ سنہ ولادت ۱۱۳۳ھ اور سنہ وفات ۱۱۹۹ھ ہے۔ آپ کی تصانیف قریب گیارہ بارہ کے ہیں۔ (آسی)

علم کو کب ہے وجہ تسمیہ لازم سمجھ دیکھو | سلیمانی میں کیا زنار ہی زنار کہتے ہیں
تری آنکھوں کو آؤں دیکھنے میں تو عجب مت کر | کہ بہتیرے عیادت اور انھیں بیمار کہتے ہیں
عجب ہوتے ہیں شاعر بھی میں اس فرقے کا عاشق ہوں | کہ بے دھڑکے بھری مجلس میں یہ اسرار کہتے ہیں
مرے ان کے اڑا لیکن نہ یہ سمجھیں تو بہتر ہے | کہ خوباں بھی بہت اپنے تئیں عیار کہتے ہیں

سگِ کو میر میں اس شیرِ حق کا ہوں کہ جسکو سب
نبیؐ کا خویش و بھائی حیدرِ کرار کہتے ہیں

ایک پرواز کو بھی رخصتِ صیاد نہیں | ورنہ یہ کنجِ قفس بیضۂ فولاد نہیں
شیخ عزلت تو تہِ خاک بھی پہنچیگی بہم | مفت ہے سیر کہ یہ عالم ایجاد نہیں
داد لے چھوڑوں میں صیاد سے اپنی لیکن | ضعف سے میرے تئیں طاقتِ فریاد نہیں
کیوں ہے معذور بھی رکھیوں تو سمجھ دل میں شیخ | یہ قدح خوار مرے قابلِ ارشاد نہیں

کیا کہوں میر فراموش کیا اُن نے مجھے
میں تو تقریب بھی کی پر تو اُسے یاد نہیں

آجائیں ہم نظر جو کوئی دم بہت ہے یہاں | مہلت ہمیں بسانِ شرر کم بہت ہے یہاں
یک لحظہ سینہ کوبی سے فرصت ہمیں نہیں | یعنی کہ دل کے جانیکا ماتم بہت ہے یہاں
حاصل ہے کیا سوائے ترائی کے دہر میں | اُٹھ آسماں تلے سے کہ شبنم بہت ہے یہاں
مائل بغیر ہونا تجھ ابرو کا عیب ہے | تھی زور یہ کماں و لے خم چم بہت ہے یہاں
ہم رہروانِ راہِ فنا دیر رہ چکے | وقفہ بسانِ صبح کوئی دم بہت ہے یہاں
اس بتکدے میں معنی کا کس سے کریں سوال | آدم نہیں ہے صورتِ آدم بہت ہے یہاں
عالم میں لوگ ملنے کی گوں اب نہیں رہے | ہر چند ایسا ویسا تو عالم بہت ہے یہاں
ویسا چمن سے سادہ نکلتا نہیں کوئی | رنگینی ایک اور خم و چم بہت ہے یہاں
اعجازِ عیسوی سے نہیں بحث عشق میں | تیری ہی بات جانِ مجسم بہت ہے یہاں
میرے ہلاک کرنے کا غم ہے عبث تمھیں | تم شاد زندگانی کرو غم بہت ہے یہاں
دل مت لگا رُخِ عرق آلود یار سے | آئینہ کو اُٹھا کہ زمیں نم بہت ہے یہاں

شاید کہ کام صبح تک اپنا کھنچے نہ میر
احوال آج شام سے درہم بہت ہے یہاں

بزم میں جو ترا ظہور نہیں — شمع روشن کے منھ پہ نور نہیں
کتنی باتیں بنا کے لاؤں لیک — یاد رہتی ترے حضور نہیں
فکر مت کر ہمارے جینے کا — قطعہ — تیرے نزدیک کچھ یہ دور نہیں
پھر جئیں گے جو تجھ سا ہے جاں بخش — ایسا جینا ہمیں ضرور نہیں

عام ہے یار کی تجلی میر
خاص موسیٰ و کوہ طور نہیں

دامن پہ تیرے گرد کا کیونکر اثر نہیں — ہم دل جلوں کی خاک جہاں میں کدھر نہیں
اتنا رقیب خانہ بر انداز سے سلوک — جب آ نکلتے ہیں تو سنتے ہیں کہ گھر نہیں
داماں و جیب و دیدہ و مژگان و آستیں — اب کون سا رہا ہے کہ ان میں سے تر نہیں
ہر نقش پا ہے شوخ ترا رشک یاسمن — کم گوشۂ چمن سے ترا رہگزر نہیں

آتا ہی میر کوچے میں ہوتا جو میر یہاں
کیا جانئے کدھر کو گیا کچھ خبر نہیں

ساقی کے باغ پر جو کچھ کم نگاہیاں ہیں — مانند جام خالی گل سب جماہیاں ہیں
تیغ جفائے خوباں بے آب تھی کہ ہمدم — زخم بدن ہمارے تفسیدہ ماہیاں ہیں
مسجد سے میکدے پر کاش ابر روز برسے — دھلاں و سفیدیاں ہیں یہاں روسیاہیاں ہیں
جس کی نظر پڑی ہے ان نے مجھے بھی دیکھا — جب سے وہ شوخ آنکھیں ہیں بے سراہیاں ہیں
غالب تو یہ ہے زاہد رحمت سے دور ہووے — در کارواں گنہ ہیں یہاں بیگناہیاں ہیں
یہ ناز و سرگرانی اللہ رے کہ ہر دم — نازک مزاجیاں ہیں یا کج کلاہیاں ہیں

شاہد ہوں میر کس کو اہل محلہ سے میں
محضر پہ خوں کے میرے سب کی گواہیاں ہیں

تجھے بھی یار اپنا یوں تو ہم ہر بار کہتے ہیں — ولے کم ہیں بہت وے لوگ جن کو یار کہتے ہیں
جہاں کے مصطبے میں مست طالع ہی نظر آئے — نہ تھا اس دور میں آیا جسے ہشیار کہتے ہیں
سمجھ کر ذکر کر آسودگی کا مجھ سے اے ناصح — وہ میں ہی ہوں کہ جس کو عافیت بیزار کہتے ہیں
مسافر ہووے جی اس کا خراماں دیکھ کر تجھ کو — جسے میرے وطن میں کبک خوش رفتار کہتے ہیں
معاذ اللہ دخل کفر ہی اسلام میں کیوں ہو — غلط اور پوچ نامعقول بعضے یار کہتے ہیں

وہ دہاں وہ کمر ہی ہے مقصود — اور کچھ اب نہیں خیال ہمیں
اُس مہِ چار دہ کی دُوری نے — دس ہی دن میں کیا ہلال ہمیں
نظر آتے ہیں ہوتے جی کے وبال — حلقہ حلقہ تمھارے بال ہمیں
تنگی اس جا کی نقل کیا کریے — یھاں سے واجب ہے انتقال ہمیں
صرف للہ خم کے خم کرتے — نہ کیا چرخ نے کلال ہمیں
مغبچے مال مست ہم درویش — کون کرتا ہے یشتمال ہمیں
کبتک اس تنگنا میں کھینچیے رنج — یھاں سے یارب تو ہی نکال ہمیں
ترک سبزانِ شہر کریے اب — بس بہت کر چکے نہال ہمیں

وجہ کیا ہے کہ میر منہ پہ ترے
نظر آتا ہے کچھ ملال ہمیں

نہ کیونکہ شیخ توکل کو اختیار کریں — زمانہ ہووے مساعد تو روزگار کریں
گیا وہ زمزمۂ صبح فصلِ گل بلبل — دُعا نہ پہنچے چمن تک ہم اب ہزار کریں
تمام صید سرِ تیر جمع ہیں لیکن — نصیب اُس کے کہ جس کو ترا شکار کریں
تسلی تو ہو دلِ بیقرار خوباں سے — یہ کاش ملنے نہ ملنے کا کچھ قرار کریں
ہمیں تو نزع میں شرمندہ آ کے اُن نے کیا — رہا ہے ایک رمق جی سو کیا نثار کریں
رہی سہی بھی گئی عمر تیرے پیچھے یار — یہ کہہ کہ آہ ترا کب تک انتظار کریں
کریں ہیں حادثے ہر روز وار آخر تو — سنان آہ دلِ شب کی ہم بھی پار کریں
یہ قتلِ غیر ہی کیا کام ہمنشیناں آج — جو دشمنی نہ کرے وہ تو اُس کو یار کریں

ہوا ہوں خاکِ رہ اس واسطے کہ خوباں میر
گزار گور پہ میری بھی ایک بار کریں

یہ غلط کہ میں پیا ہوں قدحِ شراب تجھ بن — نہ گلے سے میرے اُترا کبھو قطرہ آب تجھ بن
یہی بستی عاشقوں کی کبھو سیر کرنے چل تو — کہ محلے کے محلے پڑے ہیں خراب تجھ بن
میں لہو پیوں ہوں غم میں عوضِ شراب ساقی — شبِ میغ ہو گئی ہے شبِ ماہتاب تجھ بن
گئی عمر میری ساری جیسے شمع بادکے بیچ — یہی رونا جلنا گلنا یہی اضطراب تجھ بن
سبھی آتشیں ہیں نالے سبھی زمہریری آہیں — مری جان پر رہا ہے غرض اک عذاب تجھ بن

نگاہِ چشمِ پرخشمِ بتاں پر مت نظر رکھنا ملا ہی زہر اے دل اس شرابِ پرتگالی میں
شرابِ خون بن ترٹپھوں نے دل لبریز رہتا ہی بھرے ہیں سنگریزے میں نے اس مینائی خالی میں

خلاف ان اور خوباں کے سدا یہ جی میں رہتا ہی
یہی تو میر اک خوبی ہی معشوقِ خیالی میں

آہ اور اشک ہی سدا ہی یہاں روز برسات کی ہوا ہی یہاں
جس جگہ ہو زمین تفتہ سمجھ کہ کوئی دل جلا گرا ہی یہاں
گو کدورت سے وہ نہ دیوے رو آرسی کی طرح صفا ہی یہاں
رند مفلس جگر میں آہ نہیں جان محزوں ہے اور کیا ہی یہاں
کیسے کیسے مکان ہیں ستھرے قطعہ ایک ازاں جملہ کربلا ہی یہاں
اک سسکتا ہی ایک مرتا ہے ہر طرف ظلم ہو رہا ہی یہاں
صد تمنا شہید ہیں یکجا سینہ کوبی ہی تعزیا ہی یہاں
دیدنی ہی غرض یہ صحبتِ شوخ روز و شب طرفہ ماجرا ہی یہاں
خانۂ عاشقاں ہی جائے خوب جائے رونے کی جا بجا ہی یہاں
کوہ و صحرا بھی کر نہ جائے باش قطعہ آجتک کوئی بھی رہا ہی یہاں
ہی خبر شرط میر سنتا ہے تجھ سے آگے یہ کچھ ہوا ہی یہاں

موت مجنوں کو بھی یہیں آئی
کوہکن کل ہی مر گیا ہی یہاں

جہاں اب خار زاریں ہو گئی ہیں یہیں آگے بہاریں ہو گئی ہیں
جنوں میں خشک ہو رگہائے گردن گریباں کی سی تاریں ہو گئی ہیں
سنا جاتا ہی شہرِ عشق کے گرد مزاریں ہی مزاریں ہو گئی ہیں
اسی دریائے خوبی کا ہی یہ شوق کہ موجیں سب کناریں ہو گئی ہیں

انھیں گلیوں میں جب روتے تھے ہم میر
کئی دریا کی دھاریں ہو گئی ہیں

خوش نہ آئی تمھاری چال ہمیں یوں نہ کرنا تھا پائمال ہمیں
حال کیا پوچھ پوچھ جاتے ہو کبھو پاتے بھی ہو بحال ہمیں

خطرِ راہِ وفا بلکہ بہت دور کھنچا　　عمر گزری کہ بہم نامہ و پیغام نہیں
رازپوشی محبت کے تئیں چاہیے ضبط　　سو تو بیتابیِ دل بن مجھے آرام نہیں

بیقراری جو کوئی دیکھے ہے سو کہتا ہے
کچھ تو ہے میر کہ اک دم تجھے آرام نہیں

کیا ظلم کیا تعدی کیا جور کیا جفائیں　　اس چرخ نے کیاں ہیں ہم سے بہت ادائیں
دیکھا کہاں وہ نسخہ اک روگ میں بسا ہا　　جی پھر کبھو نہ بنیا بہتیری کیں دوائیں
اک رنگِ گل پی رہنا یھاں بو نہیں کیا ہے　　اس گلشنِ جہاں میں ہیں مختلف ہوائیں
ہے فرش عرش تک بھی قلبِ حزیں کا اپنے　　اس تنگ گھر میں ہم نے دیکھی ہیں کیا فضائیں
شب نالہ آسماں تک جی سخت کرکے پہنچا　　تھیں نیم کشتہ یاس اکثر مری دعائیں
روکش تو ہو ترا پر آئینے میں کہاں یہ　　رعنائیاں ادائیں رنگینیاں صفائیں
ہے امر سہل چاہت لیکن نباہ مشکل　　پتھر کرے جگر کو تب تو کرے وفائیں

نازِ بتانِ سادہ ہے اللہ اللہ اے میر
ہم خط سے مٹ گئے پر اُن کے نہیں ہیں بھائیں

آرزوئیں ہزار رکھتے ہیں　　تو بھی ہم دل کو مار رکھتے ہیں
برق کم حوصلہ ہے ہم بھی تو　　دلکِ بیقرار رکھتے ہیں
غیر ہی موردِ عنایت ہے　　ہم بھی تو تم سے پیار رکھتے ہیں
نہ نگہ نے پیام نے وعدہ　　نام کو ہم بھی یار رکھتے ہیں
ہم سے خوش زمزمہ کہاں یوں تو　　لب و لہجہ ہزار رکھتے ہیں
چوٹٹے دل کے ہیں بتاں مشہور　　بس یہی اعتبار رکھتے ہیں

پھر بھی کرتے ہیں میر صاحب عشق
ہیں جواں اختیار رکھتے ہیں

گذر جان سے اور ڈر کچھ نہیں　　رہِ عشق میں پھر خطر کچھ نہیں
ہے اب کام دل جس پہ موقوف تو　　وہ نالہ کہ جس میں اثر کچھ نہیں
ہوا مائل اُس سرو کا دل مرا　　بجز جور جس سے ثمر کچھ نہیں
نہ کر اپنے محزوں کا ہرگز سراغ　　گئے گزرے بس اب خبر کچھ نہیں

ترے غم کا شکرِ نعمت کروں کیا ای مغبچہ میں
نہوا کہ میں نہ کھایا جگر کباب تجھ بن

نہیں جیتے جی تو ممکن ہمیں تجھ بغیر سونا
مگر آنکہ مر کے کیجے تہِ خاک خواب تجھ بن

بُرے حال ہو کے مرتا جو درنگ میر کرتا
یہ بھلا ہوا ستمگر کہ موا شتاب تجھ بن

تکلیف باغ کن نے کی تجھ خوش دہاں کے تئیں
دیتا ہے اگ رنگ ترا گلستاں کے تئیں

تنکا بھی اب رہا نہیں شرمندگی ہے جو
گر پڑ کے برق یاد مرے آشیاں کے تئیں

آئے عدم سے ہستی میں تس پر نہیں قرار
ہو ان مسافروں کا ارادہ کہاں کے تئیں

سناہے میں باغ کے کچھ اٹھتے ہیں نسیم
مرغ چمن نے خوب متھا ہی فغاں کے تئیں

اک گردش ای فلک کہ ہوا شنائے راہ سے
کنعاں کی اور راہ غلط کارواں کے تئیں

تو اک زباں پہ چپکی نہیں رہتی عندلیب
رکھتا ہے منہ میں غنچۂ گل سو زباں کے تئیں

ہم تو ہوئے تھے میر سے اس دن ہی نا امید
جس دن سنا کہ ان نے دیا دل بتاں کے تئیں

موے سہتے سہتے جفا کاریاں
کوئی ہم سے سیکھے وفاداریاں

ہماری تو گزری اسی طور عمر
یہی نالہ کرنا یہی زاریاں

فرشتہ جہاں کام کرتا نہ تھا
مری آہ نے برچھیاں ماریاں

گیا جان سے اک جہاں لیک شوخ
نہ تجھ سے گئیں یہ دل آزاریاں

کہاں تک یہ تکلیف ما لا یطاق
ہوئیں مدتوں ناز برداریاں

خط و کاکل و زلف و انداز و ناز
ہوئیں دام رہ صد گرفتاریاں

کیا درد و غم نے مجھے نا امید
کہ مجنوں کو یہ ہی تھیں بیماریاں

تری آشنائی سے ہی حد ہوئی
بہت کی تھیں دنیا میں ہم یاریاں

نہ بھائی ہماری تو قدرت نہیں
کھنچیں میر تجھ سے ہی یہ خواریاں

دن نہیں رات نہیں صبح نہیں شام نہیں
وقت ملنے کا مگر داخلِ ایام نہیں

مثل عنقا[1] مجھے تم دور سے سن لو ورنہ
ننگ ہستی ہوں مری جائے بجز نام نہیں

[1] میر کا یہ شعر بھی ایسا ہی ہے ۔ آوازہ ہی جہاں میں ہمارا سنا کرو ۔ عنقا کی طرح زیست ہے اپنی بنام یاں

پانوؤں میں وہ نشہ طلب کا نہیں
اب تو سرمستِ خواب ہیں دونوں

ایک سب آگ ایک سب پانی
دیدہ و دل عذاب ہیں دونوں

بحث کاہیکو لعل و مرجاں سے
اُس کے لب ہی جواب ہیں دونوں

آگے دریا تھے دیدۂ تر میر
اب جو دیکھو سراب ہیں دونوں

ردیف واو

فلک نے گر کیا رخصت مجھے سیرِ بیاباں کو
نکالا سر سے میرے جائے مو خارِ مغیلاں کو

وہ ظالم بھی تو سمجھے کہہ رکھا ہے ہم نے یاراں کو
کہ گورستان سے گاڑیں جدا ہم اہلِ ہجراں کو

نہیں یہ بیدِ مجنوں گردشِ گردونِ گرداں نے
بنایا ہے شجر کیا جانیے کس مو پریشاں کو

ہوئے[1] تھے جیسے مرجاتے پر اب تو سخت حسرت ہے
کیا دشوار نادانی سے ہم نے کارِ آساں کو

کہیں نسلِ آدمی کی اٹھ سجاوے اس زمانے میں
کہ موتی آبِ حیواں جانتے ہیں آبِ انساں کو

تجھے گر چشمِ عبرت ہے تو آندھی اور بگولے سے
تماشا کر غبارِ انسانی خاکِ عزیزاں کو

ہوائے ابر میں گرمی نہیں جو تو نہ ہو ساقی
دمِ افسردہ کردے منجمد رشحاتِ باراں کو

جلیں ہیں کب کے مژگاں آنسوؤں کی گرمجوشی سے
اس آبِ چشم کی جوشش نے آتش دی نیستاں کو

غرورِ ناز سے آنکھیں نہ کھولیں اُس جفاجو نے
ملا پانوؤں تلے جبتک نہ چشمِ صد غزالاں کو

نہ سی چشمِ طمع خوانِ فلک پر خام دستی سے
کہ جامِ خون دیا ہے ہر سحر یاں اپنے مہماں کو

بنے ناواقفِ شادی اگر ہم بزمِ عشرت میں
دہانِ زخمِ دل سمجھے جو دیکھا روئے خنداں کو

نہیں ریگِ رواں مجنوں کی دل کی بیقراری نے
کیا ہے مضطرب ہر ذرہ گردِ بیاباں کو

(جونے دیکھا نے سی)

کسی کے واسطے رسوائے عالم ہو پہ جی میں رکھ
کہ مارا جائے جو ظاہر کرے اس رازِ پنہاں کو

گری پڑتی ہے بجلی ہی تبھی سے خرمنِ گل پہ
ٹک اک ہنس میری رونے پر کہ دیکھے تیرے دنداں کو

غرورِ ناز قاتل کو لئے جا ہے کوئی پوچھے
چلا تو سونپ کر کس کے تئیں اس صیدِ بیجاں کو

وہ تخمِ سوختہ تھے ہم کہ سرسبزی نہ کی حاصل
ملایا خاک میں دانہ نمط حسرت سے دہقاں کو

ہوا ہوں غنچۂ پژمردہ آخر فصل کا تجھ بن
نہ دے برباد حسرت کشتہ سر در گریباں کو

[1] ہوئے تھے جیسے۔ یعنی جیسے ہی پیدا ہوئے تھے ۱۲

تری ہو چلی خشک مژگاں کی ہب | لعاب جگر میں مگر کچھ نہیں
حیا سے نہیں پشتِ پا پردہ چشم | مرا حال مدنظر کچھ نہیں
کروں کیونکہ انکارِ عشق آہ میں | یہ رونا بھلا کیا ہی گر کچھ نہیں

کمر اُس کی رشکِ رگِ جاں ہے میر
غرض اُس سے باریک تر کچھ نہیں

نالۂ قیدِ قفس سے چھوٹ اب اک دم نہیں | گوشِ گل سے لگتے تھے جا کے سو وہ موسم نہیں
ہم پہ کھینچی تیغ تو غیروں کو ٹک لگنے نہ دے | وے اگر ہوویں گے اُس کے درمیاں تو ہم نہیں

بت برہمن کو ہی نامحرم نہیں اللہ کا
ہے حرم میں شیخ لیکن میر وہ محرم نہیں

تری ابرو و تیغ تیز تو ہمدم ہیں یہ دونوں | ہوئے ہیں دل جگر بھی سامنے رستم ہیں یہ دونوں
نہ کچھ کاغذ میں ہی تہ نے قلم کو درد نالوں کا | لکھوں کیا عشق کے حالات نامحرم ہیں یہ دونوں
لہو آنکھوں سے بہتے وقت رکھ لیتا ہوں ہاتھوں کو | جراحت ہیں اگر وے دونوں تو مرہم ہیں یہ دونوں
کسو چشمہ پہ دریا کے دیا اوپر نظر رکھئے | ہمارے دیدۂ نم دیدہ کیا کچھ کم ہیں یہ دونوں
لبِ جاں بخش اُس کے مار ہی رکھتے ہیں عاشق کو | اگرچہ آبِ حیواں ہیں و لیکن سم ہیں یہ دونوں
نہیں ابرو ہی مائل جھک رہی ہے تیغ بھی ایدھر | ہمارے کشت و خوں میں متفق باہم ہیں یہ دونوں
کھلے سینے کے داغوں پر ٹھہر رہتے ہیں کچھ آنسو | چمن میں مہر ورزی کے گل و شبنم ہیں یہ دونوں
کبھو دل رکنے لگتا ہے جگر گاہے تڑپتا ہے | غمِ ہجراں میں چھاتی کے ہمارے جم ہیں یہ دونوں

خدا جانے کہ دنیا میں ملیں اس سے کہ عقبیٰ میں
مکاں تو میر صاحب شہرۂ عالم ہیں یہ دونوں

لب ترے لعلِ ناب ہیں دونوں | پر تمامی عتاب ہیں دونوں
رونا آنکھوں کا روئیے کب تک | پھوٹنے ہی کے باب ہیں دونوں
ہے تکلف نقاب وے رخسار | کیا چھپیں آفتاب ہیں دونوں
تن کے معمورہ میں یہی دل و چشم | گھر تھے دو سو خراب ہیں دونوں
کچھ نہ پوچھو کہ آتشِ غم سے | جگر و دل کباب ہیں دونوں
سو جگہ اُس کی آنکھیں پڑتی ہیں | جیسے مستِ شراب ہیں دونوں

خط لکھکے کوئی سادہ نہ اُس کو ملول ہو
ہم تو ہوں بدگمان جو قاصد رسول ہو

چاہوں تو بھر کے کولی اُٹھالوں ابھی تمھیں
کیسے ہی بھاری ہو مرے آگے تو پھول ہو

سرمہ جو نور بخشے ہی آنکھوں کو خلق کی
شاید کہ راہِ یار کی ہی خاک دھول ہو

جاویں نثار ہونے کو ہم کس بساط پر
اک نیمجان رکھیں ہیں سو وہ جب قبول ہو

ہم ان دنوں میں لگ نہیں پڑتی ہیں صبح شام
ورنہ دعا کریں تو جو چاہیں حصول ہو

دل لیکے لونڈے دلی کے کب کا بچا گئے
اب اُن سے کھائی پی ہوئی شے کیا وصول ہو

ناکام اس لئے ہو کہ چاہو ہو سب کچھ آج
تم بھی تو میر صاحب قبلہ عجول ہو

کہتے ہو اتحاد ہی ہم کو
ہاں کہو اعتماد ہی ہمکو

شوق ہی شوق ہی نہیں معلوم
اُس سے کیا دل نہاد ہی ہمکو

خط سے نکلے ہی بیوفائی حسن
اس قدر تو سواد ہی ہمکو

آہ کس ڈھب سے روئیے کم کم
شوق حد سے زیاد ہی ہمکو

شیخ و پیر مغاں کی خدمت میں
دل سے اک اعتقاد ہی ہمکو

سادگی دیکھ عشق میں اُسکی
خواہش جان شاد ہی ہمکو

بدگمانی ہے جس سے تس سے آہ
قصد شور و فساد ہی ہمکو

دوستی ایک سے بھی تجھ کو نہیں
اور سب سے عناد ہی ہمکو

نامرادانہ زیست کرتا تھا
میر کا طور یاد ہے ہم کو

مباد کینے پہ اُس بت کی طبع آئی ہو
پھر ایک بس ہی وہی گو اُدھر خدائی ہو

مدد نہ اتنی بھی کی بختِ ناموافق نے
کہ مدعی سے اُسے ایک دن لڑائی ہو

ہنوز طفل ہی وہ ظلم پیشہ کیا جانے
لگاوے تیغ سلیقہ سے جو لگائی ہو

لبوں سے تیرے تھا آگے ہی لعل سرخ و زرد
قسم ہی میں نے اگر بات بھی چلائی ہو

خدا کرے کہ نصیب اپنے ہو نہ آزادی
کدھر کے ہوجے جو بے بال و پر رہائی ہو

مزے کو عشق کی ذلت کے جانتا ہی وہی
کسو کی جن نے کبھو لات مُکی کھائی ہو

اُس آفتاب سے تو فیض سب کو پہنچے ہے
یقین ہی کہ کچھ اپنی ہی نارسائی ہو

غم و اندوہ و بیتابی الم بیطاقتی حرماں — کہوں اے ہمنشیں تا چند غمہائے فراواں کو
بہت روئے جو ہم یہ آستیں رکھ منہ پہ ای بجلی — نہ چشم کم سے دیکھ اس یادگارِ چشم گریاں کو

مزاج اس وقت ہی اک مطلعِ تازہ پہ کچھ مائل
کہ بے فکر سخن بنتی نہیں ہرگز سخنداں کو

نسیم مصر کب آئی سوادِ شہر کنعاں کو — کہ بھر جھولی نہ یہاں سے لیگئی گلہائے حرماں کو
زبانِ نوحہ گر ہوں میں قضا نے کیا ملایا تھا — مری طینت میں یارب سودۂ دلہائے نالاں کو
کوئی کانٹا سرِ رہ کا ہماری خاک پر بس ہی — گل گلزار کیا درکار ہی گورِ غریباں کو
یہ کیا جانوں ہوا سینے میں کیا اس دل کو ناصح — سحر خوں بستہ تو دیکھا تھا میں نے اپنی مژگاں کو
گل و سنبل ہیں نیرنگِ قضا مت سرسری گزرے — کہ بگڑی زلف و رخ کیا کیا بنائی اس گلستاں کو
صدائے آہ جیسے تیر جی کے پار ہوتی ہے — کسو بیدرد نے کھینچا کسو کے دل سے پیکاں کو
کریں پامالِ ملک فرشِ رہ اس ساعت کہ محشر میں — لہو ڈوبا کفن لاویں شہیدِ ناز خوباں کو
کیا سیر اس خرابے کا بہت اب چلکے سو رہیے — کسو دیوار کے سایہ میں منہ پر لیکے داماں کو
بہائے سہل پر دیتے ہیں کس محبوب کو کفے سے — قلم اس جرم پر کرنا ہے دستِ گلفروشاں کو

تری ہی جستجو میں گم ہوا ہی کہہ کہاں کھویا
جگر خوں گشتہ دلِ آزردہ میر اس خانہ ویراں کو

قد کھینچے ہی جسوقت تو ہی طرفہ بلا تو — کہتا ہی ترا سایہ پری سے کہ ہی کیا تو
گر اپنی روش راہ چلا یار تو ای کبک — رہجائیگا دیوارِ گلستاں سے لگا تو
بے گل نہیں بلبل تجھے بھی چین پہ دیکھیں — مر رہتے ہیں ہم ایک طرف باغ میں یا تو
خوش رو ہی بہت ای گل تر تو بھی ولیکن — انصاف ہی منہ تیرے ہی و لیا ہی بھلا تو
کیا جانیے ای گوہر مقصد تو کہاں ہی — ہم خاک میں بھی مل گئے لیکن نہ ملا تو
اس جینے سے اب دل کو اٹھا بیٹھیں گے ہم بھی — ہی تجھ کو قسم ظلم سے مت ہاتھ اٹھا تو
منظر میں بدن کے بھی یہ اک طرفہ مکاں تھا — افسوس کہ ٹک دل میں ہمارے نہ رہا تو
تھے چاک گریبان گلستاں میں گلوں کے — نکلا ہی مگر کھولے ہوئے بندِ قبا تو

بیہوشی سی آتی ہی تجھے اس کی گلی میں
گر ہو سکے ای میر تو اس راہ نہ جا تو

تھے ہیں آرزو لب خنداں — سو عوض اُس کے چشم تر دیکھو
رنگِ رفتہ بھی دل کو کھینچے ہی — ایک شب اور یہاں سحر دیکھو
دل ہوا ہی طرف محبت کا — خون کے قطرے کا جگر دیکھو
پہنچے ہیں ہم قریب مرنے کے — یعنی جاتے ہیں دور اگر دیکھو
لطف مجھ میں بھی ہیں ہزاروں میر
دیدنی ہوں جو سوچ کر دیکھو

آرام ہو چکا مرے جسمِ نزار کو — رکھے خدا جہاں میں دلِ بیقرار کو
پانی پہ جیسے غنچۂ لالہ پھرے بہا — دیکھا میں آنسوؤں میں دلِ داغدار کو
برسا تو میرے دیدۂ خونبار کے حضور — پر ابتک انفعال ہی ابرِ بہار کو
ہنستا ہی میں پھر دلِ مرا کچھ ہو اختیار — پر کیا کروں میں دیدۂ بے اختیار کو
آیا جہاں میں دوست بھی ہوتی ہیں یکدگر — مجھ سے تو دشمنی ہی رہی میری یار کو
سو بار یوں تو غیر سے کرتی ہو ہنسکی بات — کچھ منھ بنا رہی ہو ہماری ہی بار کو
سرگشتگی سوائے نہ دیکھا جہاں میں کچھ — اک عمر خضر سیر کیا اس دیار کو
کس کس کی خاک اب کی تلاش ہی خاک میں — جاتی ہی پھر نسیم اسی رہ گذار کو
ای وہ کوئی جو آج پیئے ہی شرابِ عیش — خاطر میں رکھیو کل کے بھی رنج و خمار کو
خوباں کا کیا جگر جو کریں مجھ کو اپنا صید — پہچانتا ہی سب کوئی تیرے شکار کو
جیتے جی فکر خوب ہی ورنہ یہ بد بلا — رکھے گا حشر تک تہ و بالا مزار کو
گر ساتھ لے گڑا تو دل مضطرب میر
آرام ہو چکا ترے مشتِ غبار کو

اچھی لگے ہی تجھ بن گلگشتِ باغ کس کو — صحبت رکھے گلوں سے اتنا دماغ کس کو
بے سوز داغ دل پر گر بھی جلے بجا ہے — اچھا لگے ہی اپنا گھر بے چراغ کس کو
صد چشم داغ و آہیں دل پر مرے میں وہ ہوں — دکھلا رہا ہی لالہ تو اپنا داغ کس کو
گلچین عیش ہوتے ہم بھی چمن میں جاکر — آہ و فغاں سے اپنی لیکن فراغ کس کو
اُس کی بلا سے جو ہم ای میر گم بھی ہوویں
ہم سے غریب کا ہو فکر سراغ کس کو

کبھو ہی چھیڑ کبھو گالی ہو کبھو چشمک
بیان کریے جو ایک اُس کی بے ادائی ہو

دیارِ حسن میں غالب کہ خستہ جانوں نے
دوا کے واسطے بھی مہر تک نہ پائی ہو

ہزار مرتبہ بہتر ہے بادشاہی سے
اگر نصیب ترے کوچہ کی گدائی ہو

جو کوئی دم ہو تو کوہو سا پی کے رہ جاؤں
غموں کی دل میں بھلا کب تلک سمائی ہو

مغاں سے راہ تو ہو جائے رفتہ رفتہ شیخ
ترا بھی قصد اگر ترکِ پارسائی ہو

کہیں تو ہیں کہ عبث میر نے دیا جی کو
خدا ہی جانے کہ کیا جی میں اُس کے آئی ہو

ای چرخ مت حریفِ اندوہ بیکساں ہو
کیا جانے منہ سے نکلے نالہ کہ کیا سماں ہو

کبتک گرہ رہیگا سینہ میں دل کے مانند
ای اشکِ شوق اک دم رخسار پر رواں ہو

ہم دور ماندگاں کی منزل رساں مگر اب
یا ہو صدا جرس کی یا گردِ کارواں ہو

مسند نشین ہو گر عرصہ ہی تنگ اُس پر
آسودہ وہ کسو کا جو خاکِ آستاں ہو

تا چند کوچہ گردی جیسے صبا زمیں پر
ای آہِ صبحگاہی آشوبِ آسماں ہو

گر ذوقِ سیر ہے تو آوارہ اس چمن میں
مانندِ عندلیبِ گم کردہ آشیاں ہو

یہ جان تو کہ ہو اک آوارہ دست بر دل
خاکِ چمن کے اوپر برگِ خزاں جہاں ہو

کیا ہی حباب ساں یاں آ دیکھ اپنی آنکھوں
گر پیرہن میں میرے میرا تجھے گماں ہو

از خویش رفتہ ہر دم رہتے ہیں ہم جو اس بن
کہتے ہیں لوگ اکثر اس وقت تم کہاں ہو

پتھر سے توڑ ڈالوں آئینہ کو ابھی میں
گر روے خوبصورت تیرا نہ درمیاں ہو

اس تیغ زن سے کہیو قاصد مری طرف سے
ابتک بھی نیم جاں ہوں گر قصد امتحاں ہو

ہمسایہ اس چمن کے کتنے شکستہ پر ہیں
اتنے لئے کہ شاید اک باؤ گلفشاں ہو

میر اُس کو جان کر تو بے شبہ ملیو رہ پر
صحرا میں جو نمد مو بیٹھا کوئی جواں ہو

گرچہ کب دیکھتے ہو پر دیکھو
آرزو ہے کہ تم ادھر دیکھو

عشق کیا کیا ہمیں دکھاتا ہی
آہ تم بھی تو اک نظر دیکھو

یوں عرق جلوہ گر ہی اُس منھ پر
جس طرح اوس پھول پر دیکھو

ہر خراشِ جبیں جراحت ہی
ناخنِ شوق کا ہنر دیکھو

اک دم تو ہم میں تیغ کو تو بیدریغ کھینچ
تا عشق میں ہوس میں تنک امتیاز ہو

نزدیک سوزِ سینہ کے رکھ اپنے قلب کو
وہ دل ہی کیمیا ہی جو گرم گداز ہو

ہی فرق ہی میں خیر نکر آرزوی وصل
ل بیٹھیے جو اس سے تو شکوہ دراز ہو

جوں توں کی اس کی چاہ کا پردا کیا ہی میں
ای چشم گریہ ناک نہ افشائے راز ہو

جوں[1] چشم بسملی نہ مندی آویگی نظر
جو آنکھ میرے خونی کے چہرے پہ باز ہو

ہم سے بہ غیر عجز کبھو کچھ بنا نہ میر
خوش حال وہ فقیر کہ جو بے نیاز ہو

نالہ مرا اگر سببِ شور و شر نہو
پھر مر بھی جائیے تو کسو کو خبر نہو

دل پر ہوا سو آہ کے صدمے سی ہو چکا
ڈرتا ہوں یہ کہ اب کہیں ٹکڑی جگر نہو

برچھی سی پار عرش کے گزری نہ عاقبت
آہِ سحر میں میری کہانتک اثر نہو

سمجھا ہوں تیری آنکھ چھپانی سی خوش نگاہ
مدنظر یہ ہے کہ کسی کی نظر نہو

کھینچے ہی دلکو زلف سے گاہی نگہ سے گاہ
قطعہ حیراں نہووے کوئی تو اس طرز پر نہو

سو دل سی بھی نہ کام چلے اس کے عشق میں
اک دل رکھوں ہوں میں تو کدھر ہو کدھر نہو

جس راہ ہو کے آج میں پہنچا ہوں تجھ تلک
قطعہ کافر کا بھی گزار الٰہی ادھر نہو

یکجا نہ دیکھی آنکھوں سے ایسی تمام راہ
جس میں بجائی نقشِ قدم چشمِ تر نہو

ہر اک قدم پہ لوگ ڈرانے لگے مجھے
ہاں ہاں کسو شہیدِ محبت کا سر نہو

چلیو سنبھل کے سب یہ شہیدانِ عشق ہیں
تیرا گزار تا کہ کسو نعش پر نہو

دامن کشاں ہی جا کہ طپش پر طپش ہی دفن
زنہار کوئی صدمے سی زیر و زبر نہو

مضطر ہو اختیار کی وہ شکل دل میں میں
اس راہ ہو کے جاؤں یہ صورت جدھر نہو

لیکن عبث نگاہ جہاں کریے اس طرف
امکان کیا کہ خون مرے تا کمر نہو

حیراں ہوں میں کہ ایسی یہ مشہد ہی کونسی
مجھ سی خراب حال کو جس کی خبر نہو

آتا ہی یہ قیاس میں اب تجھ کو دیکھ کر
ظالم جفا شعار ترا رہ گزر نہو

اٹھ جائے رسم نالہ و آہ و فغاں سب
اس تیرہ روزگار میں تو میر اگر نہو

[1] جوں چشم بسمل یعنی چشم بسمل کی مانند۔

دن گزرتا ہی مجھے فکر ہی میں، تا کیا ہو | رات جاتی ہی اسی غم میں کہ فردا کیا ہو
سب ہیں دیدار کے مشتاق پراس سے غافل | حشر برپا ہو کہ فتنہ آٹھے آیا کیا ہو
خاک حسرت زدگاں پر تو گزر بی وسواس | ان ستم کشتوں سے اب عرضِ تمنا کیا ہو
گر بہشت آوے تو آنکھوں میں مری پھیکی لگے | جن نے دیکھا ہو تجھے محوِ تماشا کیا ہو
شوق جاتا ہی ہمیں یار کے کوچے کو لئے | جائے معلوم ہو کیا جانیے اُس جا کیا ہو
ایک رونا ہی نہیں آہ و غم و نالہ و درد | ہجر میں زندگی کرنیکے تئیں کیا کیا ہو

خاک میں لوٹوں کہ لوہو میں نہاؤں میں میر
یار مستغنی ہی اُس کو مری پروا کیا ہو

ویسا کہاں ہی ہم سے جیسا کہ آگے تھا تو | اوروں سے مل کے پیارے کچھ اور ہو گیا تو
چالیں تمام بیڈھب باتیں فریب ہیں سب | حاصل کہ ای شکر لب اب وہ نہیں رہا تو
جاتے نہیں اٹھائے یہ شور ہر سحر کے | یا اب چمن میں بلبل ہم ہی رہیں گے یا تو
آ ابر ایک دو دم آپس میں رکھیں صحبت | کڑھنے کو ہوں میں آندھی رونے کو ہی بلا تو
تقریب پر بھی تو تو پہلو تہی کرے ہے | دس بار عید آئی کب کب گلے ملا تو
تیرے دہن سے اُس کو نسبت ہو کچھ تو کہئے | گل گو کرے ہی دعوی خاطر میں کچھ نہ لا تو
دل کیونکہ راست آوے دعوائے آشنائی | دریائے حسن وہ مہ کشتی بکف گدا تو
ہر فرد یاس ابھی سی دفتر ہی تجھ گلے کا | ہی قہر جبکہ ہو گا حرفوں سے آشنا تو
عالم ہی شوق کشتہ خلقت ہی تیری رفتہ | جانوں کی آرزو تو آنکھوں کا مدعا تو
منھ کرئے جس طرف کو سو ہی تری طرف ہی | پر کچھ نہیں ہی پیدا کیدھر ہی اے خدا تو
آتی بخود نہیں ہے بادِ بہار اب تک | دو گام تھا چمن میں ٹک ناز سے چلا تو
کم میری اور آنا کم آنکھ کا ملانا | کرنے سے یہ ادائیں ہی مدعا کہ جا تو
گفت و شنود اکثر میری تری رہے ہی | ظالم معاف رکھیو میرا کہا سُنا تو

کہہ سا تجھ کے موئے کو ای میر روئیں کب تک
جیسے چراغِ مفلس اک دم میں جل بجھا تو

خوبی یہی نہیں ہے کہ انداز و ناز ہو | معشوق کا ہی حسن اگر دل نواز ہو
سجدہ کا کیا مضائقہ محرابِ تیغ میں | پر یہ تو ہو کہ نعش پہ میری نماز ہو

ایسے تو حال کے کہنے سے بھلی خاموشی
کہیئے اُس سے جو کوئی اپنا کہا رکھتا ہو
کیا کرے وصل سے مایوس دلِ آزردہ جو
زخم ہی یار کا چھاتی سی لگا رکھتا ہو
کب تلک اُس کے اسیرانِ بلا خانہ خراب
قطعہ ظلم کی تازہ جو ہر روز بنا رکھتا ہو
ایک دم کھولکے زلفوں کی کمندوں کو تئیں
مدتوں تک دلِ عاشق کو لگا رکھتا ہو
گل ہو، مہتاب ہو، آئینہ ہو، خورشید ہو، میر
اپنا محبوب وہی ہے جو ادا رکھتا ہو

مت پوچھو کچھ اپنی باتیں کہیے تو تم کو ندامت ہو
قد قامت یہ کچھ ہے تمھارا لیکن قہر قیامت ہو
ربطِ اخلاص ای دیدہ و دل بھی دُنیا میں ایک سے ہوتا ہی
لگ پڑتے ہو جس سے تس سے تم بھی کوئی ملامت ہو
آج سحر ہوتے ہی کچھ خورشید ترے منہ آن چڑھا
روک سکے ہے کون اُسے سر جس کے ایسی شامت ہو
چاہ کا دعویٰ سب کرتے ہیں مانئے کیونکر بے آثار
اشک کی سرخی، زردی منھ کی عشق کی کچھ تو علامت ہو
سرو و گل اچھے ہیں دونوں رونق ہیں گلزار کی لیک
چاہیئے رُو اُس کا سا رُو ہو، قامت ویسا قامت ہو
مل بیٹھے اُس نائی کے سے کوئی گھڑی جو زاہد تو
جتنے بال ہیں سارے سر میں ویسے ہی اُسکی حجامت ہو
ہو جو ارادہ یھاں رہنے کا رہ سکیئے تو رہیئے آپ
ہم تو چلے جاتے ہیں ہر دم کس کو قصدِ اقامت ہو
کس مدت سے دُوری میں تیری خاکِ رہ سے برابر ہوں
کریے رنجہ قدم ٹک مجھ تک جو کچھ پاسِ قدامت ہو
منھ پر اُس کی تیغِ ستم کے سیدھا جانا ٹھہرا ہے
جینا پھر کچھ دار و مدار اِس طور میں ہو ٹک یا مت ہو
شور و شغب کو راتوں کے ہمسایے تمھارے کیا رو دیں
ایسے فتنے کتنے اٹھیں گے میر جی تم جو سلامت ہو

ہم سے تو تم کو ضد سی پڑی ہے خواہ نخواہ رُلاتے ہو
آنکھ اُٹھا کر جب دیکھے ہیں اوروں میں ہنستے جاتے ہو

جب ملنے کا سوال کروں ہوں زلف و رُخ دکھلاتے ہو
برسوں مجھ کو یوں ہی گزرے صبح و شام بتاتے ہو

بکھری رہی ہیں مُنہ پر زلفیں آنکھ نہیں کھل سکتی ہے
کیونکہ چھپے میخواری شب جب ایسے رات کے ماتے ہو

سرو تہ و بالا ہوتا ہے' در ہم بر ہم شاخِ گل
ناز سے قد کش ہو کے چمن میں ایک بلا تم لاتے ہو

صبح سے یہاں پھر جان و دل پر روزِ قیامت رہتی ہے
رات کبھو آ رہتے ہو تو یہ دن ہم کو دکھلاتے ہو

جن نے تم کو نہ دیکھا ہووے اُس سے آنکھیں مار دو تم
ایک نگاہِ مفت کر تم سو سو فتنے اُٹھاتے ہو

چشم تو ہے اک دید کی جا' پر کب تکلیف کے لائق ہے
دل جو ہے دلچسپ مکاں تم اس میں کب کب آتے ہو

راحت پہنچی ٹک تم سے تو رنج اُٹھایا برسوں تک
سہلاتے ہو جو کبھو تو بھیجا بھی کھا جاتے ہو

ہو کے گدائے کوئے محبت زور صدا یہ نکالی ہے
اب تو میر جی راتوں کو تم ہر در پر چلّاتے ہو

وہی جانے جو حیا کشتہ و فا رکھتا ہو
اور رُسوائی کا اندیشہ جدا رکھتا ہو

کام لے یار سے جو جذبِ رسا رکھتا ہو
یا کوئی آئنہ سا دستِ دُعا رکھتا ہو

عشق کو نفع نہ بیتابی کرے ہے نہ شکیب
کرے تدبیر کہ جو درد دوا رکھتا ہو

میں نے آئینہ صفت دَر نہ کیا بند غرض
اُسکو مشکل ہے جو آنکھوں میں حیا رکھتا ہو

ہائے اِس زخمیِ شمشیرِ محبت کا جگر
درد کو اپنے جو ناچار چھپا رکھتا ہو

اُس سے تشبیہ تو دیتے ہیں پہ ناشاعر لیک
سیب کچھ اُس ذقن آگے جو مزا رکھتا ہو

آدے ہے پہلے قدم سر ہی کا جانا درپیش
دیکھتا ہو جو رہِ عشق میں پا رکھتا ہو

دل صاف ہو تو جلوہ گہِ یار کیوں نہ ہو / آئینہ ہو تو قابلِ دیدار کیوں نہ ہو
عالم تمام اُس کا گرفتار کیوں نہ ہو / وہ ناز پیشہ ایک ہے عیار کیوں نہ ہو
مستغنیانہ تو جو کرے پہلے ہی سلوک / عاشق کو فکرِ عاقبت کار کیوں نہ ہو
رحمت غضب میں نسبتِ برق و سحاب ہے / جس کو شعور ہو تو گنہگار کیوں نہ ہو
دشمن تو اک طرف کہ سبب رشک کا ہے یہاں / در کا شگاف رخنۂ دیوار کیوں نہ ہو
آیاتِ حق ہیں سارے یہ ذراتِ کائنات / انکار تجھ کو ہووے سو اقرار کیوں نہ ہو
ہر دم کی تازہ مرگِ جدائی سے تنگ ہوں / ہونا جو کچھ ہو آہ سو یکبار کیوں نہ ہو
موئے سفید ہم کو کہے ہے کہ غافلاں / اب صبح ہونے آئی ہے بیدار کیوں نہ ہو

نزدیک اپنے ہم نے تو سب کر رکھا ہے سہل
پھر میر اس میں مردنِ دشوار کیوں نہ ہو

عاشق ہوئے تو گو غمِ بسیار کیوں نہ ہو / ناسورِ چشم ہو مژہ خونبار کیوں نہ ہو
کامل ہو اشتیاق تو اتنا نہیں ہے دور / حشر دگر یہ وعدۂ دیدار کیوں نہ ہو
گلگشت کا بھی لطف دلِ خوش سے ہے نسیم / پیشِ نظر وگرنہ چمن زار کیوں نہ ہو
مخصوص دل ہے کیا مرضِ عشق جاں گداز / اے کاش اُس کو اور کچھ آزار کیوں نہ ہو
آوے جو کوئی آئینہ بازار دہر میں / بارے متاعِ دل کا خریدار کیوں نہ ہو
مقصود دردِ دل ہے نہ اسلام ہے نہ کفر / پھر ہر گلے میں سبحہ و زنار کیوں نہ ہو
شاید کہ آوے پرسشِ احوال کو کبھو / عاشق بھلا سا ہووے تو بیمار کیوں نہ ہو

تلوار کے تلے بھی ہیں آنکھیں تری اُدھر
تو اس ستم کا میر سزاوار کیوں نہ ہو

ایسا ہے ماہ، گو کہ وہ سب نور کیوں نہ ہو / ویسا ہی پھول فرض کیا حور کیوں نہ ہو
کھویا ہمارے ہاتھ سے آئینہ نے اُسے / ایسا جو پاوے آپ کو مغرور کیوں نہ ہو
حق بر طرف ہے منکرِ دیدار یار کے / جو شخص ہووے آنکھوں سے معذور کیوں نہ ہو
گیسوئے مشکبو کو اسے ضد ہے کھولنا / پھر زخم دل فگاروں کا ناسور کیوں نہ ہو
صورت تو تیری صفحۂ خاطر پہ نقش ہے / ظاہر میں اب ہزار تو مستور کیوں نہ ہو
صافی شست سے ہے غرض مشق تیر سے / سینہ کسو کا خانۂ زنبور کیوں نہ ہو

شیخ جی آؤ مصلیٰ گروِ جام کرو ۔ جنسِ تقویٰ کے تئیں صرفِ مے خام کرو[1]

فرشِ مستاں کرو سجادۂ بے تہ کے تئیں ۔ مے کی تعظیم کرو شیشہ کا اکرام کرو

دامنِ پاک کو آلودہ رکھو بادے سے ۔ آپ کو مغبچوں کے قابلِ دشنام کرو

نیکنامی و تفاوت کو دعا جلد کہو ۔ دین و دل پیشکشِ سادۂ خودکام کرو

ننگِ ناموس سے اب گزرو جوانوں کی طرح ۔ پرفشانی کرو اور ساقی سے ابرام کرو

خوب اگر جرعۂ مے نوش نہیں کرسکتے ۔ خاطر جمع مے شام سے یہ کام کرو

اٹھ کھڑے ہو جو جھکے گردن مینائے شراب ۔ خدمتِ بادہ گساراں ہی سرانجام کرو

مطرب آکر جو کرے چنگ نوازی تو تم ۔ پیرہن مستوں کی تقلید سے انعام کرو

خنکی اتنی بھی تو لازم نہیں اس موسم میں ۔ پاس جوشِ گل و دل گرمیٔ ایام کرو

سایۂ گل میں لبِ جو پہ گلابی رکھو ۔ ہاتھ میں جام کو لو آپ کو بدنام کرو

آہ تا چند رہو خانقہ و مسجد میں ۔ ایک تو صبح گلستان میں بھی شام کرو

رات تو ساری گئی سنتے پریشاں گوئی[2]

میر جی کوئی گھڑی تم بھی تو آرام کرو

کون کہتا ہے نہ غیروں پہ تم امداد کرو[3] ۔ ہم فراموش ہوؤں کو بھی کبھو یاد کرو

ہیں یہاں مجھ سے وفا پیشہ نہ بیداد کرو ۔ نہ کرو ایسا کہ پھر میرے تئیں یاد کرو

ایسے ہم پیشہ کہاں ہوتے ہیں اے غمزدگاں ۔ مرگِ مجنوں پہ کڑھو ماتمِ فرہاد کرو

اے اسیرانِ تہِ دام نہ تڑپو اتنا ۔ تا نہ بدنام کہیں چنگلِ صیاد کرو

گو کہ حیرانیٔ دیدار ہی اے آہ و سرشک ۔ کوئی روشن کرو آنکھیں کوئی دلشاد کرو

کیا ہوا ہے ابھی تو ہستی ہی کو بھولے ہو ۔ آخرکار محبت کو ٹک اک یاد کرو

اول عشق ہی میں میر جی تم رونے لگے

خاک ابھی منھ کو ملو نالہ و فریاد کرو

---

[1] اس شعر کے قوافی میں ایطائے جلی ہے۔ مگر قدیم سے قدیم نسخوں میں بھی اسی طرح ملتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ تصحیح سے سہواً رہ گیا ہو اور مصرع ثانی میں بجائے جام خام ہو۔ واللہ اعلم۔

[2] سودا دہلوی ۔ سودا تری فریاد سے آنکھوں میں کٹی رات ؛ ہونے کو سحر آئی ہے ظالم کہیں مر بھی

[3] مرزا غالبؔ دہلوی ۔ تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو ؛ مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

جو آنسو آویں تو پی جا کہ تا رہے پردہ
بلا ہے چشمِ تر افشائے راز کرنے کو

سمندِ ناز سے تیرے بہت ہے عرصہ تنگ
تنک تو ترک کر اس ترکتاز کرنے کو

بسان زر ہے مرا جسمِ زار سارا زرد
اثر تمام ہے دل کے گداز کرنے کو

ہنوز لڑکے ہو تم قدر میری کیا جانو
شعور چاہیئے ہے امتیاز کرنے کو

اگرچہ گل بھی نمود اس کے رنگ کرتا ہے
ولیک چاہیئے ہے منھ بھی ناز کرنے کو

زیادہ حد سے تھی تابوتِ میر پر کثرت
ہوا نہ وقتِ مساعد نماز کرنے کو

کرتے بیاں جو ہوتے خریدار ایک دو
دیکھا کریں ہیں ساتھ ترے یار ایک دو

قیدِ حیات قید کوئی سخت ہے کہ روز
مر رہتے ہیں گے اس کے گرفتار ایک دو

کس کس پہ اس کو ہووے نظر یاں ہر ایک شب
جی دیں ہیں اس کی چشم کے بیمار ایک دو

تو تو دوچار ہو کے گیا کب کا یاں ہنوز
گزریں ہیں اپنی جان سے ناچار ایک دو

ابروئے تیغ زن کی تمھارے تو کیا چلی
گرتے ہیں جس کا لاگتے ہی وار ایک دو

ٹک چشم میں بھی سرمہ کا دنبالہ کھینچیے
اس مست کے بھی ہاتھ میں تلوار ایک دو

کیا کیا عزیز دوست ملے میر خاک میں
کچھ اس گلی میں ہم ہی نہیں خوار ایک دو

حالِ دلِ میر کا اے اہلِ وفا مت پوچھو
اس ستم کشتہ پہ جو گزری جفا مت پوچھو

صبح سے اور بھی پاتا ہوں اسے شام کو تند
کام کرتی ہے جو کچھ میری دعا مت پوچھو

استخواں توڑی مری اس کی گلی کے سگ نے
جس خرابی سے میں واں اتر رہا مت پوچھو

ہوش و صبر و خرد و دین و حواس و دل و تاب
اس کے اک آنے میں کیا کیا نہ گیا مت پوچھو

اشتعالک کی محبت نے کہ در بست پھنکا
شہرِ دل کیا کہوں کس طور جلا مت پوچھو

وقتِ قتل آرزوئے دل جو لگے پوچھنے لوگ
میں اشارت کی ادھر ان نے کہا مت پوچھو

خواہ مارا انھیں نے میر کو خواہ آپ موا
جانے دو یارو جو ہونا تھا ہوا مت پوچھو

نالۂ شب نے کیا ہے جو اثر مت پوچھو
ٹکڑے ٹکڑے ہوا جاتا ہے جگر مت پوچھو

پوچھتے کیا ہو مرے دل کا تم احوال کہ ہے
جیسے بیمار اجل روز بتر مت پوچھو

مجنوں جو دشت گرد تھا ہم شہر گرد ہیں
آوارگی ہماری بھی مذکور کیوں نہ ہو

تلوار کھینچتا ہے وہ اکثر نشے کے بیچ
زخمی جو اُس کے ہاتھ کا ہو چور کیوں نہ ہو

خالی نہیں غزل کوئی دیوان سے مرے
افسانہ عشق کا ہے یہ مشہور کیوں نہ ہو

مجھ کو تو یہ قبول ہوا عشق میں کہ میرؔ
پاس اُس کے جب گیا تو کہا "دُور کیوں نہ ہو"

ہر دم وہ شوخ دست بہ شمشیر کیوں نہ ہو
کچھ ہم نے کی ہے ایسی ہی تقصیر کیوں نہ ہو

اب تو جگر کو ہم نے بلا کا ہدف کیا
انداز اس نگاہ کا پھر تیر کیوں نہ ہو

جاتا تو ہے کہیں کو تو اے کاروانِ مصر
کنعاں ہی کی طرف کو یہ شبگیر کیوں نہ ہو

حیراں ہیں اس قدر کہ اگر اب کی جائیے
پھر مُنھ ترا نہ دیکھئے تصویر کیوں نہ ہو

تو نے تو رفتہ رفتہ کیا ہم کو ننگِ خلق
وحشت دلا کہاں تئیں زنجیر کیوں نہ ہو

جوں گل کسو شگفتہ طبیعت کا ہے نشاں
غنچہ بھی کوئی خاطرِ دلگیر کیوں نہ ہو

ہووے ہزار وحشت اُسے تو بھی یار ہے
اغیار تیرے ساتھ جو ہوں میرؔ کیوں نہ ہو

دیکھتا ہوں دھوپ ہی میں جلنے کے آثار کو
لیگئی ہیں دور تڑپیں سایۂ دیوار کو

بابِ صحت ہے وگرنہ کون کہتا ہے طبیب
جلد اُٹھاؤ میرے دروازہ سے اس بیمار کو

وے جو مستِ بیخودی ہیں عیش کرتے ہیں مدام
میکدے میں دہر کے مشکل ہے ٹک ہشیار کو

نقشِ شیریں یادگارِ کوہ کن ہے اس میں خوب
ورنہ کیا ہے بیستوں دیکھا ہے میں کہسار کو

کس قدر اُلجھیں ہیں میرے تارِ دامن کی کہ اب
پانوں میں گڑ کر نہیں چھٹنے کی فرصت خار کو

ہے غبار میرؔ اُس کی رہگزر میں اک طرف
کیا ہوا دامن کشاں آتے بھی یہاں تک یار کو

جو میں نہ ہوں تو کرو ترک ناز کرنے کو
کوئی تو چاہیئے جی بھی نیاز کرنے کو

نہ دیکھو غنچۂ نرگس کی اور کھلتے میں
جو دیکھو اُس کی مژہ نیم باز کرنے کو

نہ سوئے نیند بھر اس تنگنا میں تا نہ موئے
کہ آہ جا نہ تھی پا کے دراز کرنے کو

جو بیدماغی یہی ہے تو بن چکی اپنی
دماغ چاہیئے ہر اک سے ساز کرنے کو

وہ گرم ناز ہو تو خلق پر ترحم کر
پکارے آپ اجل احتراز کرنے کو

اب تو نقاب منہ پہ لے ظالم کہ شب ہوئی
شرمندہ سارے دن تو کیا آفتاب کو

کہنے لگے میر اور بھی ہوتا ہے مضطرب
سمجھاؤں کب تک اس دلِ خانہ خراب کو

کیا ہے گر بدنامی و حالت تباہی بھی نہ ہو
عشق کیسا جس میں اتنی روسیاہی بھی نہ ہو

لطف کیا آزردہ ہو کر آپ سے ملنے کے بیچ
ٹک تری جانب سے جب تک عذر خواہی بھی نہ ہو

چاہتا ہے جی کہ ہم تو ایک جا تنہا ملیں
ناز بیجا بھی نہ ہووے کم نگاہی بھی نہ ہو

مجمع ترکاں ہے کوئی دیکھیو جا کر کہیں
جس کا میں کشتہ ہوں اس میں وہ سپاہی بھی نہ ہو

ناز برداری تری کرتے تھے ایک امید پر
راستی ہم سے نہیں تو کج کلاہی بھی نہ ہو

یہ دعا کی تھی بچھے کن نے کہ بہرِ قتلِ میر
محضرِ خوں پہ ترے اک گواہی بھی نہو

اُجرت میں نامہ کی ہم دیتے ہیں جاں تلک تو
اب کارِ شوق اپنا پہنچا ہے یہاں تلک تو

آغشتہ میرے خوں سے ای کاش جا کے پہنچے
کوئی پرِ شکستہ ٹک گلستاں تلک تو

واماندگی نے مارا اثنائے رہ میں ہم کو
معلوم ہے پہنچنا اب کارواں تلک تو

افسانۂ غم کا لب تک آیا ہے مدتوں میں
سو جائیو نہ پیارے اس داستاں تلک تو

آوارہ خاک میری ہو کس قدر الٰہی
پہنچوں غبار ہو کر میں آسماں تلک تو

ای کاش خاک ہی ہم ہوتے کہ میر اسمیں
ہوتی ہمیں رسائی اُس آستاں تلک تو

ردیف ہائے ہوز

سو ظلم کے رہتے ہیں سزاوار ہمیشہ
ہم بیگنہ اُس کے ہیں گنہگار ہمیشہ

ایک آن اگر گزر جائے تو کہنے میں کچھ آوے
درپیش ہے یہاں مردن دشوار ہمیشہ

دشمن کو نہ کیوں شربتِ مدام آوے میسر
رہتی ہے اودھر ہی نگہِ یار ہمیشہ

یوسف سے کئی آن کے تیرے سرِ بازار
بک جاتے ہیں باتوں میں خریدار ہمیشہ

ہے دامنِ گلچینِ چمن جیب ہمارا
دنیا میں رہے دیدۂ خونبار ہمیشہ

جو بن ترے دیکھے ہو سوا دوزخ میں ہے یعنی
رہتی ہے اسے حسرتِ دیدار ہمیشہ

جیتا ہے تو بیطاقتی و بیخودی ہے میر
مردہ ہے غرض عشق کا بازار ہمیشہ

مرنے میں بند زباں ہونا اشارت ہے ندیم — یعنی ہے دُور کا درپیش سفر مت پوچھو
کیا پھرے وہ وطن آوارہ گیا اب سو ہی — دلِ گم کردہ کی کچھ خیر خبر مت پوچھو
لذتِ زہرِ غمِ فرقتِ دلداراں سے — ہو دے منہ میں جنھوں کے شہد و شکر مت پوچھو
دل خراشی و جگر چاکی و سینہ کاوی — اپنے ناحق میں ہیں سب اور ہنر مت پوچھو

جوں توں کر حال دل اکبار تو میں عرض کیا
میر صاحب جی بس اب بار دگر مت پوچھو

اس کی طرزِ نگاہ مت پوچھو — جی ہی جانے ہے آہ مت پوچھو
کہیں پہنچو گے بے رہی میں بھی — گم رہاں یوں یہ راہ مت پوچھو
نو گرفتارِ دامِ زلف اُس کا — ہے یہی روسیاہ مت پوچھو
ہیں گی برگشتہ دے صفِ مژگاں — پھر گئی ہے سپاہ مت پوچھو
تھا کرم پر اُسی کے شرب مدام — قطعہ — میرے اعمال آہ مت پوچھو
تم بھی اے مالکانِ روزِ جزا — بخشدو اب گناہ مت پوچھو

میر عاشق کو کچھ کہے ہی بنے
خواہ وہ پوچھو خواہ مت پوچھو

محرماں بیدمی کا میری سبب مت پوچھو — ایک دم چھوڑ دو یوں ہی مجھے اب مت پوچھو
گریۂ شمع کا اے ہمنفساں میں تھا حریف — گزری ہے رات کی صحبت بھی عجب مت پوچھو
سر پر شور سے میرے نہ کرو کوئی سوال — حشر تھی داخلِ خدامِ ادب مت پوچھو
لب پہ شیون مژہ پر خون و نگہ میں اک یاس — دن گیا ہجر کا جس ڈھنگ سے شب مت پوچھو

میر صاحب نئی یہ طرز ہو اس کی تو کہوں
موجب آزردگی کا وجہ غضب مت پوچھو

فرصت نہیں تنک بھی کہیں اضطراب کو — کیا آفت آ گئی مرے اس دل کی تاب کو
میری ہی چشمِ تر کی کرامات ہے یہ سب — بھرتا تھا ورنہ ابر تو محتاج آب کو
گزری ہے شب خیال میں خوباں کے جاگتے — آنکھیں لگا کے اُن سے میں ترسوں ہوں خواب کو
خط آ گیا پر اُس کا تغافل نہ کم ہوا — قاصد مرا خراب پھرے ہے جواب کو
تیور میں جب سے دیکھے ہیں ساقی خمار کے — پیتا ہوں رکھ کے آنکھوں پہ جامِ شراب کو

درمیاں حلقۂ مستاں کے شب اٹکی جا تھی — دور ساغر ہیں مگر پیر مغاں ہے شیشہ

قطعہ

جا کے پوچھا جو میں یہ کارگہ مینا میں — دل کی صورت کا بھی اے شیشہ گراں ہے شیشہ

کہنے لگے کہ کدھر پھرتا ہے بہکا اے مست — ہر طرح کا جو تو دیکھے ہے کہ یہاں ہے شیشہ

دل ہی سارے تھے یہ اک وقت میں جو کر کے گداز — شکل شیشہ کی بنائی ہے کہاں ہے شیشہ

جھک گیا دیکھ کے میں میر اُسے مجلس میں — چشم بد دور طرحدار جواں ہے شیشہ

جی چاہے مل کسو سے یا سب سے تو جدا رہ — پر ہو سکے تو پیارے ٹک دل کا آشنا رہ

گل بے تکلفی میں لطف اُس بدن کا دیکھا — نکلا نہ کر قبا سے اے گل بس اب ڈھپا رہ

عاشق غیور جی دے اور اُس طرف نہ دیکھے — وہ آنکھ جو چھپا دے تو تو بھی ٹک کھنچا رہ

پہنچیں گے آگے دیکھیں کس درجہ کو ابھی تو — اُس ماہ چاردہ کا سن دس ہے یا کہ بارہ

کھینچا کرے ہے ہر دم کیا تیغ بلہوس پر — اس ناسزا کے خوں کے اتنا نہ سر چڑھا رہ

مستظہر محبت تھا کوہکن وگرنہ — یہ بوجھ کس سے اٹھتا ایک اور ایک گیارہ

ہر مشت خاک یہاں کی جا ہے اک تامل — بن سوچے راہ مت چل ہر گام پر کھڑا رہ

شاید کہ سربلندی ہووے نصیب تیرے — جوں گرد راہ سب کے پاؤں سے تو لگا رہ

اُس خط سبز نے کچھ رویت نہ رکھی تیری — کیا ایسی زندگانی جا خضر زہر کھا رہ

حد سے زیادہ واعظ یہ کودنا اچھلنا — کاہے کو جاتے ہیں ہم اے خرس اب بندھا رہ

میں تو ہیں وہم دونوں کیا ہے خیال تجھکو — جھاڑ آستین مجھ سے ہاتھ آپ سے اُٹھا رہ

جیسے خیال مفلس جاتا ہے تنلو جگہ تو — مجھ بینوا کے بھی گھر ایک آدھ رات آ رہ

دوڑے بہت ولیکن مطلب کو کون پہنچا — آئندہ تو بھی ہمسا ہو کر شکستہ پا رہ

جب ہوش میں تو آیا اودھر ہی جاتے پایا — اس سے تو میر چندے اُس کوچے ہی میں جا رہ

اب حال اپنا اُس کے ہے دل خواہ — کیا پوچھتے ہو الحمد للہ

مر جاؤ کوئی پروا نہیں ہے — کتنا ہے مغرور اللہ اللہ

پیر مغاں سے بے اعتقادی — استغفر اللہ استغفر اللہ

کہتے ہیں اُس کے تو منہ لگیگا — ہو یوں ہی یا رب جوں ہے یہ افواہ

جگر تو ہو کو ترسے ہی میں سچ کہتا ہوں دل خستہ
دلیل اسکی نمایاں ہی مری آنکھیں ہیں خوں بستہ
چمن میں دل خراش آواز آتی ہی چلی شاید
پسِ دیوارِ گلشن نالہ کش ہی کوئی پر بستہ
ترے کوچے میں یکسر عاشقوں کے خار مژگاں ہیں
جو تو گھر سے کبھو نکلے تو رکھیو پاؤں آہستہ
مرے آگے نہیں ہنستا تو واک صلح کرتا ہوں
بھلا میں روؤں دو دریا تبسم کر تو یک پستہ
تعجب ہی مجھے یہ سرو کو آزاد کہتے ہیں
سراپا دل کی صورت جس کی ہو وہ کیا ہو وارستہ
تری گلگشت کی خاطر بنا ہی باغ داغوں سے
پرِ طاؤس سینہ ہی تمامی دستِ گلدستہ
بجا ہی گر فلک پر فخر سے پھینکے کلاہ اپنی
کہے جو اس زمیں میں میرؔ یک مصرع برجستہ

ہم ہیں مجروح ماجرا ہے یہ
وہ نمک چھڑکے ہی مزا ہے یہ
آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم
اب جو ہیں خاک انتہا ہے یہ
بودِ آدم نمودِ شبنم ہے
ایک دو دم میں پھر ہوا ہے یہ
شکر اُس کی جفا کا ہو نہ سکا
دل سے اپنے ہمیں گلا ہے یہ
شور سے اپنے حشر ہے پردہ
یوں نہیں جانتا کہ کیا ہے یہ
بس ہوا ناز ہو چکا اغماض
ہر گھڑی ہم سے کیا ادا ہے یہ
نعشیں اُٹھتی ہیں آج یار کی
آن بیٹھو تو خوش نما ہے یہ
دیکھ بیدم مجھے لگا کہنے
ہی تو مردہ سا پر بلا ہے یہ
میں تو چپ ہوں وہ ہونٹھ چاٹے ہی
کیا کہوں ریجھنے کی جا ہے یہ
ہے رے بیگانگی کبھو اُن نے
نہ کہا یہ کہ آشنا ہے یہ
تیغ پر ہاتھ دمبدم کب تک
اک لگا چک کہ مدعا ہے یہ
میرؔ کو کیوں نہ مغتنم جانے
اگلے لوگوں میں اک رہا ہی یہ

دلِ پُر خوں ہے یہاں تجھ کو گماں ہی شیشہ
شیخ کیوں مست ہوا ہی تو کہاں ہی شیشہ
شیشہ بازی تو تنک دیکھنے آ آنکھوں کی
ہر پلک پر مری اشکوں سی رواں ہی شیشہ
رو سفیدی ہے نقاب رخِ شورِ مستی
ریش قاضی کے سب پنبہ دہاں ہی شیشہ
منزلِ ہستی کو پہنچے ہے انھیں سے عالم
نشہ مے بلد و سنگ نشاں ہی شیشہ

کہتے ہیں اُڑ بھی گئے جل کے پر پروانہ
کچھ سنی سوختگاں تم خبر پروانہ

سعی اتنی یہ ضروری ہی اٹھی بزم سُلگ
اے جگر تفتگی بے اثر پروانہ

کس گنہ کا ہی پس از مرگ یہ عذر جانسوز
پانوں پہ شمع کے پالتے ہیں سر پروانہ

آ پڑا آگ میں ای شمع نہیں سہی تو سمجھ
کس قدر داغ ہوا تھا جگر پروانہ

بزم دنیا کی تو دلسوزی سنی ہوگی میر
کس طرح شام ہوئی یہاں سحر پروانہ

ہم سے کچھ آگے زمانے میں ہوا کیا کیا کچھ
تو بھی ہم غافلوں نے آکے کیا کیا کیا کچھ

دل جگر جان یہ بھسمنت ہوئے سینے میں
گھر کو آتش دی محبت نے جلا کیا کیا کچھ

کیا کہوں تجھ سے کہ کیا دیکھا ہی تجھ میں میں نے
عشوہ و غمزہ و انداز و ادا کیا کیا کچھ

دل گیا، ہوش گیا، صبر گیا، جی بھی گیا
شغل میں غم کے ترے ہم سے گیا کیا کیا کچھ

آہ مت پوچھ ستمگار کہ تجھ سے تھی ہمیں
چشم لطف و کرم و مہر و وفا کیا کیا کچھ

قطعہ

نام ہیں خستہ و آوارہ و بدنام مرے
ایک عالم نے غرض مجھ کو کہا کیا کیا کچھ

طرفہ صحبت ہی کہ سنتا نہیں تو ایک مری
واسطے تیرے سُنا میں نے سنا کیا کیا کچھ

حسرت وصل و غم ہجر و خیالِ رُخِ دوست
مر گیا میں پہ مرے جی میں رہا کیا کیا کچھ

دردِ دل، زخمِ جگر، کلفتِ غم، داغِ فراق
آہ عالم سے مرے ساتھ چلا کیا کیا کچھ

چشم نمناک و دل پُر جگر صد پارہ
دولتِ عشق سے ہم پاس بھی تھا کیا کیا کچھ

تجھ کو کیا بننے بگڑنے سے زمانے کی کہ یہاں
خاک کن کن کی ہوئی صرف بنا کیا کیا کچھ

قطعہ

قبلہ و کعبہ خداوند و ملاذ و مشفق
مضطرب ہو کے اُسے میں نے لکھا کیا کیا کچھ

پر کہوں کیا رقمِ شوق کی اپنی تاثیر
ہر سر حرف پہ وہ کہنے لگا کیا کیا کچھ

ایک محروم چلے میر ہمیں عالم سے
ورنہ عالم کو زمانے نے دیا کیا کیا کچھ

کیا موافق ہو دوا عشق کے بیمار کے ساتھ
جی ہی جاتے نظر آئے ہیں اس آزار کے ساتھ

رات مجلس میں تری ہم بھی کھڑے تھے چپکے
جیسے تصویر لگا دے کوئی دیوار کے ساتھ

مر گئے پر بھی کھلی رہ گئیں آنکھیں اپنی
کون اس طرح موا حسرت دیدار کے ساتھ

شوق کا کام کھنچا دور کہ اب مہر مثال
چشم مشتاق لگی جاے ہے طومار کے ساتھ

حضرت سے اُسکے جانا کہاں ہے
اب مر رہیگا یہاں بندہ درگاہ

سب عقل کھوے ہے راہِ محبت
ہو خضر دل میں کیسا ہی گمراہ

مجرم ہوئے ہم دل دیکے ورنہ
کسکو کسو سے ہوتی نہیں چاہ

کیا کیا نہ رکھیں تم نے بچائیں
اچھا رجھایا اے مہربان آہ

گزرے ہے دیکھیں کیونکر ہماری
اس بے وفا سے نے رسم نے راہ

قطعہ
تھی خواہش دل رکھنا حمائل
گردن میں اُسکی ہر گاہ و بیگاہ

اس پر کہ تھا وہ شہ رگ سے اقرب
ہرگز نہ پہنچا یہ دست کوتاہ

قطعہ
ہے ما سوا کیا جو میر کہیے
آگاہ ساری اُس سے ہیں آگاہ

جلوے ہیں اُس کے شانیں ہیں اُسکی
کیا روز کیا خور کیا رات کیا ماہ

ظاہر کہ باطن اوّل کہ آخر
اللہ اللہ اللہ اللہ

جو ہوشیار ہو سو آج ہو شراب زدہ
زمین میکدہ یکدست ہے گی آب زدہ

بنے یہ کیونکہ ملی تو ہی یا ہمیں سمجھیں
ہم اضطراب زدہ اور تو حجاب زدہ

کرے ہے جس کو ملامت جہاں وہ میں ہی ہوں
اجل رسیدہ جفا دیدہ، اضطراب زدہ

جدا ہو رخ سے تری زلف میں کیوں دل جائے
پناہ لیتے ہیں سایہ کی آفتاب زدہ

لگا نہ ایک بھی میر اُس کی بیت ابرو کو
اگرچہ شعر تھے سب میرے انتخاب زدہ

جز جرم عشق کوئی بھی ثابت کیا گناہ
ناحق ہماری جان لی اچھے ہو واہ واہ

اب کیسا چاک چاک ہو دل اُس کے ہجر میں
گھتواں تو لخت دل سے نکلتی ہے میری آہ

شام شب وصال ہوئی یہاں کہ اُس طرف
ہونے لگا طلوع ہی خورشید رو سیاہ

گزرا ایکس اس سلوک سے دیکھا نکر مجھے
برچھی سی لاگ جا ہی جگر میں تری نگاہ

بیتابیوں کو سونپ نہ دینا کہیں مجھے
اے صبر میں نے آن کے لی ہے تری پناہ

خوں بستہ بارے رہنے لگی اب تو یہ مژہ
آنسو کی بوند جس سے ٹپکتی تھی گاہ گاہ

ناحق اُلجھ پڑا ہے یہ مجھ سے طریق عشق
جاتا تھا میر میں تو چلا اپنی راہ راہ

آخر ہماری خاک بھی برباد ہو گئی
اُس کی ہوا میں ہم پہ تو بیداد ہو گئی

مدت ہوئی نہ خط ہے نہ پیغام ہے مگر
اک رسم تھی وفا کی بر افتاد ہو گئی

دل کس قدر شکستہ ہوا تھا کہ رات میر
آئی جو بات لب پہ سو فریاد ہو گئی

یہ چشم آئنہ دار رو تھی کسو کی
نظر اس طرف بھی کبھو تھی کسو کی

سحر پائے گل[۱] بیخودی ہم کو آئی
کہ اس سست پیماں میں بو تھی کسو کی

یہ سرگشتہ جب تک رہا اس چمن میں
برنگ صبا جستجو تھی کسو کی

نہ ٹھہری ٹک اک جان برلب رسیدہ
ہمیں مدعا گفتگو تھی کسو کی

جلایا شب اک شعلۂ دل نے ہم کو
کہ اُس تند سرکش میں خو تھی کسو کی

نہ تھی تجھ سے نازک میانان گلشن
بہت تو کمر جیسے مو تھی کسو کی

دم مرگ دشوار دی جان اُن نے
مگر میر کو آرزو تھی کسو کی

ہے غزل میر یہ شفائی کی
ہم نے بھی طبع آزمائی کی

اُس کے ایفائے عہد تک نہ جیے
عمر نے ہم سے بے وفائی کی

وصل کے دن کی آرزو ہی رہی
شب نہ آخر ہوئی جدائی کی

اسی تقریب اُس گلی میں رہے
منتیں ہیں شکستہ پائی کی

دل میں اُس شوخ کے نہ کی تاثیر
آہ نے آہ نارسائی کی

کاسۂ چشم لے کے جوں نرگس
ہم نے دیدار کی گدائی کی

زور و زر کچھ نہ تھا تو باری میر
کس بھروسے پہ آشنائی کی

آہ میری زبان پہ آئی
یہ بلا آسمان پر آئی

عالم جاں سے تو نہیں آیا
ایک آفت جہان پر آئی

پیری آفت ہے پھر نہ تھا گویا
یہ بلا جس جوان پر آئی

ہم بھی حاضر ہیں کھینچیے شمشیر
طبع گر امتحان پر آئی

آتش رنگ گل سے کیا کہیے
برق تھی آشیان پر آئی

[۱] بوے یار من ازیں سست وفا مے آید — گلم از دست بگیرید کہ از کار شدم۔ نظیری

راہ اُس شوخ کی عاشق سے نہیں رک سکتی
جان جاتی ہے چلی خوبیٔ رفتار کے ساتھ

وے دن اب سالتے ہیں راتوں کو برسوں گزرے
جن دنوں دیر رہا کرتے تھے ہم یار کے ساتھ

ذکرِ گل کیا ہے صبا، اب کہ خزاں میں ہم نے
دل کو ناچار لگایا ہے خس و خار کے ساتھ

کس کو ہر دم ہے لہو رونے کا ہجراں میں دماغ
دل کو اک ربط سا ہے دیدۂ خونبار کے ساتھ

میری اُس شوخ سے صحبت ہے بعینہ ویسی
جیسے بن جائے کسو سادے کو عیّار کے ساتھ

دیکھیے کس کو شہادت سے سرافراز کریں
لاگ تو سب کو ہے اُس شوخ کی تلوار کے ساتھ

بیکلی اُس کی نہ ظاہر تھی جو تو اے بلبل
دم کشِ میرؔ ہوئی اُس لبِ گفتار کے ساتھ

ردیف یائے تحتانی

دل کو تسکین نہیں اشکِ دمادم سے بھی
اس زمانے میں گئی ہے برکت غم سے بھی

ہمنشیں کیا کہوں اس رشکِ مہِ تاباں بن
صبح عید اپنی ہے بدتر شبِ ماتم سے بھی

کاش اے جانِ المناک نکل جاوے تو
اب تو دیکھا نہیں جاتا یہ ستم ہم سے بھی

آخرِ کار محبت میں نہ نکلا کچھ کام
سینہ چاک و دلِ پژمردہ مژہ نم سے بھی

آہ ہر غیر سے تا چند کہوں جی کی بات
عشق کا راز تو کہتے نہیں محرم سے بھی

دوری کوچہ میں اے غیرتِ فردوس تری
کام گزرا ہے مرا گریۂ آدم سے بھی

ہمت اپنی ہی تھی یہ میرؔ کہ جوں مرغِ خیال
اک پرافشانی میں گزرے سرِ عالم سے بھی

تاب دل صرفِ جدائی ہو چکی
یعنی طاقت آزمائی ہو چکی

چھوٹتا کب ہے اسیرِ خوش زباں
جیتے جی اپنی رہائی ہو چکی

آگے ہو مسجد کے نکلی اسکی راہ
شیخ سے اب پارسائی ہو چکی

درمیاں ایسا نہیں اب آئینہ
میری اسکی اب صفائی ہو چکی

ایک بوسہ مانگتے لڑنے لگے
اتنے ہی میں آشنائی ہو چکی

بیچ میں ہم ہی نہ ہوں تو لطف کیا
رحم کر اب بے وفائی ہو چکی

آج پھر تھا بے حمیت میرؔ واں
کل لڑائی سی لڑائی ہو چکی

گھٹا شمع ساں کیوں بجھاؤں چلا
کوئی رہنے والی ہے جانِ عزیز
تپ غم جگر کو مرے کھا گئی
گئی گر نہ امروز فردا گئی

گئے دست و پا گم جو میر آگیا
وفا پیشہ مجلس اُسے پا گئی

یکسو کشادہ روئی پر چیں نہیں جبیں بھی
ہم چھوڑی مہر اُس کی کاش اُسکو ہووے کیں بھی
آنسو تو تیرے دامن پونچھے ہے وقت گریہ
ہم نے نہ رکھی منہ پر اے ابر آستیں بھی
کرتا نہیں عبث تو پارہ گلو فغاں سے
گزرے ہے پار دل کے اک نالۂ حزیں بھی
ہوں احتضار میں میں آئینہ رو شتاب آ
جاتا ہے ورنہ غافل پھر دم تو واپسیں بھی
سینے سے تیر اُس کا جی کو تو لیتا نکلا
پر ساتھوں ساتھ اُس کے نکلی اک آفریں بھی
ہر شب تری گلی میں عالم کی جان جا ہے
آگے ہوا ہے اب تک ایسا ستم کہیں بھی
شوخی جلوہ اُس کی تسکین کیونکہ بخشے
آئینوں میں دلوں کے جو ہے بھی پھر نہیں بھی
گیسو ہی کچھ نہیں ہے سنبل کی آفت اُس کا
ہیں برق خرمن گل رخسار آتشیں بھی
تکلیفِ نالہ مت کر اے دردِ دل کہ ہونگے
رنجیدہ راہ چلتے آزردہ ہمنشیں بھی
کس کس کا داغ دیکھیں یا رب غمِ بتاں میں
رخصت طلب ہے جاں بھی ایمان اور دیں بھی

زیر فلک جہاں تک آسودہ میر ہوتے
ایسا نظر نہ آیا اک قطعۂ زمیں بھی

گئی چھاؤں اُس تیغ کی سر سے جب کی
جلے دھوپ میں یہاں تلک ہم کہ تب کی
پڑی خرمن گل پہ بجلی سی آخر
مرے خوش نگہ کی نگاہ اک غضب کی
کوئی بات نکلے ہے دشوار منہ سے
ٹک اک تو بھی تو سن کسی جاں بلب کی
تو شملا جو رکھتا ہے خر ہے وگرنہ
ضرورت ہے کیا شیخ دم اک وجب کی
یکایک بھی آ سر پہ واماندگاں کے
بہت دیکھتے ہیں تری راہ کب کی
دماغ و جگر دل مخالف ہوئے ہیں
ہوئی متفق اب اُدھر رائے سب کی
تجھے کیونکے ڈھونڈھوں کہ سوتے ہی گذری
تری راہ میں اپنے پائے طلب کی
دل عرش سے گذرے ہے ضعف میں بھی
یہ زور آوری دیکھو زاری شب کی
عجب کچھ ہے گر میر آوے میسر
گلابی شراب اور غزل اپنے ڈھب کی

طاقتِ دل برنگِ نکہتِ گل
پھیر اپنے مکان پر آئی

ہو جہاں میر اور غم اُس کا
جس سے عالم کی جان پر آئی

بات شکوہ کی ہم نے گاہ نہ کی
بلکہ دی جان اور آہ نہ کی

گل و آئینہ ماہ و خور کن نے
چشم اُس چہرہ پر سیاہ نہ کی

کعبے سو بار وہ گیا تو کیا
جس نے یہاں اک دل میں راہ نہ کی

واہ اے عشق اس ستمگر نے
جانفشانی پہ میری واہ نہ کی

جس سے تھی چشم ہم کو کیا کیا میر
اس طرف اُن نے اک نگاہ نہ کی

کل میر نے کیا کیا کی مے کیلئے بیتابی
آخر کو گرو رکھا سجادۂ محرابی

جاگا ہے کہیں وہ بھی شب مرتکبِ مے ہو
یہ بات سُجھاتی ہے اُن آنکھوں کی بیخوابی

کیا شہر میں گنجائش مجھ بے سر و پا کو ہو
اب بڑھ گئی ہیں میری اسباب بکم اسبابی

دن رات مری چھاتی جلتی ہے محبت میں
کیا اور نہ تھی جاگہ یہ آگ جو یہاں دابی

سو ملک پھرا لیکن پائی نہ دفا اک جا
جی کھا گئی ہے میرا اس جنس کی نایابی

خوں بستہ نہ کیوں پلکیں ہر لحظہ رہیں میری
جاتے نہیں آنکھوں سے لب یار کے عنابی

جنگل ہی ہرے تنہا رونے سے نہیں میرے
کوہوں کی کمر تک بھی جا پہنچی ہے سیرابی

تھے ماہ وشاں کل جو ان کوٹھوں پہ جلوے میں
ہے خاک سے آج اُن کی ہر صحن میں مہتابی

کل میر جو یہاں آیا طور اُس کا بہت بھایا
وہ خشک لبی تس پر جامہ گلے میں آبی

ہمیں آمدِ میر کل بھا گئی
طرح اُس میں مجنوں کی سب پا گئی

کہاں کا غبار آہ دل میں یہ تھا
مری خاک بدلی سی سب چھا گئی

کیا پاسِ بلبل خزاں نے نہ کچھ
گل و برگ بے درد پھیلا گئی

ہوئی سامنے یوں تو ایک ایک کے
ہمیں سے وہ کچھ آنکھ شرما گئی

جگر منہ تک آتے نہیں بولتے
غرض ہم بھی کرتے ہیں کیا کیا گئی

نہ ہمرہ کوئی نہ کسی سے گیا
مری لاش تا گور تنہا گئی

سحر گہ میں نے پوچھا گل سے حالِ زارِ بلبل کا
پڑے تھے باغ میں یک مشت پر اودھر اشارت کی

جلایا جس تجلی جلوہ گر نے طور کو ہمدم
اُسی آتش کے پر کالے نے ہم سے بھی شرارت کی

نزاکت کیا کہوں خورشید رو کی کل شبِ مہ میں
گیا تھا سایہ سا یہ باغ تک تس پر حرارت کی

ترے کوچے کے شوق طوف میں جیسے بگولا تھا
بیاباں میں غبارِ میرؔ کی ہم نے زیارت کی

میں نے جو بیکسانہ مجلس میں جان کھوئی
سر پر مرے کھڑی ہو شب شمع زور روئی

آتی ہے شمع شب کو آگے ترے یہ کہکر
منہ کی گئی جو لوئی تو کیا کرے گا کوئی

بیطاقتی سے آگے کچھ پوچھتا بھی تھا سو
رونے نے ہر گھڑی کے وہ بات ہی ڈبوئی

بلبل کی بیکلی نے شب بے دماغ رکھا
سونے دیا نہ ہم کو ظالم نہ آپ سوئی

اُس ظلم پیشہ کی یہ رسمِ قدیم ہے گی
غیروں پہ مہربانی یاروں سے کینہ جوئی

نوبت جو ہم سے گاہے آتی ہے گفتگو کی
منہ میں زباں نہیں ہے اُس بدزباں کی گوئی

اس مہ کے جلوے سے کچھ تا میرؔ یاد دیوے
اب کی گھروں میں ہم نے سب چاندنی ہے بوئی

الم سے یہاں تئیں میں مشقِ ناتوانی کی
کہ میری جان نے تن پر مرے گرانی کی

چمن کا نام سنا تھا و لے نہ دیکھا ہائے
جہاں میں ہم نے قفس ہی میں زندگانی کی[۵]

ملائی خوب مری خوں میں خاک بسمل گاہ
یہ تھوڑی منتیں ہیں مجھ پہ سخت جانی کی

پتنگ ہوں میں ترے اختلاط سے پیری
قسم ہے اپنی مجھے اُس گئی جوانی کی

چلا ہے کھینچنے تصویر میرے بت کی آج
خدا کے واسطے صورت تو دیکھو مانی کی

تری گلی کے ہر اک سگ نے استخواں توڑے
ہماری لاش کی شب خوب پاسبانی کی

رکھے ہیں میرؔ ترے منہ سے بیوفا خاطر
تری جفا کے تغافل کی بدگمانی کی

لاعلاجی ہے جو رہی ہے مجھے آوارگی
کیجے کیا میرؔ صاحب بندگی بیچارگی

کیسی کیسی صحبتیں آنکھوں کے آگے سے گئیں
دیکھتے ہی دیکھتے کیا ہو گیا یکبارگی

روئے گل پر روز و شب کس شوق سے رہتا ہے باغ
رخنہ دیوار ہے یا دیدۂ نظارگی

---

۵ زندگانی کرنا۔ فارسی کے محاورہ زندگانی کردن کا ترجمہ ہو یعنی زندگی گزارنا

کیسے قدم سے اسکی گلی میں صبا گئی
یوں پھونک کر کے خاک مری سب اڑا گئی

کچھ تھی طپش جگر کی تو بارے مزاج داں
پر دل کی بیقراری مری جان کھا گئی

کس پاس جا کے بیٹھوں خرابی میں اب میں ہائے
مجنوں کو موت کیسی شتابی میں آ گئی

کون اس ہوا میں زخمی نہیں میری آہ کا
بجلی رہی تھی سو بھی تو سینہ دکھا گئی

سودا جو اسکے سر سے گیا زلف یار کا
تو تو بڑی ہی میر کے سر سے بلا گئی

خبر نہ تھی تجھے کیا میرے دل کی طاقت کی
نگاہ چشم اُدھر تو نے کی قیامت کی

انھوں میں جو کہ ترے محو سجدہ رہتے ہیں
نہیں ہے قدر ہزاروں برس کی طاعت کی

اٹھائی ننگ سمجھ تم نے بات کے کہتے
وفا و مہر جو تھی رسم ایک مدت کی

رکھیں امید رہائی اسیر کاکل و زلف
مری تو باتیں ہیں زنجیر حرف الفت کی

رہے ہے کوئی خرابات چھوڑ مسجد میں
ہوا منائی اگر شیخ نے کرامت کی

سوال میں نے جو انجام زندگی سے کیا
قد خمیدہ نے سوے زمیں اشارت کی

نہ میری قدر کی اس سنگدل نے میر کبھو
ہزار حیف کہ پتھر سے میں محبت کی

فکر ہے ماہ کے جو شہر بدر کرنے کی
ہے سزا تجھ پہ یہ گستاخ نظر کرنے کی

کہہ حدیث آنے کی اسکے جو کیا شادی مرگ
نامہ بر کیا چلی تھی ہم کو خبر کرنے کی

کیا جلی جاتی ہے خوبی ہی میں اپنی اے شمع
کہہ پتنگے کی بھی کچھ شام و سحر کرنے کی

ابکی برسات ہی کے ذمہ تھا دامن کا وبال
میں تو کھائی تھی قسم چشم کے تر کرنے کی

پھول کچھ لیتے نہ نکلے تھے دل صد پارہ
طرز سیکھی ہے مری ٹکڑے جگر کرنے کی

ان دنوں نکلے ہے آغشتہ بخوں راتوں کو
دھن ہے نالہ کو کسو دل میں اثر کرنے کی

عشق میں تیرے گزرتی نہیں بن سر پٹکے
صورت اک یہ رہی ہے عمر بسر کرنے کی

کاردانی ہے جہاں عمر عزیز اپنی میر
رہ ہے درپیش سدا اسکو سفر کرنے کی

خرابی کچھ نہ پوچھو ملکت دل کی عمارت کی
غموں نے آجکل سنیو وہ آبادی ہی غارت کی

نگاہ مست سے جب چشم نے اسکی اشارت کی
حلاوت مے کی اور بنیاد مے خانہ کی غارت کی

نہ کھنچے تجھ سے ایک جا نقاش — اُس کی تصویر وہ ہی ہر جائی
سر رکھوں اُس کے پاؤں پر لیکن — دستِ قدرت یہ میں کہاں پائی

میر جب سے گیا ہے دل تب سے
میں تو کچھ ہو گیا ہوں سودائی

تو گلے ملتا نہیں ہم سے تو کیسی خرمی — عید آئی یہاں ہمارے بر میں جامہ ماتمی
جی بھرا رہتا ہے اب آٹھوں پہر مانندِ ابر — سیکڑوں طوفاں بغل میں ہے یہ مژگاں ماتمی
حشر کو زیر و زبر ہوگا جہاں سچ ہے ولے — ہے قیامت شیخ جی اس کارگہ کی برہمی
تجھ سوا محبوب آتش طبع اے ساقی نہیں — ہو پرستاروں میں تیری گر پری ہو آدمی
سامنے ہو جائیں ای ظالم تو دونوں ہیں برے — وہ دمِ شمشیر تیرا یہ ہماری بیدمی
اُس قیامت جلوہ سے بہتیرے ہم سے جی اُٹھیں — مر گئے تو مر گئے ہم اُسکے کیا ہوگی کمی

کچھ پریشانی سے ہے سنبل کی جو الجھے ہے گا میر
یک جہاں برہم کرے زلفوں کی اُسکی درہمی

اب ضعف سے ڈھتا ہے بیتابی شتابی کی — اس دل کے تڑپنے نے کیا خانہ خرابی کی
ان درس گھوں میں وہ آیا نہ نظر ہم کو — کیا نقل کروں خوبی اس چہرہ کتابی کی
بھنتے ہیں دل اک جانب سکتے ہیں جگر یکسو — ہے مجلس مشتاقاں دُکان کبابی کی
تلخ اُس بتِ میگوں سے سب سنتے ہیں کس خاطر — تہ دار نہیں ہوتی گفتار شرابی کی
یک بوکشیٔ بلبل ہے موجب صد مستی — پُر زور ہے کیا دارو غنچہ کی گلابی کی
اب سوزِ محبت سے سارے جو پھپھولے ہیں — ہے شکل مرے دل کی سب شیشہ حبابی کی

پژمردہ مرے منہ سے یہاں حرف نہیں نکلا
جو بات کریں لنے کی سو میر حسابی کی

تجھ سا بیتاب ہووے جب کوئی — بیقراری کو جانے تب کوئی
ہاں خدا مغفرت کرے اُس کو — صبر مرحوم تھا عجب کوئی
جان دے گو مسیح پر اس سے — بات کہتے ہیں تیری لب کوئی
بعد میرے ہی ہو گیا سنسان — سونے پایا تھا ورنہ کب کوئی
اُس کے کوچہ میں حشر تھی مجھ تک — آہ و نالہ کرے نہ اب کوئی

اشکِ خونیں آنکھ میں بھر لاکے پی جاتا ہوں میں
محتسب کہتا ہے مجھ پر تہمتِ میخوارگی

مت فریبِ سادگی کھا ان سیہ چشموں کا میر
ان کی آنکھوں سے ٹپکتی ہے بڑی عیارگی

گیسو سے اس کے میں نے کیوں آنکھ جا لگائی
جو اپنے اچھے جی کو ایسی بلا لگائی

تھا دل جو پکا پھوڑا بسیاری الم سے
دکھتا گیا دو چنداں جوں جوں دوا لگائی

ذوقِ جراحت اس کا کس کو نہیں ہے لیکن
بخت سکے جھکے ان نے تیغِ جفا لگائی

دم بھی نہ لینے پایا پانی بھی پھر نہ مانگا
جس تشنہ لب کو ان نے تلوار آ لگائی

تھا صیدِ ناتواں میں لیکن لہو سے میرے
پانوں پہ ان نے اپنے بھر کر حنا لگائی

بالعکس آج اس کے سارے سلوک دیکھے
کیا جانوں دشمنوں نے کل اس سے کیا لگائی

جو آنسو پی گیا میں آخر کو میر ان نے
چھاتی جلا جگر میں اک آگ جا لگائی

دو دن سے کچھ بنی تھی سو پھر شب بگڑ گئی
صحبت ہماری یار سے بیڈھب بگڑ گئی

واشد کچھ آگے آہ سی ہوتی تھی دل کے تئیں
اقلیم عاشقی کی ہوا اب بگڑ گئی

گرمی نے دل کی ہجر میں اس کے جلا دیا
شاید کہ احتیاط سے یہ تب بگڑ گئی

خط نے نکل کے نقش دلوں کے اٹھا دیئے
صورت بتوں کی اچھی جو تھی سب بگڑ گئی

باہم سلوک تھا تو اٹھاتے تھے نرم گرم
کاہے کو میر کوئی دبے جب بگڑ گئی

کچھ موج ہوا پیچاں اے میر نظر آئی
شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی

دلی کے نہ تھے کوچے اوراقِ مصور تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

مغرور بہت تھے ہم آنسو کی سرایت پر
سو صبح کے ہونے کو تاثیر نظر آئی

گل بار کرے ہیگا اسبابِ سفر شاید
غنچہ کی طرح بلبل دلگیر نظر آئی

اس کی تو دل آزاری بے ہیچ ہی تھی یارو
کچھ تم کو ہماری بھی تقصیر نظر آئی

ہو گئی شہر شہر رسوائی
اے مری موت تو بھلی آئی

یک بیاباں برنگِ صوتِ جرس
مجھ پہ ہے بیکسی و تنہائی

کیوں نہ ہوں خستہ بھلا میں کہ ستم کے تیرے
تیر ہیں پار کئی وار ہیں سوفار کئی

اپنے کوچے میں نکلیو تو سنبھالے دامن
یادگارِ مژہ میرؔ ہیں واں خار کئی

میری پرسش پہ تری طبع اگر آوے گی
صورتِ حال تجھے آپھی نظر آوے گی

محو اُس کا نہیں ایسا کہ جو چیتے گا شتاب
اُس کے بیخود کی بہت دیر خبر آوے گی

کتنے پیغامِ چمن کو ہیں سو دل میں ہیں گرہ
کسو دن ہم تئیں بھی بادِ سحر آوے گی

ابر مت گورِ غریباں پہ برس غافل آہ
ان دل آزردوں کے جی میں بھی لہر آوے گی

میرؔ میں جیتوں میں آؤں گا اُسی دن جس دن
دل نہ تڑپے گا مرا چشم نہ بھر آوے گی

کیا کروں شرح خستہ جانی کی
میں نے مر مر کے زندگانی کی

حال بد گفتنی نہیں میرا
تم نے پوچھا تو مہربانی کی

سب کو جانا ہے یوں تو پر اے صبر
آتی ہے اک تری جوانی کی

تشنہ لب مر گئے ترے عاشق
نہ ملی ایک بوند پانی کی

بیت بحثی سمجھ کے کر بلبل
دھوم ہے میری خوش زبانی کی

جس سے کھوئی تھی نیند میرؔ نے کل
ابتدا پھر وہی کہانی کی

ہے یہ بازارِ جنوں منڈی ہے دیوانوں کی
یہاں دکانیں ہیں کئی چاک گریبانوں کی

کیونکہ کہیے کہ اثر گریۂ مجنوں کو نہ تھا
گرد نمناک ہے اب تک بھی بیابانوں کی

یہ بگولہ تو نہیں دشت محبت میں سے
جمع ہو خاک اُڑی کتنی پریشانوں کی

خانقہ کا تو نہ کر قصد ٹک اے خانہ خراب
یہی اک رہ گئی ہے بستی مسلمانوں کی

سیل اشکوں سے بہے، صرصر آہوں سے اُڑے
مجھ سے کیا کیا نہ خرابی ہوئی ویرانوں کی

دل و دیں کیسے کہ اُس رہزن دلہا سے اب
یہ پڑی ہے کہ خدا خیر کرے جانوں کی

کتنے دل سوختہ ہم جمع ہیں اے غیرتِ شمع
کر قدم رنجہ کہ مجلس ہے یہ پروانوں کی

سرگزشتیں نہ مری سن کہ اُچٹتی ہے نیند
خاصیت یہ ہے مری جان ان افسانوں کی

میکدے سے تو ابھی آیا ہے مسجد میں میرؔ
ہو نہ لغزش کہیں مجلس ہے یہ بیگانوں کی

کہ تلفظ طرب کا سنکے کہے　قطعہ　شخص ہوگا کہیں طرب کوئی

اور محزوں بھی ہم سنے تھے ولے
میر سا ہوسکے ہے کب کوئی

آگے ہمارے عہد سے وحشت کو جا نہ تھی　دیوانگی کسو کی بھی زنجیرِ پا نہ تھی
بیگانہ سا لگے ہے چمن اب خزاں میں ہائے　ایسی گئی بہار مگر آشنا نہ تھی
کب تھا یہ شورِ نوحہ ترا عشق جب نہ تھا　دل تھا ہمارا آگے تو ماتم سرا نہ تھی
وہ اور کوئی ہوگی سحر جب ہوئی قبول　شرمندۂ اثر تو ہماری دعا نہ تھی
آگے بھی تیرے عشق سے کھینچے تھے دردو رنج　لیکن ہماری جان پر ایسی بلا نہ تھی
دیکھے دیارِ حسن کے میں کارواں بہت　لیکن کسو کے پاس متاعِ[1] وفا نہ تھی
آئی پری سی پردۂ مینا سے جام تک　آنکھوں میں تیری دخترِ رز کیا حیا نہ تھی
اس وقت سے کیا ہے مجھے تو چراغِ وقف　مخلوق جب جہاں میں نسیم و صبا نہ تھی

پژمردہ اس قدر ہیں کہ ہے شبہہ ہم کو میر
تن میں ہمارے جان کبھو تھی بھی یا نہ تھی

چھن گیا سینہ بھی کلیجا بھی　یار کے تیر جان لیجا بھی
کیوں تری موت آئی ہے گی عزیز　سامنے سے مرے ارے جا بھی
حال کہہ چپ ہوا تو میں بولا　کس کا قصہ تھا ہاں کہے جا بھی
کہنے لاگا نہ واہی بک اتنا　قطعہ　کیوں ہوا ہے سڑی ارے جا بھی

میں کہا میر جاں بلب ہے شوخ
تو نے کوئی خبر کو بھیجا بھی

گرم ہیں شور سے تجھ حسن کے بازار کئی　رشک سے جلتے ہیں یوسفؑ کے خریدار کئی
کب تلک داغ دکھاویگی اسیری مجھ کو　مر گئے ساتھ کے میرے تو گرفتار کئی
وے ہی چالاکیاں ہاتھوں کی ہیں جو اول تھیں　اب گریباں میں مرے رہ گئے ہیں تار کئی
خوفِ تنہائی نہیں کر تو جہاں سے تو سفر　ہر جگہ راہِ عدم میں ملیں گے یار کئی
اضطراب و قلق و ضعف میں کس طور جیوں　جان واحد ہے مری اور ہیں آزار کئی

[1] بعض شعرا نے متاع کو مذکر بھی لکھا ہے۔

دیوانگی کہاں کہ گریباں سے تنگ ہوں
گردن مری ہے طوق میں گویا کہ پھنس رہی

جوں صبح اس چمن میں نہ ہم کھل کے ہنس سکے
فرصت رہی جو میرؔ بھی سو اک نفس رہی

آجکل بیقرار ہیں ہم بھی
بیٹھ جا چلنے ہار ہیں ہم بھی

آن میں کچھ ہیں آن میں کچھ ہیں
تحفۂ روزگار ہیں ہم بھی

منع گریہ نہ کر تو اے ناصح
اس میں بے اختیار ہیں ہم بھی

در پئے جان ہے قراول مرگ
کسو کے تو شکار ہیں ہم بھی

نالے کر تو سمجھ کے اے بلبل
باغ میں اک کنار ہیں ہم بھی

مدعی کو شراب ہم کو زہر
عاقبت دوستدار ہیں ہم بھی

گر ز خود رفتہ ہیں تری نزدیک
اپنے تو یادگار ہیں ہم بھی

میرؔ نام اک جواں سنا ہوگا
اسی عاشق کے یار ہیں ہم بھی

غفلت میں گئی آہ مری ساری جوانی
اے عمر گزشتہ میں تری قدر نہ جانی

تھی آبلۂ دل سے ہمیں تشنگی میں چشم
پھوٹا تو نہ آیا نظر اک بوند بھی پانی

مدت سے ہیں اک مشت پر آوارہ چمن میں
نکلی ہے یہ کس کی ہوس بال فشانی

بھاتی ہے مجھے اک طلب بوسہ میں یہ آن
لکنت سے الجھ جا کے اُسے بات نہ آنی

یہ جان اگر بید مولہ کہیں دیکھے
باقی ہے کسو موئے پریشاں کی نشانی

دیکھیں تو سہی کب تئیں نبھتی ہے یہ صحبت
ہم جی سے ترے دست ہیں تو دشمن جانی

مجنوں بھی نہ رسوائے جہاں ہوتا نہ وہ آپ
مکتب میں جو کم آتی یہ لیلیٰ تھی دوانی

قطعہ

اک شخص مجھی سا تھا کہ وہ تجھ پہ تھا عاشق
وہ اُس کی وفا پیشگی وہ اُس کی جوانی

یہ کہہ کے جو رویا تو لگا کہنے نہ کہہ میرؔ
سنتا نہیں میں ظلم رسیدوں کی کہانی

تل بارے ہم سے اُس سے ملاقات ہوگئی
دو دو بچن کے ہونے میں اک بات ہوگئی

لن کن مصیبتوں سے ہوئی صبح شام ہجر
سو زلفیں ہی بناتے اُسے رات ہوگئی

گردش نگاہ مست کی موقوف ساقیا
مسجد تو شیخ جی کی خرابات ہوگئی

ملا غیر سے جا جفا کیا نکالی
او کٹ لیکے آخر ادا کیا نکالی

طبیبوں نے تجویز کی مرگِ عاشق
مناسب مرض کی دوا کیا نکالی

نہیں اُس گزرگہ سے آتی اِدھر اب
نئی راہ کوئی صبا کیا نکالی

دلا اُسکے گیسو سے کیوں لگ چلا تو
یہ اک اپنے جی کی بلا کیا نکالی

رجھا ہی دیا واہ رے قدر دانی
وفا کی ہماری جزا کیا نکالی

دمِ صبح جوں آفتاب آج ظالم
نکلتے ہی تیغِ جفا کیا نکالی

لگے دربدر میر چلانے پھرنے
گدا تو ہوئے پر صدا کیا نکالی

رہی نہ گفتہ مرے دل میں داستاں میری
نہ اس دیار میں سمجھا کوئی زباں میری

برنگِ صوتِ جرس تجھ سے دور ہوں تنہا
خبر نہیں ہے تجھے آہ کارواں میری

ترے نہ آج کے آنے میں صبح کے مجھ پاس
ہزار جائے گئی طبعِ بدگماں میری

وہ نقشِ پائے ہوں میں مٹ گیا ہو جو رہ میں
نہ کچھ خبر ہے نہ سدھ ہے کچھ رہرواں میری

شب اُس کے کوچہ میں جاتا ہوں اس توقع پر
کہ ایک دوست ہے واں خوابِ پاسباں میری

اسی سے دور رہا اصل مدعا جو تھا
گئی یہ عمرِ عزیز آہ رائگاں میری

ترے فراق میں جیسے خیالِ مفلس[1] کا
گئی ہے فکرِ پریشاں کہاں کہاں میری

رہا میں درپسِ دیوارِ باغ مدت لیک
گئی گلوں کے نہ کانوں تلک فغاں میری

ہوا ہوں گریۂ خونیں کا جب سے دامنگیر
نہ آستین ہوئی پاک دوستاں میری

دیا دکھائی مجھے تو اسی کا جلوہ میر
پڑی جہان میں جا کر نظر جہاں میری

اب کے بھی سیرِ باغ کی جی میں ہوس رہی
اپنی جگہ بہار میں کنجِ قفس رہی

میں پا شکستہ جا نہ سکا قافلے تلک
آتی اگرچہ دیر صدائے جرس رہی

لطفِ قبائے تنگ پہ گل کا بجا ہے ناز
دیکھی نہیں ہے اُن نے تری چولی چس رہی

دن رات میری آنکھوں سے آنسو چلے گئے
برسات اب کے شہر میں ساری برس رہی

خالی شگفتگی سے جراحت نہیں کوئی
ہر زخم یاں ہے جیسے کلی ہو بکس رہی

[1] خیالِ مفلس کی ایک اور تشبیہ۔ میر سے صفحہ ۱۲۷ سطر ۱۸۔

اب دل کو آہ کرنی ہی صبح و مسا لگی
پژمردہ اس کلی کے تئیں بھی ہوا لگی

کیونکر بجھاؤں آتشِ سوزانِ عشق کو
اب تو یہ آگ دل سے جگر کو بھی جا لگی

دل کو گئے ہی یہاں سے بنی اب کہ ہر سحر
کوچہ میں تیرے زلف کے آنے صبا لگی

بیتابی و شکیب و سفر حاصلِ کلام
اس دل مریضِ غم کو نہ کوئی دوا لگی

ڈر مجھ نفس سے غیر کہ بھر جی ہی سے گیا
دل کو کسو ستم زدہ کی بد دعا لگی

لگ جائے چپ تجھ کو تو تو کہیو عندلیب
گر بیکلی نے کی ہمیں تکلیف نا لگی

کشتہ کا اُس کے زخم نہ ظاہر ہوا کہ میر
کس جائے اُس شہید کے تیغِ جفا لگی

کس حسن سے کہوں میں اُسکی خوش اختری کی
اس ماہرو کے آگے کیا تاب مشتری کی

رکھنا نہ تھا قدم یہاں جوں باد بے تامل
سیر اس جہاں کی رہرو پر تو نے سرسری کی

شبہا بحالِ سگ میں اک عمر صرف کی ہے
مت پوچھ اُن نے مجھ سے جو آدمی گری کی

پائے گل اُس چمن میں چھوڑا گیا نہ ہم سے
سر پر ہمارے ابکی منت ہے بے پری کی

پیشہ تو ایک ہی تھا اُس کا ہمارا لیکن
مجنوں کے طالعوں نے شہرت میں یاوری کی

گریہ سے داغِ سینہ تازہ ہوئے ہیں سارے
یہ کشتِ خشک تو نے اے چشم پھر ہری کی

یہ دور تو موافق ہوتا نہیں مگر اب
رکھیے بنائے تازہ اس چرخِ چنبری کی

خوباں تمھاری خوبی تا چند نقل کریے
ہم ریختہ خاطروں کی کیا خوب دلبری کی

ہم سے جو میر اڑ کر افلاک چرخ میں ہیں
ان خاک میں ملوں کی کاہیکو ہمسری تھی

دیکھ تو دل کہ جاں سے اُٹھتا ہے
یہ دھواں سا کہاں سے اُٹھتا ہے

گور کس دل جلے کی ہے یہ فلک
شعلہ اک صبح یہاں سے اُٹھتا ہے

خانۂ دل سے زینہار نہ جا
کوئی ایسے مکاں سے اُٹھتا ہے

نالہ سر کھینچتا ہے جب میرا
شور اک آسماں سے اُٹھتا ہے

لڑتی ہے اُس کی چشمِ شوخ جہاں
ایک آشوب واں سے اُٹھتا ہے

طالع شہرت رسوائی مجنوں عجب است۔ ورنہ طشت من و او ہر دو زیک بام افتاد ۱۲ واللہ اعلم - آسی

ظلم سے کہ اسکی جزا بس شتاب ہے
آیا عمل میں یہاں کہ مکافات ہو گئی

رشید سا پیالۂ مے بے طلب دیا
پیر مغاں سے رات کرامات ہو گئی

نا خلاف وعدہ ہوا ہوگا وہ کہ یہاں
نومیدی و اُمید مساوات ہو گئی

شیخ گفتگوئے پریشاں پہ تو نہ جا
مستی میں اب تو قبلۂ حاجات ہو گئی

لے شہر سے نکل کے مرا گریہ سیر کر
گویا کہ کوہ و دشت پہ برسات ہو گئی

اپنے تو ہونٹھ بھی نہ ہلے اُس کے روبرو
رنجش کی وجہ میر وہ کیا بات ہو گئی

بغیر دل کہ یہ قیمت ہے سارے عالم کی
کسو سے کام نہیں رکھتی جنس آدم کی

کوئی ہو محرم شوخی ترا تو میں پوچھوں
کہ بزم عیش جہاں کیا سمجھ کے برہم کی

ہمیں تو باغ کی تکلیف سے معاف رکھو
کہ سیر و گشت نہیں رسم اہل ماتم کی

تنک تو لطف سے کچھ کہہ کہ جاں بلب ہوں میں
رہی ہے بات مری جان بلب کوئی دم کی

گزرنے کو تو کج و دلکج اپنی گزری ہے
جفا جو ان نے بہت کی تو کچھ وفا کم کی

گھرے ہیں درد و الم میں فراق کے ایسے
کہ صبح عید بھی یہاں شام ہے محرم کی

قفس میں میر نہیں جوشِ داغ سینے پر
ہوس نکالی ہے ہم نے بھی گل کے موسم کی

غم سے یہ راہ میں نے نکالی نجات کی
سجدہ اس آستاں کا کیا پھر وفات کی

نسبت تو دیتے ہیں ترے لب سے پر ایک دن
ناموس یوں ہی جائیگی آب حیات کی

صد حرف زیر خاک تہ دل چلے گئے
مہلت نہ دی اجل نے ہمیں ایک بات کی

ہم تو ہی اس زمانے میں حیرت سے چپ نہیں
اب بات جا چکی ہے سبھی کائنات کی

پژمردہ اس کلی کے تئیں وا شدن ہے کیا
آہ سحر نے دل پہ عبث التفات کی

حور و پری فرشتہ بشر ہار ہی رکھا
دزدیدہ تیرے دیکھنے نے جن پہ گھات کی

اس لب شکر کے ہیں گے جہاں فوالقہ شناس
اس جا دعا پہنچتی نہیں ہے نبات کی

عرصہ ہے تنگ چال نکلتی نہیں ہے اور
جو چال پڑتی ہے سو وہ بازی ہے مات کی

برقع اٹھا تھا یار کے منہ سے سو میر کل
سنتے ہیں آفتاب نے جوں توں کی رات کی

۱۔ غم فراق میں تکلیف سیر باغ نہ دو ۔ مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا   مرزا غالب

کب سے نظر لگی تھی دروازۂ حرم سے
پردہ اٹھا تو لڑیاں آنکھیں ہماری ہم سے

صورت گرِ اجل کا کیا ہاتھ تھا سکے تو
کھینچے وہ تیغ ابرو فولاد کے قلم سے

سوزش گئی نہ دل کی رونے سے روز و شب کے
جلتا ہوں اور دریا بہتے ہیں چشم نم سے

طاعت کا وقت گزرا مستی میں آب رز کی
اب چشم داشت اس کے یہاں ہے فقط کرم سے

کڑھیے نہ روئیے تو اوقات کیونکہ گزرے
رہتا ہے مشغلہ سا بارے غم و الم سے

مشہور ہے سماجت میری کہ تیغ برسی
پر میں نہ سر اٹھایا ہرگز ترے قدم سے

بات احتیاط سے کر ضائع نہ کر نفس کو
بالیدگیِ دل ہے مانند شیشہ دم سے

کیا کیا تعب اٹھائے کیا کیا عذاب دیکھے
تب دل ہوا ہے اتنا خوگر ترے ستم سے

ہستی میں ہم نے آکر آسودگی نہ دیکھی
کھلتی نہ کاش آنکھیں خواب خوش عدم سے

پامال کر کے ہم کو پچھتاؤ گے بہت تم
کمیاب ہیں جہاں میں سر دینے والے ہم سے

دل دو ہو میر صاحب اس بدمعاش کو تم
خاطر تو جمع کر لو ٹک قول سے قسم سے

رہا ہونا نہیں امکان ان ترکیب والوں سے
کہ بل دے باندھتے ہیں پیچ پگڑی کے بھی بالوں سے

تجھے نسبت جو دیتے ہیں شرار و برق و شعلہ سے
تسلی کرتے ہیں ناچار شاعر ان مثالوں سے

بلا کا شکر کر اے دل کہ اب معلوم ہوتی ہے
حقیقت عافیت کی اس گلی کے رہنے والوں سے

نہیں اے ہم نفس اب جی میں طاقت دوری گل کی
جگر ٹکڑے ہوا جاتا ہے آخر شب کے نالوں سے

نہیں خالی اثر سے تصفیہ دل کا محبت میں
کہ آئینہ کو ربطِ خاص ہے صاحب جمالوں سے

کہاں یہ قامتِ دلکش کہاں پاکیزگی ایسی
ملے ہیں ہم بہت گلزار کے نازک نہالوں سے

ہدف اس کا ہوئے مدت ہوئی سینہ کو پر اب تک
گتھا نکلے ہے لختِ دل مرا تیروں کی بھالوں سے

ہوا پیرانہ سر عاشق ہو زاہد مضحکہ سب کا
کہن سالی میں ملتا ہے کوئی بھی خرد سالوں سے

رگِ گل کوئی کہتا ہے کوئی اے میر مو اس کو
کمر اس شوخ کی بندھتی نہیں ان خوش خیالوں سے

گئے جی سے چھوٹے بتوں کی جفا سے
یہی بات ہم چاہتے تھے خدا سے

وہ اپنی ہی خوبی پہ رہتا ہے نازاں
مرو یا جیو کوئی اس کی بلا سے

کوئی ہم سے کھلتے ہیں بند اس قبا کے
یہ عقدے کھلیں گے کسو کی دعا سے

سُدھ لے گھر کی بھی شعلۂ آواز
دود کچھ آشیاں سے اُٹھتا ہے
بیٹھنے کون دے ہے پھر اُس کو
جو ترے آستاں سے اُٹھتا ہے
یوں اُٹھے آہ اُس گلی سے ہم
جیسے کوئی جہاں سے اُٹھتا ہے
عشق اک میرؔ بھاری پتھر ہے
کب یہ تجھ ناتواں سے اُٹھتا ہے

کلی کہتے ہیں اُس کا سا دہن ہے
سُنا کریے کہ یہ بھی اک سخن ہے
ٹپکتے درد ہیں آنسو کی جاگہ
الٰہی چشمِ یار زخمِ کہن ہے
خبر لے پیرِ کنعاں کی کہ کچھ آج
نپٹ آوارہ بوئے پیرہن ہے
نہیں دامن میں لالہ بے ستوں کے
کوئی دل داغ خون کوہکن ہے
شہادت گاہ ہے باغِ زمانہ
کہ ہر گل اس میں اک خونیں کفن ہے
کروں کیا حسرتِ گل کو وگرنہ
دلِ پُر داغ بھی اپنا چمن ہے
جو دے آرام ٹک آوارگی میرؔ
تو شامِ غربت اک صبحِ وطن ہے

گلگشت کی ہوس تھی سو تو بگیر آئے
آئے جو ہم چمن میں ہو کر اسیر آئے
فرصت میں یک نفس کے کیا دردِ دل سنو گے
آئے تو تم ولیکن وقتِ اخیر آئے
دلی میں اب کی آکر اُن یاروں کو نہ دیکھا
کچھ دے گئے شتابی کچھ ہم بھی دیر آئے
کیا خوبی اس چمن کی موقوف ہے کسو پر
گل گر گئے عدم کو ٹکڑے نظیر[1] آئے
شکوہ نہیں جو اُس کو پروا نہ ہو ہماری
دروازے جس کے ہم سے کتنے فقیر آئے
عمر دراز کیونکر مختار خضر ہے یہاں
ایک آدھ دن میں ہم تو جینے سے سیر آئے
نزدیک تھی قفس میں پروازِ روح اپنی
غنچے ہو گلبنوں پر جب ہم صفیر آئے
یوں بیٹھے بیٹھے ناگہ گردن لگے ہلانے
سر شیخ جی کے گویا مجلس میں پیر آئے
قامت خمیدہ اُس کی جیسی کماں تھی لیکن
قربان گہِ وفا میں مانند تیر آئے
بن جی دیئے نہیں ہے امکاں یہاں سے جانا
بسمل گہِ جہاں میں اب ہم تو میرؔ آئے

[1] نظیر آئے یعنی پھول کی مانند خوبرو پیدا ہوئے۔

کس طور ہمیں کوئی فریبندہ لبھالے　　آخر ہیں تری آنکھوں کے ہم دیکھنے والے

سو ظلم اُٹھائے تو کبھو دُور سے دیکھا　　ہرگز نہ ہوا یہ کہ ہمیں پاس بُلالے

اُس شوخ کی سر تیز پلک ہیں کہ وہ کانٹا　　گڑ جائے اگر آنکھ میں سر دل سے نکالے

عشق[۱] اُن کو ہے جو یار کو اپنے دمِ رفتن　　کرتے نہیں غیرت سے خدا کے بھی حوالے

وے دن گئے جو ضبط کی طاقت تھی ہمیں بھی　　اب دیدۂ خونبار نہیں جاتے سنبھالے

احوال بہت تنگ ہے اے کاش محبت　　اب دستِ تلطف کو مرے سر سے اُٹھالے

دعوائے قیامت کا مرے خوف اُسے کیا　　اک لطف میں وہ مجھ سے تنک رو کے منالے

کہتے ہیں حجابِ رخِ دلدار ہے ہستی　　دیکھیں گے اگر یوں ہے بھلا جان بھی جالے

میر اس سے نہ مل آہ کہ ڈرتے ہیں مبادا
بیباک ہے وہ شوخ کہیں مار نہ ڈالے

برنگِ بوئے گل اس باغ کے ہم آشنا ہوتے　　کہ ہمراہِ صبا ٹک سیر کرتے پھر ہوا ہوتے

سراپا[۲] آرزو ہونے نے بندہ کر دیا ہم کو　　وگرنہ ہم خدا تھے گر دلِ بے مدعا ہوتے

فلک اے کاش ہم کو خاک ہی رکھتا کہ اس میں ہم　　غبارِ راہ ہوتے یا کسو کی خاکِ پا ہوتے

الٰہی کیسے ہوتے ہیں جنھیں ہے بندگی خواہش　　ہمیں تو شرم دامن گیر ہوتی ہے خدا ہوتے

تو ہے کس ناحیے سے اے دیارِ عشق کیا جانوں　　ترے باشندگاں ہم کاش سارے بیوفا ہوتے

اب ایسے ہیں کہ صانع کے مزاج اوپر بہم پہنچے　　جو خاطر خواہ اپنے ہم ہوئے ہوتے تو کیا ہوتے

کہیں جو کچھ ملامت گر بجا ہے میر کیا جانے
اُنھیں معلوم تب ہوتا کہ ویسے سے جدا ہوتے

چمن یار تیرا ہوا خواہ ہے　　گل اک دل ہے جس میں تری چاہ ہے

سراپا میں اُس کے نظر کرکے تم　　جہاں دیکھو اللہ اللہ ہے

تری آہ کس سے خبر پائیے　　وہی بے خبر ہے جو آگاہ ہے

مرے لب پہ رکھ کان آواز سُن　　کہ اب تک بھی یک ناتواں آہ ہے

گزر سر سے تب عشق کی راہ چل　　کہ ہر گام یہاں اک خطرگاہ ہے

---

۱ مرزا غالبؔ دہلوی ؎ قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہمسفر غالبؔ ؛ وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

۲ لا اعلم ؎ ہم خدا تھے گر نہ ہوتا دل میں کوئی مدعا ؛ آرزوؤں نے ہماری ہم کو بندہ کر دیا

پشیمان توبہ سے ہوگا عدم میں — کہ غافل چلا شیخ لطفِ ہوا سے
نہ رکھی مری خاک بھی اس گلی میں — کدورت مجھے ہے نہایت صبا سے
جگر سوئے مژگاں کھنچا جائے ہے کچھ — مگر دیدۂ تر ہیں لوہو کے پیاسے
اگر چشم ہے تو وہی عین حق ہے — تعصب تجھے ہے عجب ماسوا سے
طبیبِ سبک عقل ہرگز نہ سمجھا — ہوا دردِ عشق آہ دونا دوا سے
ٹک اے مدعی چشمِ انصاف وا کر — کہ بیٹھے ہیں یہ قافیے کس ادا سے

نہ شکوہ شکایت نہ حرفِ حکایت
کہو میر جی آج کیوں ہو خفا سے

کبکوں نے تیری چال جو دیکھی ٹھٹھک گئے — دل ساکنانِ باغ کے تجھ سے اٹک گئے
اندوہ وصل و ہجر نے عالم کھپا دیا — ان دو ہی منزلوں میں بہت یار تھک گئے
مطلق اثر نہ اُس کے دلِ نرم میں کیا — ہرچند نالہائے حزیں عرش تک گئے
افراط گریہ سے ہوئیں آبادیاں خراب (ازحد) — سیلاب میرے اشک کے اژدر بھی بہک گئے
وے میگسار ظرف جنھیں خم کشی کے تھے — بھر کر نگاہ تونے جو کی دو ہیں چھک گئے
چنداے سپہر چھاتی ہماری جلا کرے — اب داغ کھاتے کھاتے کلیجے تو پک گئے

عشاق پر جو وے صفِ مژگاں پھریں تو میر
جوں اشک کتنے چو گئے کتنے ٹپک گئے

زندگی ہوتی ہے اپنی غم کے مارے دیکھیے — موندلیں آنکھیں اِدھر سے تم نے پیارے دیکھیے
لختِ دل کب تک الٰہی چشم سے ٹپکا کریں — خاک میں تاچند ایسے لعل پارے دیکھیے
ہو چکا روزِ جزا اب اے شہیدانِ وفا — چونکتے ہیں خونِ خفتہ کب تمھارے دیکھیے
راہِ دورِ عشق میں اب تو رکھا ہم نے قدم — رفتہ رفتہ پیش کیا آتا ہے بارے دیکھیے
سینۂ مجروح بھی قابل ہوا ہے سیر کے — ایک دن تو آن کر یہ زخم سارے دیکھیے
خنجرِ بیداد کو کیا دیکھتے ہو دمبدم — چشم سے انصاف کی سینے ہمارے دیکھیے
ایک خوں ہو بہ گیا دو روتے ہی روتے گئے — دیدہ و دل ہو گئے ہیں سب کنارے دیکھیے
شست و شو کا اُس کے پانی جمع ہو کر مہ بنا — اور منہ دھونے کے چھینٹوں سے ستارے دیکھیے
سو گئے سوتے کے سوتے کارواں جاتا رہا — ہم تو میر اس رہ کے خوابیدہ ہی مارے دیکھیے

میں جو بولا کہا کہ یہ آواز
اُسی خانہ خراب کی سی ہے

آتش غم میں دل بھنا شاید
دیر سے بو کباب کی سی ہے

دیکھئے ابر کی طرح اب کے
میری یہ چشم پر آب کی سی ہے

میر اُن نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

شمع صفت جب کبھو مر جائیں گے
ساتھ لئے داغِ جگر جائیں گے

تند نہو ہم تو موئے پھرتے ہیں
کیا تری ان باتوں سے ڈر جائیں گے

کھل گئے رخسار اگر یار کے
شمس و قمر جی سے اُتر جائیں گے

خالی نہ چھوڑیں گے ہم اپنی جگہ
گر یہی رونا ہے تو بھر جائیں گے

راہ دمِ تیغ پہ ہو کیوں نہ میر
جی پہ رکھیں گے تو گزر جائیں گے

اب جو اک حسرتِ جوانی ہے
عمر رفتہ کی یہ نشانی ہے

رشکِ یوسف ہے آہ وقتِ عزیز
عمر اک بارِ کاروانی ہے

گریہ ہر وقت کا نہیں بے ہیچ
دل میں کوئی غم نہانی ہے

خاک تھی موج زن جہاں میں اور
ہم کو دھوکا یہ تھا کہ پانی ہے

ہمقفس زاد قیدی ہیں ورنہ
تا چمن ایک پر فشانی ہے

اُس کی شمشیر تیز سے ہمدم
مر رہیں گے جو زندگانی ہے

غم و رنج و الم نکویاں سے
سب تمھاری ہی مہربانی ہے

یہاں ہوئے میر تم برابر خاک
وہاں وہی ناز و سرگرانی ہے

قیامت ہیں یہ چسپاں جامے والے
گلوں میں جن کی خاطر کُرتے ڈالے

وہ کالا چور ہے خالِ رخِ یار
کہ سو آنکھوں میں دل ہو تو چرالے

نہیں اُٹھتا دلِ محزوں کا ماتم
خدا ہی اس مصیبت سے نکالے

کہاں تک دور بیٹھے بیٹھے کہئے
کبھو تو پاس ہم کو بھی بلالے

ولا بازی نہ کر ان گیسوؤں سے
نہیں آساں کھلانے سانپ کالے

کبھو وادیِ عشق دکھلائیے — بہت خضر بھی دل میں گمراہ ہے
جہاں سے تو رختِ اقامت کو باندھ — یہ منزل نہیں بے خبر راہ ہے
یہ شرمندہ کر اپنے منہ سے مجھے — کہا میں نے کب یہ کہ تو ماہ ہے

یہ وہ کارواں گاہ دلکش ہے میر
کہ پھر یہاں سے حسرت ہی ہمراہ ہے

ڈھب ہیں تیری سی باغ میں گل کے — بو گئی کچھ دماغ میں گل کے
جائے روغن دیا کرے ہے عشق — خونِ بلبل چراغ میں گل کے
دل تسلی نہیں صبا ورنہ — جلوے سب ہیں گے داغ میں گل کے
اس حدیقے کے عیش پر مت جا — مے نہیں ہے ایاغ میں گل کے

سیر کر میر اس چمن کی شتاب
ہے خزاں بھی سراغ میں گل کے

عشق میں نے خوف و خطر چاہیے — جان کے دینے کو جگر چاہیے
قابلِ آغوش ستم دیدگاں — اشک سا پاکیزہ گہر چاہیے
حال یہ پہنچا ہے کہ اب ضعف سے — اٹھتے پلک ایک پہر چاہیے
کم ہیں شناسائے زرِ داغِ دل — اس کے پرکھنے کو نظر چاہیے
عشق کے آثار ہیں اے بوالہوس — داغ بہ دل دست بسر چاہیے
شرط سلیقہ ہے ہر اک امر میں — عیب بھی کرنے کو ہنر چاہیے

خوف قیامت کا یہی ہے کہ میر
ہم کو جیا بار دگر چاہیے

ہستی اپنی حباب کی سی ہے — یہ نمائش سراب کی سی ہے
نازکی اس کے لب کی کیا کہیے — پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے
چشم دل کھول اس بھی عالم پر — یاں کی اوقات خواب کی سی ہے
بار بار اس کے در پہ جاتا ہوں — حالت اب اضطراب کی سی ہے
نقطۂ خال سے ترا ابرو — بیت اک انتخاب کی سی ہے

لہ یعنی گل کو کچھ غرور پیدا ہو گیا ہے ۔

قربان گہ محبت وہ جا ہے جس میں ہر سو
دشوار جان دینا آسان ہو رہا ہے

ہر شب گلی میں اُس کی روتے رہے جو ہم تو
اک روز میر صاحب طوفان ہو رہا ہے

تیری گلی سے جب ہم عزم سفر کریں گے
ہر ہر قدم کے اوپر پتھر جگر کریں گے

آزردہ خاطروں سے کیا فائدہ سخن کا
تم حرف سر کروگے ہم گریہ سر کریں گے

عذرِ گناہِ خوباں بدتر گنہ سے ہوگا
کرتے ہوئے تلافی بے لطف تر کریں گے

سر جائیگا ولیکن آنکھیں اُدھر ہی ہونگی
کیا تیری تیغ سے ہم قطع نظر کریں گے

اپنی خبر بھی ہم کو اب دیر پہنچتی ہے
کیا جانے یار اُس کو کبتک خبر کریں گے

گر دل کی تاب و طاقت یہ ہے تو ہمنشیں ہم
شامِ غمِ جدائی کیونکر سحر کریں گے

یہ ظلم بے نہایت دیکھو تو خوبرو یاں
کہتے ہیں جو ستم ہے ہم تجھ ہی پر کریں گے

اپنے ہی جی میں آخر انصاف کر کہ کبتک
تو یہ ستم کرے گا ہم در گزر کریں گے

صناع طرفہ ہیں ہم عالم میں ریختے کے
جو میر جی لگے گا تو سب ہنر کریں گے

آنکھیں لڑا لڑا کر کبتک لگا رکھیں گے
اس پردے ہی میں خوباں ہم کو سلا رکھیں گے

فکر دہن میں اُس کی کچھ بن نہ آئی آخر
اب یہ خیال ہم بھی دل سے اُٹھا رکھیں گے

مشتِ نمک کو میں نے بیکار کم رکھا ہے
چھاتی کے زخم میرے مدت مزا رکھیں گے

سبزانِ شہر اکثر درپے ہیں آبرو کے
اب زہر پاس اپنے ہم بھی منگا رکھیں گے

آنکھوں میں دلبروں کی مطلق نہیں مروت
یہ پاسِ آشنائی منظور کیا رکھیں گے

جیتے ہیں جب تلک ہم آنکھیں بھی لڑتیاں ہیں
دیکھیں تو جور خوباں کبتک روا رکھیں گے

اب چاند بھی لگا ہے تیرے سے جلوہ کرنے
شبہائے ماہ چندے تجھ کو چھپا رکھیں گے

مژگان و چشم و ابرو سب ہیں ستم کی مائل
ان آفتوں سے دل ہم کیونکر بچا رکھیں گے

دیوانِ میر صاحب ہر یک کی ہے بغل میں
دو چار شعر ان کے ہم بھی لکھا رکھیں گے

تجھ سے دوچار ہوگا جو کوئی راہ جاتے
پھر عمر چاہیئے گی اُس کو بحال آتے

گر دل کی بیقراری ہوتی یہی جو اب ہے
تو ہم ستم رسیدہ کاہیکو جینے پاتے

طپش نے دل جگر کی مار ڈالا
بغل میں دشمن اپنے ہم نے پالے
نہ مہکے بوئے گل اے کاش یک چند
ابھی زخم جگر سارے ہیں آلے
کسے قیدِ قفس میں یاد گل کی
پڑے ہیں اب تو جینے ہی کے لالے
ستایا میر غم کش کو کنھوں نے
کہ پھر اب عرش تک جاتے ہیں نالے

اب ظلم ہے اس خاطر تا غیر بھلا مانے
بس ہم نہ بُرا مانے تو کون بُرا مانے
سرمایۂ صد آفت دیدار کی خواہش ہے
دل کی تو سمجھ لیجے گر چشم کہا مانے
مسدود ہی ہے قاصد بہتر ہے رہِ نامہ
کیا کیا نہ لکھیں ہم تو جو یار لکھا مانے
تک حالِ شکستہ کی سُننے ہی میں سب کچھ ہے
پردہ تو سخن رس ہے اس بات کو کیا مانے
بے طاقتیٔ دل نے سائل بھی کیا ہم کو
پر میر فقیروں کی یہاں کون صدا مانے

دل کے معمورے کی مت کر فکر فرصت چاہیئے
ایسے ویرانے کے اب بسنے کو مدت چاہیئے
عشق و میخواری نبھے ہے کوئی درویشی کے بیچ
اس طرح خرچ لا حاصل کو دولت چاہیئے
عاقبت فرہاد مر کر کام اپنا کر گیا
آدمی ہووے کسی پیشے میں جرأت چاہیئے
ہو طرف مجھ پہلواں شاعر کا کب عاجز سخن
سامنے ہونے کو صاحب فن کی قدرت چاہیئے
عشق میں وصل و جدائی سے نہیں کچھ گفتگو
قرب و بعد اس جا برابر ہے محبت چاہیئے
نازکی کو عشق میں کیا دخل ہے اے بلہوس
یہاں صعوبت کھینچنے کو جی میں طاقت چاہیئے
تنگ مت ہو ابتدائے عاشقی میں اس قدر
خیریت ہے میر صاحب دل سلامت چاہیئے

بے یار شہر دل کا ویران ہو رہا ہے
دکھلائی دے جہاں تک میدان ہو رہا ہے
اس منزلِ جہاں کے باشندے رفتنی ہیں
ہر اک کے یہاں سفر کا سامان ہو رہا ہے
اچھا لگا ہے شاید آنکھوں میں یار اپنے
آئینہ دیکھ کر کچھ حیران ہو رہا ہے
گل دیکھ کر چمن میں تجھ کو کھلا ہی جا ہے
یعنی ہزار جی سے قربان ہو رہا ہے
حال زبون اپنا پوشیدہ کچھ نہ تھا تو
سنتا نہ تھا کہ یہ صید بیجان ہو رہا ہے
ظالم ادھر کی سدھ لے جوں شمع صبحگاہی
ایک آدھ دم کا عاشق مہمان ہو رہا ہے

تا کہ وہ ٹک آن کے پوچھے کبھو
اس لئے بیمار ہوا چاہیئے
زلف کسی کی ہو کہ ہو خال و خط
دل کو گرفتار ہوا چاہیئے
تیغ بلند اُس کی ہوئی بلہوس
مرنے کو تیار ہوا چاہیئے
مصطبۂ بیخودی ہے یہ جہاں
جلد خبردار ہوا چاہیئے
مول ہے بازار کا ہستی کے یہ
کاش
دل کے خریدار ہوا چاہیئے
کچھ نہیں خورشید صفت سرکشی
سایۂ دیوار ہوا چاہیئے
کرنہ تعلق کہ یہ منزل نہیں
آہ سُبک بار ہوا چاہیئے

گو سفری اب نہیں ظاہر ہیں میر
عاقبت کار ہوا چاہیئے

یہاں سرکشاں جو صاحب تاج و لوا ہوئے
پامال ہو گئے تو نہ جانا کہ کیا ہوئے
دیکھی نہ ایک چشمک گل بھی چمن میں آہ
ہم آخر بہار قفس سے رہا ہوئے
پچھتاؤ گے بہت جو گئے ہم جہان سے
آدم کی قدر ہوتی ہے ظاہر جدا ہوئے
تجھ بن دماغ صحبت اہل چمن نہ تھا
گل وا ہوئے ہزار ولے ہم نہ وا ہوئے

سر دیجے میر ہم نے فراغت کی عشق میں
ذمہ ہمارے بوجھ تھا بارے ادا ہوئے

اس اسیری کے نہ کوئی اے صبا پالے پڑے
اک نظر گل دیکھنے کے بھی ہیں لالے پڑے
حسن کو بھی عشق نے آخر کیا حلقہ بگوش
رفتہ رفتہ دلبروں کے کان میں بالے پڑے
مست نگاہ مست کو تکلیف کر ساقی زیاد
ہر طرف تو ہیں گلی کوچوں میں متوالے پڑے
کیونکہ طے ہو دشت شوق آخر کو مانند سرشک
میرے پانوں میں تو پہلے ہی قدم چھالے پڑے
جوش مارا اشک خونیں نے مرے دل نے بس
گھر میں ہمسایوں کے شب لوہو کے پرنالے پڑے
ہیں بعینہ ویسے جوں پردا کرے ہے عنکبوت
روتے روتے بسکہ میری آنکھوں میں جالے پڑے

گر محوشی سے مرد گریہ کی شب آنکھوں کی راہ
گوشۂ دامن میں میر آتش کے پرکالے پڑے

رنج کھینچے تھے داغ کھائے تھے
دل نے صدمے بڑے اُٹھائے تھے
پاس ناموس عشق تھا ورنہ
کتنے آنسو پلک تک آئے تھے

وے دن گئے کہ اُٹھکر جاتے تھے اُس گلی میں
کب تھی ہمیں تمنّا ای ضعف یہ کہ تڑپیں
گر جانتے کہ یوں ہی بر باد جائیں گے تو
شاید کہ خون دل کا پہنچا ہے وقت آخر
اس سمت کو پلٹتی تیری نگہ تو ساقی
جی دینا دلدہی سے بہتر تھا صد مراتب

اب سعی چاہئے ہی بالیں سے سر اُٹھاتے
پر زیر تیغ اُس کی ہم ٹک تو سر ہلاتے
کاہے کو خاک میں ہم اپنے تئیں ملاتے
تھم جاتے ہیں کچھ آنسو راتوں کو آتے آتے
حال خراب مجلس ہم شیخ کو دکھاتے
ای کاش جان دیتے ہم بھی نہ دل لگاتے

شب کوتہ اور قصہ ان کا دراز ورنہ
احوال میر صاحب ہم تجھ کو سب سناتے

ہو عاجز کہ جسم اس قدر زور سے
بہت دور کوئی رہا ہے مگر
مری خاک تفتہ پر ای ابر تر
ترے دل جلے کو رکھا جس گھڑی
نہ پوچھو کہ بے اعتباری سے میں

نہ نکلا کبھو عہدۂ مور سے
کہ فریاد میں ہے جرس شور سے
قسم ہے تجھے ٹک برس زور سے
دھواں سا اُٹھا کچھ لب گور سے
ہوا اس گلی میں بتر چور سے

جو ہو میر بھی اس گلی میں صبا
بہت پوچھیو تو مری اور سے

مت ہو مغرور ایکہ تجھ میں زور ہی
مر گئے پر بھی ہے صولت فقر کی
جب سے کاغذ باد کا ہے شوق اسے
رہنمائی شیخ سے مت چشم رکھہ
لے ہی جاتی ہے زرِ گل کو اُڑا
دل کھنچے جاتے ہیں سارے اس طرف

یہاں سلیماںؑ کے مقابل مور ہی
چشم شیر اپنا چراغ گور ہی
ایک عالم اُس کے اوپر ڈور ہی
وائے وہ جس کا عصا کش کور ہی
صبح کی بھی باد بادی چور ہی
کیونکہ کہیئے حق ہماری اور ہی

تھا بلا ہنگامہ آرا میر بھی
اب تلک گلیوں میں اُس کا شور ہی

غیر کے اب یار ہوا چاہئے
جسکے تئیں ڈھونڈھیں ہیں وہ سب میں ہی

ملتجی ناچار ہوا چاہیے
کس کا طلبگار ہوا چاہیے

نہیں وہ قید الفت میں گرفتاری کو کیا جانے ۔ تکلف بر طرف بے مہر ہے یاری کو کیا جانے
وہ ہے اک سند رس نالہ مبارک مرغ گلشن کو ۔ وہ اس ترکیب نو کی نالہ و زاری کو کیا جانے
ستم ہے تیری خوئے خشمگیں پر ٹک بھی دلجوئی ۔ دل آزاری کی باتیں کر تو دلداری کو کیا جانے
گلہ اپنی جفا کا سُن کے مت آزردہ ہو ظالم ۔ نہیں تہمت ہے تجھ پر تو جفاکاری کو کیا جانے
ترا ابرام اس کی سادگی پر میر میں مانا
بھلا ایسا جو ناداں ہو وہ عیاری کو کیا جانے

جوش دل آئے بہم دیدۂ گریاں ہوئے ۔ کتنے اک اشک ہوئے جمع کہ طوفاں ہوئے
کیا چھپیں شہر محبت میں ترے خانہ خراب ۔ گھر کے گھر اُن کے ہیں اس بستی میں ویران ہوئے
کس نے لی رخصت پرواز پس از مرگ نسیم ۔ مشت پر باغ میں آتی ہے پریشان ہوئے
سبزہ و لالہ و گل ابر و ہوا ہے مے دے ۔ ساقی ہم توبہ کے کرنے سے پشیمان ہوئے
دعوئ خوش دہنی گرچہ اُسے تھا لیکن ۔ دیکھکر منھ کو ترے گل کے تئیں کان ہوئے
جام خوں بن نہیں ملتا ہے ہمیں صبح کو آب ۔ جب سے اس چرخ سیہ کاسہ کے مہمان ہوئے
اپنے جی ہی نے نہ چاہا کہ پئیں آب حیات
یوں تو ہم میر اسی چشمے پہ بیجاں ہوئے

یارب کوئی ہو عشق کا بیمار نہووے ۔ مر جائے ولے اس کو یہ آزار نہووے
زنداں میں پھنسے طوق پڑے قید میں مر جائے ۔ پر دام محبت میں گرفتار نہووے
اس واسطے کانپوں ہوں کہ ہے آہ نپٹ سرد ۔ یہ باد کلیجے کے کہیں پار نہووے
صد نالہ جانکاہ ہیں وابستہ چمن سے ۔ کوئی بال شکستہ پس دیوار نہووے
پژمردہ بہت ہے گل گلزار ہمارا ۔ شرمندۂ یک گوشۂ دستار نہووے
مانگے ہے دعا خلق تجھے دیکھ کے ظالم ۔ یارب کسو کو اس سے سروکار نہووے
ہوں دوست جو کہتا ہوں سن اے جان کے دشمن ۔ قطعہ بہتر تو تجھے ترک ہے تا خوار نہووے
خوباں بُرے ہوتے ہیں اگرچہ ہیں نکو رو ۔ بے جرم کہیں ان کا گنہگار نہووے
باندھے نہ پھرے خون پر اپنی تو کمر کو ۔ یہ جان سبک تن پہ ترے بار نہووے
چلتا ہے رہ عشق ہی اس پر بھی چلے تو ۔ پر ایک قدم چل کہیں زنہار نہووے
صحرائے محبت ہے قدم دیکھ کے رکھ میر ۔ یہ سیر سر کوچہ و بازار نہووے

وہی سمجھا نہ ورنہ ہم نے تو
زخم چھاتی کے سب دکھائے تھے

اب جہاں آفتاب میں ہم ہیں
یہاں کبھو سرو و گل کے سائے تھے

کچھ نہ سمجھے کہ تجھ سے یاروں نے
کس توقع پہ دل لگائے تھے

فرصت زندگی سے مت پوچھو
سانس بھی ہم نہ لینے پائے تھے

میر صاحب رُلا گئے سب کو
کل وے تشریف یہاں بھی لائے تھے

گرے بحرِ بلا مژگان تر سے
نگاہیں اُٹھ گئیں طوفان پر سے

ہمیں غش آگیا تھا وہ بدن دیکھ
بڑی کلول ٹلی ہے جان پر سے

لیا دل اُس مخطط رو نے میرا
اُٹھالوں میں اُسے قرآن پر سے

کہاں ہیں آدمی عالم میں پیدا
خدائی صدقے کی انسان پر سے

تفنگ اُس کی چلی آواز پر لیک
گئی ہے میر گولی کان پر سے

خوب ہی اے ابر اک شب آؤ باہم روئیے
پر نہ اتنا بھی کہ ڈوبے شہر کم کم روئیے

وقت خوش دیکھا نہ اک دم سے زیادہ دہر میں
خندۂ صبح چمن پر مثلِ شبنم روئیے

شادی و غم میں جہاں کی ایک سے دس کا ہے فرق
عید کے دن ہنسیے تو دس دن محرم روئیے

دیکھا ماتم خانۂ عالم کو ہم مانندِ ابر
ہر جگہ پر جی میں یوں آیا دمادم روئیے

ہو جدا فردوس سے یعنی گلی سے یار کے
مدتوں تک کیجیے غم مثل آدم روئیے

اب سے یوں کریے مقرر اُٹھیے جب کہسار سے
وادیِ مجنوں پہ بھی اے ابر اک دم روئیے

عشق میں تقریبِ گریہ کو نہیں درکار میر
ایک مدت صبر ہی کا رکھیے ماتم روئیے

نیلا نہیں سپہر تجھے اشتباہ ہے
دودِ جگر سے میرے یہ چھت سب سیاہ ہے

ابر و بہار و بادہ سبھوں میں ہے اتفاق
ساقی جو تو بھی مل چلے تو واہ واہ ہے

سُرمے سے ایسی آنکھیں تمھاری نہیں لگیں
احوال پر ہمارے تمھیں کب نگاہ ہے

کس کس طرح سے ہاتھ نچاتا ہے وعظ میں
دیکھا جو شیخ شہر عجب دستگاہ ہے

ہے روئے عجز میر تری خاک راہ پر
یعنی کہ کام اس کا کچھ اب بہ راہ ہے

دیواروں سے سر مارتے پھرنے کا گیا وقت
اب تو ہی مگر آب کبھو اس اور در آوے

واعظ نہیں کیفیت میخانہ سے آگاہ
اک جرعہ بدل ورنہ یہ مندیل ہر آوے

صنّاع ہیں سب خوار ازاں جملہ ہوں میں بھی
ہے عیب بڑا اس میں جسے کچھ ہنر آوے

قطعہ

اے وہ کہ تو بیٹھا ہے سرِ راہ پہ زنہار
کہیو جو کبھو میر بلاکش ادھر آوے

مت دشتِ محبت میں قدم رکھ کہ خضر کو
ہر گام پہ اس رہ میں سفر سے حذر آوے

لگوائے پتھر اور برا بھی کہا کیے
تم نے حقوق دوستی کے سب ادا کیے

کھینچا تھا آہِ شعلہ فشاں نے جگر سے سر
برسوں تئیں پڑے ہوئے جنگل جلا کیے

غنچے نے ساری طرز ہماری ہی اخذ کی
ہم جو چمن میں برسوں گرفتہ رہا کیے

تدبیر عشق میں بھی نہ کرتے قصور یار
جو اس مرض میں ہوتے بھلے ہم دوا کیے

جوں نے نہ تیرے کشتے کے لب سے رہی فغاں
ہر چند بند بند بھی اس کے جدا کیے

کیا حرف دلنشیں ہو مرا جیسے خط مدام
اغیار روسیاہ ترے منہ لگا کیے

پھر شام آشنا نہ کبھو نکلے گلرخاں
ہر صبح ان سے برسوں تئیں ہم ملا کیے

بے عیب ذات ہے گی خدا ہی کی اے بتاں
تم لوگ خوبرو جو کیے بے وفا کیے

اب خاک سی اڑے ہے منہ اوپر وگرنہ میر
اس چشمِ گریہ ناک سے دریا بہا کیے

کروں جو آہ زمین و زمان جل جاوے
سپہرِ نیلی کا یہ سائبان جل جاوے

دی آگ دل کو محبت نے جب سے جلتا ہوں
میں جس طرح کسو کا خانمان جل جاوے

دوا پذیر نہیں اے طبیب تپِ غم کی
بدن میں ٹک رہے تو استخوان جل جاوے

نہ آوے سوزِ جگر منہ پہ شمع ساں اے کاش
بیان کرنے سے آگے زبان جل جاوے

ہمارے نالے بھی آتش ہی کے ہیں پرکالے
سنے تو بلبلِ نالاں کی جان جل جاوے

ہزار حیف کہ دل خار و خس سی باندھے کوئی
خزاں میں برق گرے آشیان جل جاوے

متاعِ سینہ سب آتش ہے فائدہ کس کا
خیال یہ ہے مبادا دکان جل جاوے

نہ پوچھ کچھ لبِ ترسا بچے کی کیفیت
کہوں تو دخترِ رز کی ... ن جل جاوے

نہ بول میر سے مظلومِ عشق ہے وہ غریب
مبادا آہ کرے سب جہان جل جاوے

برقع کو اُٹھا چہرے سے وہ بت اگر آوے
اللہ کی قدرت کا تماشا نظر آوے

اے ناقۂ لیلیٰ دو قدم راہ غلط کر
مجنون زخود رفتہ کبھو راہ پر آوے

ٹک بعد مرے میرے طرفداروں کنے تو
کوئی بھیجیو ظالم کہ تسلی تو کر آوے

کیا ظرف ہے گردون تنک حوصلہ کا جو
آشوب فغاں کے مرے عہدہ سے برآوے

قطعہ
ممکن نہیں آرام دے بیتابی جگر کی
جبتک نہ پلک پر کوئی ٹکڑا نظر آوے

مت ممتحنِ باغ ہو اے غیرتِ گلزار
گل کیا کہ جسے آگے ترے بات کر آوے

کھلتے میں ترے منہ کی کلی پھاڑے گریباں
ہلنے میں ترے ہونٹوں کے گلبرگ تر آوے

ہم آپ سے جاتے رہے ہیں ذوقِ خبر میں
اے جان بلب آمدہ رہ تا خبر آوے

کہتے ہیں ترے کوچہ سے میر آنے کہے ہے
جب جانیے وہ خانہ خراب اپنے گھر آوے

ہے جی میں غزل در غزل اے طبع یہ کہئے
شاید کہ نظیری[۱] کے بھی عہدہ سے بر آوے

جب نام ترا لیجئے تب چشم بھر آوے
اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

تلوار کا بھی مارا خدا رکھے ہے ظالم
یہ تو ہو کوئی گورِ غریباں میں در آوے

میخانہ وہ منظر ہے کہ ہر صبح جہاں شیخ
دیوار پہ خورشید کا مستی سے سر آوے

کیا جانیں وہ مرغان گرفتارِ چمن کو
جن تک کہ بصد ناز نسیم سحر آوے

تو صبح قدم رنجہ کرے ٹک تو ہے ورنہ
کس واسطے عاشق کی شبِ غم بسر آوے

ہر سو سرِ تسلیم رکھے صیدِ حرم میں
وہ صید فگن تیغ بکف تا کدھر آوے

---

[۱] نظیری۔ مولانا نظیری نیشاپور کے رہنے والے تھے وہاں سے ہندوستان آئے۔ خانخاناں کے مائدۂ کرم سے فیضیاب ہوئے اور اُسی وقت سے ان کو زبردست شہرت حاصل ہوئی۔ خانخاناں کی مدح میں نہایت پُرزور قصاید کہے اور ایک طویل قیام کے بعد حرمین محترمین کی زیارت کو گئے اور بعد حج وغیرہ پھر ہندوستان آئے۔ ایک مرتبہ جہانگیر نے ایک عمارت کے کتبے کیلئے ان کو حکم دیا۔ انھوں نے ایک غزل کہی جس کا مطلع یہ ہے ۔ اے خاک ذات صندل سرگشتہ سراں را ۔ با دائرہ جاروب بہت تاجوراں را ۔ بادشاہ نے اس کے صلہ میں قریب تین ہزار (۳۰۰۰) بیگہ زمین عنایت فرمائی۔ نظیری نہایت نیک طینت صوفی مشرب مہذب الاخلاق تھے آخر میں ان کا کلام بالکل صوفیانہ ہوتا تھا۔ آخر عمر میں احمد آباد گئے۔ اور قریب بارہ (۱۲) برس زندہ رہ کر ۱۰۲۳ھ میں انتقال کیا اور احمد آباد ہی میں تاج پورہ میں مدفون ہوئے۔ ان کی قبر پر ایک گنبد بنا ہوا ہے۔ ایک ضخیم کلیات اُن سے یادگار ہے میر تقی نے شاید کسی غزل کا کوئی مطلع لیکر یہ غزل کہی ہے۔ یا اُن کی سلاست بیان کی طرف اشارہ ہے۔

عریانیِ آشفتہ کہاں جائے پس از مرگ
کشتہ ہی ترا اور یہی بے کفنی ہے

سمجھے ہی نہ پروانہ، نہ تھانبے ہی زبانِ شمع
وہ سوختنی ہے تو یہ گردن زدنی ہے

لیتا ہی نکلتا ہی مرا لختِ جگر اشک
آنسو نہیں گویا کہ یہ ہیرے کی کنی ہے

بلبل کی کفِ خاک بھی اب ہوگی پریشاں
جامے کا ترے رنگ ستمگر چمنی ہے

کچھ تو ابھر اے صورتِ شیریں کہ دکھاؤں
فرہاد کے ذمہ بھی عجب کوہ کنی ہے

ہوں گرمِ سفر شامِ غریباں سی خوشی ہوں
اے صبحِ وطن تو تو مجھے بے وطنی ہے

قطعہ

ہر چند گدا ہوں میں ترے عشق میں لیکن
ان بلہوسوں میں کوئی مجھ سا بھی غنی ہے

ہر اشک مرا ہی دُرِ شہوار سے بہتر
ہر لختِ جگر رشکِ عقیقِ یمنی ہے

پگڑی ہی نپٹ میرؔ طپش اور جگر نے
شاید کہ مرے جی ہی پر اب آن بنی ہے

اب کر کے فراموش تو ناشاد کروگے
پر ہم جو نہ ہوں گے تو بہت یاد کروگے

زنہار اگر خستہ دلاں بیستوں جاؤ
ٹک پاسِ ہنرمندیِ فرہاد کروگے

غیروں پہ اگر کھینچوگے شمشیر تو خوباں
اک اور مری جان پہ بیداد کروگے

قطعہ

جاگہ نہیں یہاں رودیئے جس پر نہ گھڑی ہو
کچھ شور ہی شر پر تو مجھے یاد کروگے

اس دشت میں اے راہ رواں ہر قدم اوپر
مانندِ جرس نالہ و فریاد کروگے

گر دیکھوگے تم طرزِ کلام اُس کی نظر کر
اے اہلِ سخن میرؔ کو اُستاد کروگے

خوش سر انجام تھے وے جلد جو ہشیار ہوئے
ہم تو اے ہمنفساں دیر خبردار ہوئے

جنسِ دل دونوں جہاں جس کی بہا تھی اس کا
یک نگہ مول ہوا تم نہ خریدار ہوئے

عشق وہ ہے کہ جو تھے خلوتیِ منزلِ قدس
وے بھی رسوائے سرِ کوچہ و بازار ہوئے

سیرِ گلزار مبارک ہو صبا کو ہم تو
ایک پرواز نہ کی تھی کہ گرفتار ہوئے

اس ستمگار کے کوچہ کے ہوا داروں میں
نامِ فردوس کا ہم لے کے گنہگار ہوئے

وعدۂ حشر تو موہوم نہ سمجھے ہم آہ
کس توقع پہ ترے طالبِ دیدار ہوئے

میرؔ صاحب سے خدا جانے ہوئی کیا تقصیر
جس سے اس ظلم نمایاں کے سزاوار ہوئے

گزار خوش نگاہاں جس میں ہی میرا بیاباں ہے
سواد بر مجنوں تو چیرا گاہ غزالاں ہے
کرے ہی خندۂ دنداں نما تو میں بھی روؤں گا
چمکتی زور ہے بجلی مقرر آج باراں ہے
چمن پر نوحہ وزاری سے کس گل کا یہ ماتم ہی
جو شبنم ہی تو گریاں ہی جو بلبل ہی تو نالاں ہے
ہر اک مژگاں پہ میرے اشک کے قطرے جھمکتے ہیں
تماشا مفت خوباں ہو لب دریا چراغاں ہے

کیا تھا جا بجا رنگیں لہو نجھ ہجر میں رو کر
گریباں میر کا دیکھا مگر گلچیں کا داماں ہے

اپنا شعار پوچھو تو مہرباں وفا ہے
پر اُس کے جی میں ہم سے کیا جانیے کہ کیا ہی
بالیں پہ میری آکر ٹک دیکھ شوق دیدار
سارے بدن کا جی اب آنکھوں میں آرہا ہی
بے اُس کے رگ کے مرتے گرمی عشق میں تو
کرتے ہیں آہ جبتک تب تک ہی کچھ ہوا ہی
شکوہ ہے رونے کا یہ بیگانگی سے تیری
مژگانِ تر وگرنہ آنکھوں میں آشنا ہی
مت کر زمین دل میں تخم امید ضائع
بوٹا جو یہاں اُگا ہے سو اُگتے ہی جلا ہی
شرمندہ ہوتے ہیں گے خورشید و ماہ دونوں
خوبی نے منھ کی تیرے ظالم قراں کیا ہی
اے شمع بزم عاشق روشن ہی یہ کہ تجھ بن
آنکھوں میں میری عالم تاریک ہو گیا ہی
جیتے ہی جی تلک ہیں سارے علاقے سو تو
عاشق ترا مجرد فارغ ہی ہو چکا ہی

صد سحر دیک رقیمہ خط میر جی کا دیکھا
قاصد نہیں چلا ہے جادو مگر چلا ہے

حرم کو جائیے یا دیر میں بسر کریے
تری تلاش میں اک دل کدھر کدھر کریے
کٹے ہے دیکھیے یوں عمر کب تلک اپنی
کہ سنیے نام ترا اور چشم تر کریے
وہ مست ناز تو مچلا ہے کیا جتائیے حال
جو بے خبر ہو بھلا اُس کے تئیں خبر کریے
ہوا ہے دن تو جدائی کا سو تعب سے شام
شب فراق کس امید پر سحر کریے
جہاں کا دید بجز ماتم نظارہ نہیں
کہ دید نی ہی نہیں جس پہ یہاں نظر کریے
جیون سے جاتے ہیں ناچار آہ کیا کیا لوگ
کبھو تو جانب عشاق بھی گزر کریے

ستم اُٹھانے کی طاقت نہیں ہی اب اُس کو
جو دل میں آوے تو ٹک رحم میر پر کریے

مشہور چمن میں تری گل پیرہنی ہے
قرباں ترے ہر عضو پہ نازک بدنی ہے

غیرت نے ہم کو ذبح کیا نے طاقت ہے نے یارا ہے
اس کتے نے کر کے دلیری صیدِ حرم کو مارا ہے

باغ کو تجھ بن اپنے بھائیں آتش دی ہے بہاراں نے
ہر غنچہ اخگر ہی ہم کو ہر گل ایک انگارا ہے

جب تجھ بن لگتا ہے تڑپنے جائے ہے نکلا ہاتھوں سے
ہے جو گرہ سینے میں اُس کو دل کہئے یا پارا ہے

راہِ حدیث جو ٹک بھی نکلی کون سکھائے ہم کو پھر
روئے سخن پر کس کو دے وہ شوخ بڑا عیّارا ہے

کام اُس کا ہے خون افشانی ہر دم تیری فرقت میں
چشم کو میری آ کر دیکھ اب لوہو کا فوّارا ہے

بال کھلے وہ شب کو شاید بسترِ ناز پہ سوتا تھا
آئی نسیمِ صبح جو ایدھر پھیلا عنبر سارا ہے

کس دن دامن کھینچ کے اُن نے یار سے اپنا کام لیا
مدت گزری دیکھتے ہم کو میرؔ بھی اک ناکارا ہے

بندِ قبا کو خوباں جس وقت وا کریں گے
خمیازہ کش جو ہوں گے ملنے کے کیا کریں گے

رونا یہی ہے مجھ کو تیری جفا سے ہر دم
یہ دل دماغ دونوں کب تک وفا کریں گے

ہے دین سر کا دینا گردن پہ اپنی خوباں
جیتے ہیں تو تمھارا یہ قرض ادا کریں گے

درویش ہیں ہم آخر دو اک نگہ کی رخصت
گوشہ میں بیٹھے پیارے تم کو دعا کریں گے

آخر تو روزی آئے دو چار روز ہم بھی
ترسا بچوں میں جا کر دارو پیا کریں گے

عالم مرے ہی تجھ پر آئی اگر قیامت
تیری گلی کے ہر سو محشر ہوا کریں گے

دامانِ دشت سوکھا ابروں کی بے تہی سے
جنگل میں رونے کو اب ہم بھی چلا کریں گے

لائی تری گلی تک آوارگی ہماری
ذلت کی اپنی اب ہم عزت کیا کریں گے

احوال میرؔ کیونکر آخر ہو ایک شب میں
اک عمر ہم یہ قصہ تم سے کہا کریں گے

ترا اے ناتوانی جو کوئی عالم میں رسوا ہے — توانائی کا منہ دیکھا نہیں ان نے کہ کیسا ہے

نیاز ناتواں کیا ناز سرو قد سے بر آوے — مثل مشہور ہے یہ تو کہ دست زور بالا ہے

ابھی اک عمر رونا ہے نہ کھوؤ اشک آنکھوں تم — کرو کچھ سوجھتا اپنا تو بہتر ہے کہ دنیا ہے

کیا اے سایۂ دیوار تو نے مجھ سے رو پنہاں — مرے اب دھوپ میں جلنے ہی کا آثار پیدا ہے

بھلے کو اپنے سب دوڑے ہیں یہ اپنا برا چاہے — چلن اس دل کا تم دیکھو تو دنیا سے نرالا ہے

رہو ٹک در ہی پھرنے دو کوچوں میں مجھے لڑکو — کرو گے تنگ انسے تم اور تو نزدیک صحرا ہے

گلہ سن پیچش کاکل کا مجھ سے یوں لگا کہنے
تو اپنی فصد کر جلدی کہ تجھ کو میر سودا ہے

گزار ابر اب بھی جب کبھو ایدھر کو ہوتا ہے — ہماری بیکسی پر زار باراں دیر روتا ہے

ہوا مذکور نام اس کا کہ آنسو بہ چلے منہ پر — ہمارے کام سارے دیدۂ تر ہی ڈبوتا ہے

بجا ہے سینہ کوبی سنگ سے دل خون ہوتے ہیں — جو ہمدم ایسے جاتے ہیں تو ماتم سخت ہوتا ہے

نہ کی نشو و نما کاہش نہ کام اپنا کیا حاصل — فلک کوئی بھی دل سے تخم کہ بیوقت بوتا ہے

ہلانا ابروؤں کا ہے زیر تیغ عاشق کو — پلک کا مارنا برچھی کلیجے میں چبھوتا ہے

کہاں اے رشک آب زندگی ہے تو کہ یہاں تجھ بن — ہر اک پاکیزہ گوہر جی سے اپنے ہاتھ دھوتا ہے

لگا مرنے کو میرے دیکھ کر وہ ناسمجھ کہنے — جوانی کی ہے نیند اسکو کہ اس غفلت سے سوتا ہے

پریشاں گرد سا گاہے جو ملجاتا ہے صحرا میں — اسی کی جستجو میں خضر بھی اوقات کھوتا ہے

نہ رکھو کان نظم شاعران حال پر اتنے
چلو ٹک میر کو سننے کہ موتی سے پروتا ہے

ہم تو اس کے ظلم سے ہمدم چلے — رہ سکے ہے تو تو رہ یہاں ہم چلے

ٹوٹے جوں لالہ ستاں سے ایک پھول — ہم سے یہاں سے داغ یک عالم چلے

جنبش ابرو تو وہاں رہتی نہیں — کب تلک تلوار یہاں ہر دم چلے

نم جگر کے آیا آخر ہو گئے — اشک خونی کچھ مژہ پر جم چلے

دیکھیے بخت زبوں کیا کیا دکھائے — تم تو خوباں ہم سے ہو برہم چلے

بھاگنے پر بیٹھے تھے گویا غزال — تیری آنکھیں دیکھتے ہی رم چلے

مجھ سے ناشائستہ کیا دیکھا اے میر — آتے آتے کچھ جو آنسو تھم چلے

چشم و ابرو ناز و خوبی زلف و کاکل خال و خط
دیکھئے کیا ہو بلائیں اتنی ہیں دل ایک ہے

کام کچھ دنیا کے آسانی میں ہو تو میر کر
مردن دشوار بھی در پیش منزل ایک ہے

جبتک کہ می اٹھائی گئی ہم کڑے رہے
ایک ایک سخت بات پہ برسوں اڑے رہے

اب کیا کریں نہ صبر ہے دل کو نہ جی میں تاب
کل اس گلی میں آٹھ پہر غش پڑے رہے

وہ گل کو خوب کہتی تھی میں اس کے روکے تئیں
بلبل سے آج باغ میں جھگڑے بڑے رہے

فرہاد و قیس ساتھ کے سب کے چل بسے
دیکھیں نباہ کیونکہ ہوا اب ہم جھڑے رہے

کس کے تئیں نصیب گل فاتحہ ہوئے
ہم سے ہزاروں اس کی گلی میں گڑے رہے

برسوں تلک نہ آنکھ ملی ہم سے یار کی
پھر گو کہ ہم بصورتِ ظاہر اڑے رہے

یعنی کہ اپنے عشق کے حیران کار میر
دیوار کے سے نقش در اوپر کھڑے رہے

شش جہت سے اس میں ظالم بوئے خوں کی راہ ہے
تیرا کوچہ ہم سے تو کہہ کس کی بسمل گاہ ہے

ایک نبھنے کا نہیں مژگاں تلک تو جھل ہیں سب
کاروان لختِ دل ہر اشک کے ہمراہ ہے

ہم جوانوں کو نچھوڑا اس سے سب بگڑی گئے
یہ دو سالہ دخترِ رز کس قدر شتاہ ہے

پا برہنہ خاک سر میں سو پریشاں سینہ چاک
حال میرا دیکھنے آ تیرے ہی دلخواہ ہے

اس جنوں پر میر کوئی بھی پھرے ہے شہر میں
جادۂ صحرا سے کر سازش جو تجھ سے راہ ہے

مشکل ہے ہونا روکش رخسار کی جھلک کے
ہم تو بشر ہیں اس جا پر جلتے ہیں ملک کے

مرتا ہے کیوں تو ناحق یاری برادری پر
دنیا کے سارے ناتے ہیں جیتے جی تلک کے

کہتے ہیں گور میں بھی ہیں تین روز بھاری
جاویں کدھر الٰہی مارے ہوئے فلک کے

لاتے نہیں نظر میں غلطانی گہر کو
ہم معتقد ہیں اپنے آنسو ہی کی ڈھلک کے

کل اک مژہ نچوڑے طوفان نوحؑ آیا
فکر فشار میں ہوں میر آج ہر پلک کے

تا چند ترے غم میں یوں زار رہا کیجے
امید عیادت پر بیمار رہا کیجے

نے اب ہے جگر کاوی نے سینہ خراشی ہے
کچھ جی میں یہ آئے ہے بیکار رہا کیجے

ہم ہوئے، تم ہوئے کہ میر ہوئے
اُس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

جن کی خاطر کی استخوان شکنی
سو ہم اُن کے نشانِ تیر ہوئے

نہیں آتے کسو کی آنکھوں میں
ہو کے عاشق بہت حقیر ہوئے

آگے یہ بے ادائیاں کب تھیں
ان دنوں تم بہت شریر ہوئے

اپنے روتے ہی روتے صحرا کے
گوشے گوشے میں آب گیر ہوئے

قطعہ

ایسی ہستی عدم میں داخل ہے
نے جواں ہم نہ طفلِ شیر ہوئے

ایک دم تھی نمود بود اپنی
یا سفیدی کی یا اخیر ہوئے

یعنی مانندِ صبح دُنیا میں
ہم جو پیدا ہوئے سو پیر ہوئے

مت مل اہلِ دُوَل کے لڑکوں سے
میر جی ان سے مل فقیر ہوئے

توجہ تیری ہی حیرت مری آنکھوں پہ کیا کم ہے
جو میں ہر اک مژہ دیکھوں کہ یہ تر ہے کہ یہ نم ہے

کرے ہے مو پریشاں غم وفا تو تعزیہ تو لے
حیا کر حقِ صحبت کی کہ اس بیکس کا ماتم ہے

دو رنگی دہر کی پیدا ہے یھاں سے دل اٹھا اپنا
کسو کے گھر میں شادی ہے کہیں ہنگامۂ غم ہے

کہیں آشفتگاں سے میر مقصد ہووے ہے حاصل
جو زلفیں اُس کی درہم ہیں مرا بھی کام برہم ہے

جب کہ پہلو سے یار اُٹھتا ہے
درد بے اختیار اُٹھتا ہے

اب تلک بھی مزارِ مجنوں سے
ناتواں اک غبار اُٹھتا ہے

ہے بگولا غبار کس کا میر
کہ جو ہو بیقرار اُٹھتا ہے

کیا مرے سروِ رواں کا کوئی مائل ایک ہے
سیکڑوں ہم خوں گرفتہ ہیں وہ قاتل ایک ہے

راہ سب کو ہے خدا سے جان اگر پہنچا ہے تو
ہوں طریقے مختلف کتنے ہی منزل ایک ہے

اس مرے بت نے سبھوں کو حق سے توڑا اپنا کیا
کام میں اپنے بھی وہ معبودِ باطل ایک ہے

کیا عرب میں کیا عجم میں ایک لیلیٰ کا ہے شور
مختلف ہوں گو عبارات انکا محمل ایک ہے

ایک سے ہے خرمنِ غم دانۂ اشک ایک سے
دیدہ و دل الغرض دونوں کا حاصل ایک ہے

اس شکار افگن کے کوچہ سے نہیں جاتا ہے ظلم
ایک اگر جی سے گیا تو نیم بسمل ایک ہے

اب کے بگڑے گی اگر اُن سے تو اس شہر سے جا
کسو ویرانے میں تکیہ ہی بنا بیٹھیں گے

معرکہ گرم تو ٹک ہونے دو خونریزی کا
پہلے تلوار کے نیچے ہمیں جا بیٹھیں گے

ہوگا ایسا بھی کوئی روز کہ مجلس سے کبھو
ہم تو ایک آدھ گھڑی اُٹھ کے جدا بیٹھیں گے

جا نہ اظہار محبت پہ ہوسناکوں کی
وقت کے وقت یہ سب منہ کو چھپا بیٹھیں گے

دیکھیں وہ غیرتِ خورشید کہاں جاتا ہے
اب سرِ راہ دمِ صبح سے آ بیٹھیں گے

بھیڑ ٹلتی ہی نہیں آگے سے اُس ظالم کے
گردنیں یار کسی روز کٹا بیٹھیں گے

کب تلک گلیوں میں سودائی سے پھرتے رہیے
دل کو اس زلفِ مسلسل سے لگا بیٹھیں گے

شعلہ افشاں اگر ایسی ہی رہی آہ تو میر
گھر کو ہم اپنے کسو رات جلا بیٹھیں گے

نالہ تا آسمان جاتا ہے
شور سے جیسے بان جاتا ہے

دل عجب جائے ہے ولیکن مفت
ہاتھ سے یہ مکان جاتا ہے

کیا خرابی ہے میکدہ کی سہل
محتسب اک جہان جاتا ہے

جب سرِ راہ آوے ہے وہ شوخ
ایک عالم کا جان جاتا ہے

اس سخن ناشنو سے کیا کہیے
غیر کی بات مان جاتا ہے

عشق کے داغ کا عبث ہے علاج
کوئی اب یہ نشان جاتا ہے

گو وہ ہرجائی آئے اپنی اور
سو طرف ہی گمان جاتا ہے

میر گو عمر طبعی کو پہنچا
عشق میں جوں جواں جاتا ہے

مر ہی جاویں گے بہت ہجر میں ناشاد رہے
بھول تو ہم کو گئے ہو یہ تمھیں یاد رہے

ہم سے دیوانے رہیں شہر میں سبحان اللہ
دشت میں قیس رہے کوہ میں فرہاد رہے

کچھ بھی نسبت نہ تھی جب دیر سے تب کیا تھا شیخ
ہم حرم میں بھی رہے تو ترے داماد رہے

دور اتنی تو نہیں شامِ اجل دوری میں
تا سحر ایسی ہی جو زاری و فریاد رہے

سر کو کٹوا ہی چکے میر تڑپ سے تو بچیں
جو ٹک اک پانوں رکھے چھاتی پہ جلاد رہے

جب رونے بیٹھتا ہوں تب کیا کسر رہے ہے
رومال دو دو دن تک جوں ابرِ تر رہے ہے

کیفیت چشماں اب معلوم ہوئی اُنکی
یہ مست ہیں وہ خونی ہشیار رہا کیجے

دل جاؤ تو اب جاؤ ہو خون تو جگر ہووے
اک جان ہے کس کس کا غمخوار رہا کیجے

ہے زیست کوئی یہ بھی جو میر کری ہے تو
ہر آن میں مرنے کو تیار رہا کیجے

طاقت نہیں ہے جی میں نے اب جگر رہا ہے
پھر دل ستم رسیدہ اک ظلم کر رہا ہے

مارا ہے کس کو ظالم اس بے سلیقگی سے
دامن تمام تیرا لوہو میں بھر رہا ہے

پہنچا تھا تیغ کھینچے مجھ تک جو بولے دشمن
کیا مارتا ہے اس کو یہ آپھی مر رہا ہے

آنے کہا ہے میرے خوش قد نے رات گزری
ہنگامۂ قیامت اب صبح پر رہا ہے

چل ہمنشیں کہ دیکھیں آوارہ میر کو ٹک
خانہ خراب وہ بھی آج اپنے گھر رہا ہے

قرار دل کا یہ کاہے کو ڈھنگ تھا آگے
ہمارے چہرے کے اوپر بھی رنگ تھا آگے

اُٹھائیں تیرے لئے بد زبانیاں اُن کی
جنھوں کی ہم کو خوشامد سے ننگ تھا آگے

ہماری آہوں سے سینہ یہ ہو گیا بازار
ہر ایک زخم کا کوچہ جو تنگ تھا آگے

رہا تھا شمع سے مجلس میں دوش کتنا فرق
کہ جل بجھے تھے یہ ہم پر پتنگ تھا آگے

کیا خراب تغافل نے اس کے ورنہ میر
ہر ایک بات پہ دشنام و سنگ تھا آگے

تجھ بن خراب و خستہ زبوں خوار ہو گئے
کیا آرزو تھی ہم کو کہ بیمار ہو گئے

خوبیٔ بخت دیکھ کہ خوبانِ بے وفا
بے ہیچ میرے درپئے آزار ہو گئے

ہم نے بھی سیر کی تھی چمن کی پر اے نسیم
اُٹھتے ہی آشیاں سے گرفتار ہو گئے

وہ تو گلے لگا ہوا سوتا تھا خواب میں
بخت اپنے سو گئے کہ جو بیدار ہو گئے

اپنی یگانگی ہی کیا کرتے ہیں بیاں
اغیار روسیاہ بہت یار ہو گئے

لائی تھی شبخوں پہ بھی خرابی تری نگاہ
بے طالعی سے اپنی وہ ہشیار ہو گئے

کیسے ہیں وے کہ جیتے ہیں صد سال ہم تو میر
اس چار دن کی زیست میں بیزار ہو گئے

تنگ آ گئے ہیں دل اس جی سے اُٹھا بیٹھیں گے
بھوکوں مرتے ہیں کچھ اب یار بھی کھا بیٹھیں گے

صید افگنو ہمارے دل کو جگر کو دیکھو
اک تیر کا ہدف ہے اک تیغ کا سپر ہے
اہلِ زمانہ رہتے اک طور پر نہیں ہیں
ہر آن مرتبے سے اپنے انھیں سفر ہے
کافی ہے مُہر قاتل محضر پہ خوں کے میرے
پھر جس جگہ یہ جاوے اس جا ہی معتبر ہے
تیری گلی سے بچکر کیوں مہر و مہ نہ نکلیں
ہر کوئی جانتا ہے اس راہ میں خطر ہے

وے دن گئے کہ آنسو روتے تھے میر اب تو
آنکھوں میں لختِ دل ہے یا پارۂ جگر ہے

شب شمع پر پتنگ کے آنے کو عشق ہے
اس دل جلے کی تاب کے لانے کو عشق ہے
سر مار مار سنگ سے مردانہ جی دیا
فرہاد کے جہان سے جانے کو عشق ہے
اٹھیو سمجھ کے جا سے کہ مانندِ گرد باد
آوارگی سے تیری زمانے کو عشق ہے
بس اے سپہر سعی سے تیری تو روز و شب
یہاں غم ستانے کو ہی جلانے کو عشق ہے
بیٹھی جو تیغ یار تو سب تجھ کو کھا گئی
اے سینے تیرے زخم اٹھانے کو عشق ہے
اک دم میں تو نے پھونک دیا دو جہاں تئیں
اے عشق تیرے آگ لگانے کو عشق ہے

سودا ہو تب ہو میر کو تو کریے کچھ علاج
اس تیرے دیکھنے کے دِوانے کو عشق ہے

جب سے اس بیوفا نے بال رکھے
صید بندوں نے جال ڈال رکھے
ہاتھ کیا آوے وہ کمر ہے ہیچ
یوں کوئی جی میں کچھ خیال رکھے
رہروِ راہِ خوفناکِ عشق
چاہیئے پاؤں کو سنبھال رکھے
پہنچے ہر اک نہ درد کو میرے
وہ ہی جانے جو ایسا حال رکھے
ایسے زر دست ہو تو خیر ہے اب
ملے اس سے جو کوئی مال رکھے
بحث ہے ناقصوں سے کاش فلک
مجھکو اس زمرہ سے نکال رکھے

سمجھے اندازِ شعر کو میرے
میر کا سا اگر کمال رکھے

یہاں جو وہ نونہال آتا ہے
جی میں کیا کیا خیال آتا ہے
اس کے چلنے کی آن کا بے حال
مدتوں میں بحال آتا ہے
یہ تو گزرا قفس ہی میں دیکھیں
اب کی کیسا یہ سال آتا ہے

آہِ سحر کی میری برچھی کے وسوسے سے — خورشید کے منہ اوپر اکثر سپر رہے ہے
آگہ تو رہیے اُس کی طرزِ رہ و روش سے — آنے میں اُس کے لیکن کس کو خبر رہے ہے
ان روزوں اتنی غفلت اچھی نہیں ادھر سے — اب اضطراب ہم کو دو دو پہر رہے ہے
آبِ حیات کی سی ساری روش ہے اُسکی — پر جب وہ اُٹھ چلے ہے ایک آدھ مر رہے ہے
تلوار اب لگا ہے بیڈدل پاس رکھنے — خون آجکل کسو کا وہ شوخ کر رہے ہے
در سے کبھو جو آتے دیکھا ہے میں نے اُس کو — تب سے اُدھر ہی اکثر میری نظر رہے ہے
آخر کہاں تلک ہم اک روز ہو چکیں گے — برسوں سے وعدۂ شب ہر صبح پر رہے ہے

میر اب بہار آئی صحرا میں چل جنوں کر
کوئی بھی فصلِ گل میں نادان گھر رہے ہے

نالے کا آج دل سے پھر لب تلک گزر ہے — ٹک گوش رکھیو ایدھر ساتھ اُس کے کچھ خبر ہے
اے حُبِّ جاہ والو جو آج تاجور ہے — کل اُس کو دیکھیو تم نے تاج ہے نہ سر ہے
اب کی ہوائے گل میں سیرابی ہے نہایت — جوئے چمن پہ سبزہ مژگانِ چشمِ تر ہے
اے ہمصفیر بے گل کس کو دماغ نالہ — مدت ہوئی ہماری منقار زیرِ پر ہے
شمعِ اخیرِ شب ہوں سن سرگزشت میری — پھر صبح ہونے تک تو قصہ ہی مختصر ہے
اب رحم پر اُسی کے موقوف ہے کہ یاں تو — نے اشک میں سرایت نے آہ میں اثر ہے
تو ہی زمام اپنی ناقے تڑا کہ مجنوں — مدت سے نقشِ پا کے مانند راہ پر ہے
ہم مستِ عشق واعظ بے ہیچ بھی نہیں ہیں — غافل جو بیخبر ہیں کچھ اُن کو بھی خبر ہے
اب پھر ہمارا اُس کا محشر میں ماجرا ہے — دیکھیں تو اس جگہ کیا انصاف داد گر ہے
آفت رسیدہ ہم کیا سر کھینچیں اس چمن میں — جوں نخلِ خشک ہم کو نے سایہ نے ثمر ہے

کر میر اس زمیں میں اور اک غزل تو موزوں
ہے حرف زن قلم بھی اب طبع بھی ادھر ہے

ڈھونڈا نہ پائیے جو اس وقت میں سو زر ہے — پھر چاہ جس کی مطلق ہے ہی نہیں ہنر ہے
ہر دم قدم کو اپنے رکھ احتیاط سے یاں — یہ کارگاہ ساری دکانِ شیشہ گر ہے
ڈھاہا جنوں نے اُس کو ان پر خرابی آئی — جانا گیا اسی سے دل بھی کسو کا گھر ہے
تجھ بن شکیب کب تک بے فائدہ ہوں نالاں — مجھ نالہ کش کے تو اے فریاد رس کدھر ہے

تمنائے دل کیلئے جان دی / سلیقہ ہمارا تو مشہور ہے
نہو کس طرح فکر انجام کار / بھروسے ہے جس پر سو مغرور ہے
پلک کی سیاہی میں ہے وہ نگاہ / کسو کا مگر خون منظور ہے
دل اپنا نہایت ہے نازک مزاج / گرا گر یہ شیشہ تو پھر چور ہے
کہیں جو تسلی ہوا ہو یہ دل / وہی بیقراری بدستور ہے
نہ دیکھا کہ لوہو تھنبا ہو کبھو / مگر چشم خونبار ناسور ہے
تنک[1] گرم تو سنگریزے کو دیکھا / نہاں اس میں بھی شعلۂ طور ہے
بہت سعی کرئے تو مر رہئے میر / بس اپنا تو اتنا ہی مقدور ہے

اب میر جی تو اچھے زندیق ہی بن بیٹھے / پیشانی پہ دے قشقہ زنار پہن بیٹھے
آزردہ دل الفت ہم چپکے ہی بہتر ہیں / سب رو اٹھیگی مجلس جو کر کے سخن بیٹھے
عریان پھریں کبتک ای کاش کہیں آکر / تہ گرد بیاباں کی بالائے بدن بیٹھے
پیکان خدنگ اس کا یوں سینہ کے اودھر ہے / جوں مار سیہ کوئی کاڑھے ہوئے پھن بیٹھے
جز خط کے خیال اس کے کچھ کام نہیں ہم کو / سبزی پیئے ہم اکثر رہتے ہیں مگن بیٹھے
شمشیر ستم اسکی اب گو کہ چلے ہر دم / شوریدہ سر اپنے سے ہم باندھ کفن بیٹھے
بس ہو تو ادھر اودھر یوں پھرنے نہ دیں تجھ کو / ناچار ترے ہم یہ دیکھیں ہیں چلن بیٹھے

نہ تنہا داغ تو سینے پہ میرے اک چمن نکلے / ہر اک لخت جگر کے ساتھ سوز خم کہن نکلے
گماں کب تھا یہ پروانہ پر اتنا شمع روئیگی / کہ مجلس میں سے جس کے اشک کے بھر بھر لگن نکلے
کہاں تک نازبرداری کروں شام غریباں کی / کہیں گرد سفر سے جلد بھی صبح وطن نکلے
جنوں ان شورشوں پر ہاتھ کی چالاکیاں ایسی / میں ضامن ہوں اگر ثابت بدن سے پیرہن نکلے
حرم میں میر جتنا بت پرستی پر ہے تو مائل / خدا ہی ہو تو اتنا بتکدے میں برہمن نکلے

[1] یہ شعر قدیم مطبوعہ و قلمی نسخوں میں اسی طرح ہے مجبوراً بحالہ رکھا گیا ممکن ہے کہ دیکھا کے بجائے دیکھو ہو ۱۲ آسی

شیخ کی تو نماز پرست جا | بوجھ سر کا سا ڈال آتا ہے

آرسی کے بھی گھر میں شرم سے میر
کم ہی وہ بے مثال آتا ہے

پیری میں کیا جوانی کے موسم کو روئیے | اب صبح ہونے آئی ہے اک دم تو سوئیے
رخسار اس کے ہائے رے جب دیکھتے ہیں ہم | آتا ہے جی میں آنکھوں کو ان میں گڑوئیے
اخلاص دل سے چاہیے سجدہ نماز میں | بیفائدہ ہے ورنہ جو یوں وقت کھوئیے
کس طور آنسوؤں میں نہاتے ہیں غم کشاں | اس آب گرم میں تو نہ انگلی ڈبوئیے
مطلب کو تو پہنچتے نہیں اندھے کے سے طور | ہم مارتے پھرے ہیں یونہیں پٹکر ٹوئیے
اب جان جسم خاک سے تنگ آگئی بہت | کبتک اس ایک ٹوکری مٹی کو ڈھوئیے

آلودہ اس گلی کے جو ہوں خاک سے تو میر
آب حیات سے بھی نہ وے پانوں دھوئیے

شب گئے تھے باغ میں ہم ظلم کے مارے ہوئے | جان کو اپنی گل مہتاب انگارے ہوئے
گور پر میری پس از مدت قدم رنجہ کیا | خاک میں مجھ کو ملا کر مہرباں بارے ہوئے
آستینیں رکھتے رکھتے دیدۂ خونبار پر | حلق بسمل کی طرح لوہو کے فوارے ہوئے
وعدے ہیں سارے خلاف و حرف ہیں یکسر فریب | تم لڑکپن میں کہاں سے ایسے عیارے ہوئے
پھرتے پھرتے عاقبت آنکھیں ہماری مند گئیں | سو گئے بیہوش تھے ہم راہ کے مارے ہوئے
پیار کرنے کا جو خوباں ہم پہ رکھتے ہیں گناہ | ان سے بھی تو پوچھتے تم اتنے کیوں پیارے ہوئے
تم جو ہم سے مل چلے ٹک رشک سب کرنے لگے | مہرباں جتنے تھے اپنے مدعی سارے ہوئے
آج میرے خون پر اصرار ہر دم ہے تمھیں | آئی ہو کیا جانیے تم کس کے سنکارے ہوئے
لیتے کروٹ ہل گئے جو کان کے موتی ترے | شرم سے سر در گریباں صبح کے تارے ہوئے

استخواں بھی رہ گئے تھے یہاں غم خونریز میر
دانتے پڑکر تھے اس شوخ کے آرے ہوئے

کرے کیا کہ دل بھی تو مجبور ہے | زمیں سخت ہے آسماں دور ہے
جرس راہ میں جملہ تن شور ہے | مگر قافلے سے کوئی دور ہے

لہ سعدی — دوستاں منع کنندم کہ چرا دل بتو دادم ۔ باید اول بتو گفتن کہ چنیں خوب چرائی

قبرِ عاشق پر مقرر روز آنا کیجیے
جو گیا ہو جان سے اُس کو بھی جانا کیجیے

رات دارو پیجیے غیروں میں بے لیت و لعل
یہاں سحر سر دُکھنے کا ہم سے بہانا کیجیے

ٹک تمھارے ہونٹھ کے ہلنے سے یہاں ہوتا ہے کام
اتنی اتنی بات جو ہووے تو مانا کیجیے

گوشۂ چشمِ بتاں یا کنجِ لب اس وقت میں
جا کہیں ہو تو دل اپنے کا ٹھکانا کیجیے

سیکھیے غیروں کے ہاں چھپ چھپ کے علمِ تیر بھی
سارے عالم میں ہمارے تئیں نشانا کیجیے

رفتہ رفتہ قاصدوں کو رنجگی اس سے ہوئی
جی میں ہے اب کی مقرر اپنا جانا کیجیے

نکلے ہے آنکھوں سے تو گردِ کدورت جائے اشک
تا کجا تیری گلی میں خاک چھانا کیجیے

آبشار آنے لگے آنسو کی پلکوں سے تو میر
کب تلک یہ آب چادر منھ پہ تانا کیجیے

ہوش جاں پوچھیں ٹک ہجراں میں گر مر جائیے
اب کہو اس شہرِ ناپرساں سے کیدھر جائیے

کام دل کا کچھ ٹھکانا ہی نہیں کیونکر بنے
آئیے تا چند و ناامید پھر کر جائیے

مضطرب اس آستاں سے اُٹھ کے کچھ پایا نہ رو
منھ رہا ہے کیا جو پھر اب اس کے در پہ جائیے

بعدِ طوفِ قیس ہو جی زائرِ فرہاد بھی
دشت سے اٹھیے تو کوہوں میں مقرر جائیے

شوق تھا جو یار کے کوچے ہمیں لایا تھا میر
پاؤں میں طاقت کہاں اتنی کہ اب گھر جائیے

غالب کہ یہ دلِ خستہ شبِ ہجر میں مر جائے
یہ رات نہیں وہ جو کہانی میں گزر جائے

ہے طرفہ مفتن نگہ اُس آئینہ رو کی
اک پل میں کرے سیکڑوں خوں اور مکر جائے

نہ بتکدہ ہے منزلِ مقصود نہ کعبہ
جو کوئی تلاشی[۱] ہو ترا آہ کدھر جائے

ہر صبح تو خورشید ترے منھ پہ چڑھے ہے
ایسا نہ ہو یہ سادہ کہیں جی سے اُتر جائے

یاقوت کوئی ان کو کہے ہے کوئی گلبرگ
ٹک ہونٹھ ہلا تو بھی کہ اک بات ٹھہر جائے

ہم تازہ شہیدوں کو نہ آ دیکھنے نازاں
دامن کی ترے زہ کہیں لوہو میں نہ بھر جائے

گریے کو مرے دیکھ ٹک اک شہر کے باہر
اک سطح ہے پانی کا جہاں تک کہ نظر جائے

مت بیٹھ بہت عشق کے آزردہ دلوں میں
نالہ کسو مظلوم کا تاثیر نہ کر جائے

اس ورطے سے تختہ جو کوئی پہنچے کنارے
تو میر وطن میرے بھی شاید یہ خبر جائے

۱ تلاشی ترکی لغت ہے بمعنی تلاش کرنے والا اور جو تلاشی کے معنی پر تلاشی استعمال کرتے ہیں غلط ہے ۱۲ آسی

قصد گر امتحان ہے پیارے
اب تلک نیم جان ہے پیارے

سجدہ کرنے میں سر کٹیں ہیں جہاں
سو ترا آستان ہے پیارے

گفتگو ریختے میں ہم سے نہ کر
یہ ہماری زبان ہے پیارے

کام میں قتل کے مرے تن دے
اب تلک مجھ میں جان ہے پیارے

چھوڑ جاتے ہیں دل کو تیرے پاس
یہ ہمارا نشان ہے پیارے

شکلیں کیا کیا کیاں ہیں جنکی خاک
یہ وہی آسمان ہے پیارے

جا چکا دل تو یہ یقینی ہے
قطعہ کیا اب اس کا بیان ہے پیارے

پر تبسم کے کرنے سے تیرے
کنج لب پر گمان ہے پیارے

میر عمداً بھی کوئی مرتا ہے
جان ہے تو جہان ہے پیارے

کل وعدہ گاہ میں سے جوں توں کر ہم کو لائے
ہونٹھوں پہ جان آئی پر آہ وے نہ آئے

زخموں پہ زخم جھیلے داغوں پہ داغ کھائے
یک قطرہ خونِ دل نے کیا کیا ستم اٹھائے

اُس کی طرف کو ہم نے جب نامہ بر چلائے
اُن کا نشاں نہ پایا خط راہ میں سے پائے

خوں بستہ جب تلک تھیں دریا رکے کھڑے تھے
آنسو گرے کروڑوں پلکوں کے ٹک ہلائے

اس جنگجو کے زخمی اچھے نہ ہوتے دیکھے
گل جب چمن میں آئے زخم اپنے سب دکھائے

بڑھتیں نہیں پلک سے تا ہم تلک بھی پہنچیں
پھرتی ہیں وے نگاہیں پلکوں کے سائے سائے

پر کی بہار میں جو محبوب جلوہ گر تھے
سو گردشِ فلک نے سب خاک میں ملائے

ہر قطعۂ چمن پر ٹک گاڑ کر نظر کر
بگڑیں ہزار شکلیں تب پھول یہ بنائے

یک حرف کی بھی مہلت ہم کو نہ دی اجل نے
تھا جی میں آہ کیا کیا پر کچھ نہ کہنے پائے

چھاتی سیراہ اُن کی پائیز میں جنھوں نے
خار و خسِ چمن سے ناچار دل لگائے

آگے بھی تجھ سے تھا یاں تصویر کا سا عالم
بیدردیِ فلک نے وے نقش سب مٹائے

مدت ہوئی تھی بیٹھے جوش و خروشِ دل کو
ٹھوکر نے اُس کی تہ کی آشوب پھر اٹھائے

اعجاز عشق ہی سے جیتے رہے وگرنہ
کیا حوصلہ کہ جس میں آزار یہ سمائے

دل گرمیاں انھیں کی غیروں سے جب نہ تب تھیں
مجلس میں جب گئے ہم غیرت نے جی جلائے

جیتے تو میر ہر شب اس طرز سے گذری
پھر گور پر ہماری بے شمع گو کہ آئے

تڑپنا بھی دیکھا نہ بسمل کا اپنے — میں کشتہ ہوں اندازِ قاتل کا اپنے

نہ پوچھو کہ احوال ناگفتہ بہ ہے — مصیبت کے مارے ہوئے دل کا اپنے

دلِ زخم خوردہ کے اور اک لگائی — مداوا کیا خوب گھائل کا اپنے

ٹک ابرو کو میری طرف کیجے مائل — کبھو دل بھی رکھ لیجے مائل کا اپنے

ہوا فیسِ قیس آخر ابھی یہاں — سخن ہے جنوں کے اوائل کا اپنے

پہنائیں رکھیں میں نے عالم میں کیا کیا — ہوں بندہ خیالاتِ باطل کا اپنے

مقامِ فنا واقعے میں جو دیکھا
اثر بھی نہ تھا گورِ منزل کا اپنے

جب تک کہ ترا گزر نہ ہووے — جادہ مری گور پر نہ ہووے

لے تیغ و سپر کو تو جدھر ہو — خورشید کا منھ اُدھر نہ ہووے

رونے کی ہے جا کہ آہ کریے — پھر دل میں ترے اثر نہ ہووے

بیمار رہے ہیں اس کی آنکھیں — دیکھو کسو کی نظر نہ ہووے

رکتی نہیں تیغ نالہ ہرگز — جب تک کہ جگر سپر نہ ہووے

کر بے خبر اک نگہ سے ساقی — لیکن کسو کو خبر نہ ہووے

خستے ترے موئے عنبریں کے — کیونکر جئیں صبر گر نہ ہووے

رکھ دیکھ کے راہِ عشق میں پائے
یہاں میرؔ کسو کا سر نہ ہووے

رات گزری ہے مجھے نزع میں روتے روتے — آنکھیں پھر جائیں گی اب صبح کے ہوتے ہوتے

کھول کر آنکھ اُڑا دید[1] جہاں کا غافل — خواب ہو جائیگا پھر جاگنا سوتے سوتے

جم گیا خوں کفِ قاتل پہ ترا میرؔ زبس
اُن نے رو رو دیا کل ہاتھ کو دھوتے دھوتے

یعقوبؑ کے نہ کلبۂ احزاں تلک گئے — سو کاروانِ مصر سے کنعاں تلک گئے

بارے نسیمِ ضعف سے کل ہم اسیر بھی — سناٹے[2] میں جی کے گلستاں تلک گئے

[1] دید۔ میرؔ کے زمانہ تک مختلف فیہ تھا۔ چنانچہ سوداؔ کا یہ شعر۔ تمھارے چہرہ کو دیکھا ہے جب سے خوبان نے ؛ کیا ہے دید مقرر طلاق آئینہ کا اب مونث مستعمل ہے۔۱۲۔ [2] سناہٹا۔ اب بغیر (ہ) کے بولا جاتا ہے اور فصحا اسی کو فصیح جانتے ہیں۔ آسی

ہم نے جانا تھا سخن ہونگے زباں پر کتنے — پر قلم ہاتھ جو آئی لکھے دفتر کتنے

میں نے اُس قطعۂ صناع سے سر کھینچا ہے — کہ ہر اک کوچے میں جس کے تھے ہنرور کتنے

کشورِ عشق کو آباد نہ دیکھا ہم نے — ہر گلی کوچہ میں اوجڑ پڑے تھے گھر کتنے

آہ نکلی ہے یہ کس کی ہوس سیر بہار — آتے ہیں باغ میں آوارہ ہوئے پر کتنے

دیکھیو پنجۂ مژگاں کی ٹک آتش دستی — ہر سحر خاک میں ملتے ہیں دُرِ تر کتنے

کب تلک یہ دل صد پارہ نظر میں رکھئے — اس پر آنکھیں ہی سئے رہتے ہیں دلبر کتنے

عمر گزری کہ نہیں دودۂ آدم سے کوئی — جس طرف دیکھئے عرصہ میں ہیں ابتر کتنے

تو ہے بیچارہ گدا میرؔ ترا کیا مذکور
مل گئے خاک میں یہاں صاحبِ افسر کتنے

آہ جس وقت سر اُٹھاتی ہے — عرش پر برچھیاں چلاتی ہے

ناز بردار لب ہے جاں جب سے — تیرے خط کی خبر کو پاتی ہے

اے شبِ ہجر راست کہہ تجھ کو — بات کچھ صبح کی بھی آتی ہے

چشمِ بد دور چشمِ تر ای میرؔ
آنکھیں طوفان کو دکھاتی ہے

طاقت نہیں ہے دل میں نے جی بجا رہا ہے — کیا ناز کر رہے ہو اب ہم میں کیا رہا ہے

جیب اور آستیں سے رونے کا کام گزرا — سارا نچوڑ اب تو دامن پر آ رہا ہے

اب چیت گر نہیں کچھ تازہ ہوا ہوں بیکل — آیا ہوں جب بخود میں جی اس میں جا رہا ہے

کاہے کا پاس اب تو رسوائی دور پہنچی — رازِ محبت اپنا کس سے چھپا رہا ہے

گرد رہ اُس کی یارب کس اور سے اُٹھے گی — سو سو غزال ہر سو آنکھیں لگا رہا ہے

بندے تو طرحدار وہیں طرح کش تمہارے — پھر چاہتے ہو کیا تم اب اک خدا رہا ہے

دیکھ اس دہن کو ہر دم ای آرسی کہ یوں ہی — خوبی کا در کسو کی منہ پر بھی وا رہا ہے

دے لطف کی نگاہیں پہلے فریب ہیں سب — کس سے وہ بیمروت پھر آشنا رہا ہے

اتنا خزاں کرے ہے کب زرد رنگ پر یاں — تو بھی کسو نگہ سے اے گل جدا رہا ہے

رہتے ہیں داغ اکثر نان و نمک کی خاطر — جینے کا اس سمجھ میں اب کیا مزا رہا ہے

اب چاہتا نہیں ہے بوسہ جو تیرے لب سے — جینے سے میرؔ شاید کچھ دل اٹھا رہا ہے

ترا آنا ہی اب مرکوز ہی ہم کو دمِ آخر
یہ جی صدقے کیا تھا پھر نہ آوے تن میں یا آوے

یہ رسمِ آمد و رفتِ دیارِ عشق تازہ ہے
ہنسی وہ جائے میری اور رونا یوں چلا آوے

اسیری نے چمن سے میرے دل گرمی کو دھو ڈالا
وگرنہ برق جاکر آشیاں میرا جلا آوے

امیدِ رحم اُن سے سخت نافہمی ہی عاشق کی
یہ بت سنگیں دلی اپنی نہ چھوڑیں گر خدا آوے

یہ فنِ عشق ہی آوے اُسے طینت میں جس کی ہو
تو زاہد پیرِ نابالغ ہی بے تہ تجھ کو کیا آوے

ہمارے دل میں آنے سے تکلف غم کو بیجا ہی
یہ دولت خانہ ہی اُس کا وہ جب چاہی چلا آوے

ہر رنگ بوئے غنچہ عمر اک ہی رنگ میں گزرے
میسر میر صاحب گر دلِ بے مدعا آوے

گو ننگ اُس کو آوے ہی عاشق کے نام سے
ہی میر کام میرے تئیں اپنے کام سے

دردِ صفر ہی خوب پیئیں جس میں صاف مے
کیا میکشوں کو اوّل ماہِ صیام سے

پڑھتے نہیں نماز جنازہ یہ اُس کے میر
دل میں غبار جس کے ہو خاکِ امام سے

اچنبھا ہی اگر چپکا رہوں مجھ پر عتاب آوے
وگر قصہ کہوں اپنا تو سنتے اُس کو خواب آوے

بھرا ہی دل مرا جامِ لبالب کی طرح ساقی
گلے لگ خوب روؤں میں جو مینائے شراب آوے

بغل پروردہ طوفاں ہوں میں یہ موج ہی میری
بیاباں میں اگر روؤں تو شہروں میں بھی آب آوے

لپیٹا ہی دلِ سوزاں کو اپنے میر نے خط میں
الٰہی نامہ بر کو اُس کے لیجانے کی تاب آوے

حصول کام کا دل خواہ یہاں ہوا بھی ہی
سماجت اتنی بھی سب سے کوئی خدا بھی ہی

موئے ہی جاتے ہیں ہم دردِ عشق سے یارو
کسو کے پاس اس آزار کی دوا بھی ہی

اُداسیاں تھیں مری خانقہ میں قابلِ سیر
صنم کدہ میں تو ٹک آ کے دل لگا بھی ہی

یہ کہئے کیونکہ کہ خوباں سے کچھ نہیں مطلب
لگے جو پھرتے ہیں ہم کچھ تو مدعا بھی ہی

ترا ہی وہم کہ میں اپنے پیرہن میں ہوں
نگاہ غور سے کر مجھ میں کچھ رہا بھی ہی

جو کھولوں سینۂ مجروح تو نمک چھڑکے
جراحت اُس کو دکھانے کا کچھ مزا بھی ہی

کہاں تلک شب و روز آہ دردِ دل کہئے
ہر ایک بات کو آخر کچھ انتہا بھی ہی

ہوس تو دل میں ہمارے جگہ کرے لیکن
کہیں ہجوم سے اندوہِ غم کی جا بھی ہی

رہنے نہ دیں گے دشت میں مجنوں کو چین سے — گر ہم جنوں کے مارے بیاباں تلک گئے

کو موسمِ شباب کہاں گل کسے دماغ — بلبل وہ چہچہے انھیں یاراں تلک گئے

کچھ آبلے دیئے تھے رہ آوردِ عشق نے — سو رفتہ رفتہ خارِ مغیلاں تلک گئے

پھاڑا تھا جیب پی کے مئے شوق میں نے میر
مستانہ چاک لوٹتے داماں تلک گئے

جن جن کو تھا یہ عشق کا آزار مر گئے — اکثر ہمارے ساتھ کے بیمار مر گئے

ہوتا نہیں ہے اُس لب نوخط پہ کوئی سبز — عیسیٰ و خضر کیا سبھی یکبار مر گئے

یوں کانوں کان گل نے نہ جانا چمن میں آہ — سر کو پٹک کے ہم پسِ دیوار مر گئے

صد کارواں وفا ہے کوئی پوچھتا نہیں — گویا متاعِ دل کے خریدار مر گئے

مجنوں نہ دشت میں ہے نہ فرہاد کوہ میں — تھا جن سے لطفِ زندگی وے یار مر گئے

افسوس وے شہید کہ جو قتلگاہ میں — لگتے ہی اُس کے ہاتھ کی تلوار مر گئے

تجھ سے دوچار ہوئیگی حسرت کے مبتلا — جب جی ہوئے وبال تو ناچار مر گئے

گھبرا نہ میر عشق میں اس سہل زیست پر
جب بس چلا نہ کچھ تو مرے یار مر گئے

تمام اُس کے قد میں سناں کی طرح ہے — رنگیلی نپٹ اس جواں کی طرح ہے

بُرے ہو نا احوال کو سُن کے میرے — بھلا تو ہی کہہ یہ کہاں کی طرح ہے

قطعہ

اُڑی خاک گاہے رہی گاہ ویراں — خراب و پریشاں یہاں کی طرح ہے

تعلق کرو میر اس پر جو چاہو
مری جان یہ کچھ جہاں کی طرح ہے

محمل کے ساتھ اُس کے بہت شور میں گئے — نالوں نے میرے ہوش جرس کے اُڑا دیے

فصاد خوں فساد یہ ہے مجھ سے ان دنوں — نشتر نہ تو لگا دے تو میرا لہو پیے

صوتِ جرس کی طرز بیاباں میں ہائے میر
تنہا چلا ہوں میں دلِ پر شور کو لیے

کہاں تک غیر جاسوسی کے لینے کو لگا آوے — الٰہی اس بلائے ناگہاں پر بھی بلا آوے

رُکا جاتا ہے جی اندر ہی اندر آج گرمی سے — بلا سے چاک ہی ہو جاوے سینہ ٹک ہوا آوے

تقریب ہم نے ڈالی ہے اُس سے جوئی کی اب — جو بن پڑے ہے ٹک تو ہمارا ہی داؤ ہے
ٹپکا کرے ہے آنکھ سے لوہو ہی روز و شب — چہرے پہ میرے چشم ہے یا کوئی گھاؤ ہے
ضبطِ سرشکِ خونیں سے جی کیونکہ شاد ہو — اب دل کی طرف لوہو کا سارا بہاؤ ہے
اب سب کے روزگار کی صورت بگڑ گئی — لاکھوں میں ایک دو کا کہیں کچھ بناؤ ہے
چھاتی کے میری سارے نمودار ہیں یہ زخم — پردہ رہا ہے کونسا اب کیا چھپاؤ ہے

عاشق کہیں جو ہوگے تو جانوگے قدر میر
اب تو کسی کے چاہنے کا تم کو چاؤ ہے

جہاں میں روز ہے آشوب اُس کی قامت سے — اُٹھے ہے فتنہ ہر اک شوخ تر قیامت سے
موا ہوں ہو کے دل افسردہ رنج کلفت سے — اُگے ہے سبزۂ پژمردہ میری تربت سے
جہاں ملے تہاں کافر ہی ہونا پڑتا ہے — خدا پناہ میں رکھے بتوں کی صحبت سے
تسلی اُن نے نہ کی ایک دو سخن سے کبھو — جو کوئی بات کہی بھی تو آدھی لکنت سے
پلک کے مارتے ہم تو نظر نہیں آتے — سخن کرو ہو عبث تم ہماری فرصت سے
امیرزادوں سے دلی کے مل نہ تا مقدور[۱] — کہ ہم فقیر ہوئے ہیں اُنھیں کی دولت سے
یہ جہل دیکھ کہ ان سمجھے میں اُٹھا لایا — گراں وہ بار جو تھا بیش اپنی طاقت سے
رہا ہوگا بخود صانعِ ازل بھی تب — بنایا ہوگا جب اُس منھ کو دستِ قدرت سے
وہ آنکھیں پھیرے ہی لیتا ہے دیکھتے کیا ہو — معاملت ہے انھیں دل کی بے مروت سے

جو سوچے ٹک تو وہ مطلوب ہم ہی نکلے میر
خراب پھرتے تھے جس کی طلب میں مدت سے

رمق ایک جانِ وبال ہے کوئی دم جو ہے تو عذاب ہے
دلِ داغ گشتہ کباب ہے، جگرِ گداختہ آب ہے
مری خلق محوِ کلام سب مجھے چھوڑتے ہیں خموش کب
مرا حرف رشکِ کتاب ہے مری بات لکھنے کا باب ہے
جو وہ لکھتا کچھ بھی تو نامہ بر کوئی رہتی منھ میں ترے نہاں
تری خامشی سے یہ نکلے ہے کہ جواب خط کا جواب ہے

[۱] میر تقی میر دہلوی ؎ مت مل اہلِ دُوَل کے لڑکوں سے ۔ میر جی اُن سے مل فقیر ہوئے۔

غمِ فراق ہی دُنبالہ گردِ عیشِ وصال
فقط مزا ہی نہیں عشق میں بلا بھی ہی

قبول کریے تری رہ میں جی کو کھو دینا
جو کچھ بھی پایئے تجھ کو تو آشنا بھی ہی

جگر میں سوزنِ مژگاں کے تئیں کدھب گڑا
کسو کے زخم کو تو نے کبھو سیا بھی ہی

گزار شہرِ وفا میں سمجھ کے کر مجنوں
کہ اس دیار میں میرؔ شکستہ پا بھی ہے

بسکہ دیوانگی حال میں چالاک ہوئے
سو گریبان مرے ہاتھ سے یہاں چاک ہوئے

سر گرے پانوں پہ قاتل کے کٹائی گردن
اپنے ذمہ سے تو صد شکر کہ ہم پاک ہوئے

پائمالی سے فراغت ہی نہیں میرؔ ہمیں
کوئے دلبر میں عبث آن کے ہم خاک ہوئے

صید افگنوں سے ملنے کی تدبیر کریں گے
اس دل کے تئیں پیشکشِ تیر کریں گے

فریاد اسیرانِ محبت نہیں بے ہیچ
یہ نالے کسو دل میں بھی تاثیر کریں گے

دیوانگی کی شورشیں دکھلائیں گی بلبل
آتی ہی بہار اب ہمیں زنجیر کریں گے

وا اس سے سرِ حرف تو ہو گو کہ یہ سر جائے
ہم حلق بریدہ ہی یہ تقریر کریں گے

رسوائی عاشق سے تسلی نہیں خوباں
مر جاویگا تو نعش کو تشہیر کریں گے

یارب وہ بھی دن ہوئیگا جو مصر سے چل کر
کنعاں کی طرف قافلے شب گیر کریں گے

شب دیکھی ہی زلف اُس کی بجز دام اسیری
کیا یار اب اس خواب کی تعبیر کریں گے

غصے میں تو ہو دیگی توجہ تری ایدھر
ہر کام میں ہم جان کے تقصیر کریں گے

نکلا نہ مناجاتیوں سے کام کچھ اپنا
اب کوئی خراباتی جواں پیر کریں گے

بازیچہ نہیں میرؔ کے احوال کا لکھنا
اس قصہ کو ہم کرتے ہی تحریر کریں گے

دل کی طرف کچھ آہ سے دل کا لگاؤ ہی
ٹک آپ بھی تو آیئے یہاں زور باؤ ہی

اُٹھتا نہیں ہی ہاتھ ترا تیغ جور سے
ناحق کشی کہاں تئیں یہ کیا سبھاؤ ہی

باغِ نظر ہی چشم کی منظر کا سب یہاں
ٹک ٹھہرو یہاں تو جانو کہ کیسا دکھاؤ ہی

سلہ سودا دہلوی — سمجھ کے رکھیو قدم دشتِ خار میں مجنوں ؛ کہ اس نواح میں سودا برہنہ پا بھی ہی

۵۔ غصے میں ترے ہم نے عجب لطف اُٹھایا ؛ اب تو عمداً اور بھی تقصیر کریں گے ۔ ۱۲

خون ہر ایک رقم شوق سے ٹپکے تھا و لے
وہ نہ سمجھا کہ مرے نامہ کا کیا مضمون ہے

میر کی بات پہ ہر وقت یہ جھنجھلایا نہ کر
سٹری ہے خبطی ہے وہ شیفتہ ہے مجنوں ہے

کہنا ترے منھ پر تو نپٹ بے ادبی ہے
زاہد جو صفت تجھ میں ہے سو زن جلبی ہے

اس دشت میں اے سیل سنبھل ہی کے قدم رکھ
ہر سمت کو یہاں دفن مری تشنہ لبی ہے

ہر اک[1] سے کہا نیند میں پر کوئی نہ سمجھا
شاید کہ مرے حال کا قصہ عربی ہے

عزلت سے نکل شیخ کہ تیرے لئے تیار
کوئی ہفت گزی ہیچ کوئی دہ وجبی ہے

اے چرخ نہ تو روزِ سیہ میر پہ لانا
بیچارہ وہ اک نعرہ زنِ نیم شبی ہے

دو سونپ دودِ دل کو میرا کوئی نشاں ہے
ہوں میں چراغِ کشتہ بادِ سحر کہاں ہے

بیٹھا جگر سے اپنے کھینچوں ہوں اسکی پیکاں
جینے کی اور سے تو خاطر مری نگراں ہے

روشن ہے جل کے مرنا پروانے کا و لیکن
اے شمع کچھ تو کہہ تو تیرے بھی تو زباں ہے

بھڑکے ہے آتشِ گل اے ابرِ تر ترحم
گوشے میں گلستاں کے میرا ابھی آشیاں ہے

ہم زمزمہ تو ہو کے مجھ نالہ کش سے چپ رہ
اے عندلیب گلشن تیرا لب و دہاں ہے

کس دور میں اٹھایا مجھ سینہ سوختہ کو
پیوند ہو زمیں کا جیسا یہ آسماں ہے

پیرِ مغاں سعادت تیری جو ایسا آوے
یہ میر میکشوں میں اک طرز کا جواں ہے

ہمسایۂ چمن یہ نپٹ زار کون ہے
نالان و مضطرب پسِ دیوار کون ہے

مژگاں بھی پھر گئیں تری بیمارِ چشم دیکھ
دکھ درد میں سوائے خدا یار کون ہے

نالے جو آج سنتے ہیں سو ہیں جگر خراش
کیا جانئے قفس میں گرفتار کون ہے

آیا نہ آشیانۂ بلبل میں کام بھی
مجھ سا تو خار باغ میں بیکار کون ہے

بازارِ دہر میں ہے عبث میر عرضِ مہر
یہاں ایسی جنس کا تو خریدار کون ہے

[1] فیضی سے کہ اہلِ بزم عامند گفتگو عربی است ۱۲

رہے حال دل کا جو ایک سا تو رجوع کرتے کہیں بھلا
سو تو یہ کبھو ہمہ داغ ہی کبھو نیم سوز کباب ہے

کہیں گے کہو تمھیں لوگ کیا یہی آرسی یہی تم سدا
نہ کسو کی تم کو ہے ٹک حیا نہ ہمارے منھ سے حجاب ہے

چلو میکدے میں بسر کریں کہ رہی ہی کچھ برکت وہیں
لبِ نان واں کا کباب ہے دمِ آب وھاں کا شراب ہے

نہیں کھلتیں آنکھیں تمھاری ٹک کہ مآل پر بھی نظر کرو
یہ جو وہم کی سی نمود ہی اسے خوب دیکھو تو خواب ہے

گئے وقت آتے ہیں ہاتھ کب ہوئے ہیں گنواکے خراب سب
تجھے کرنا ہووے سو کر تو اب کہ یہ عمر برقِ شتاب ہے

کبھو لطف سے نہ سخن کیا کبھو بات کہہ نہ لگا لیا
یہی لحظہ لحظہ خطاب ہے وہی لمحہ لمحہ عتاب ہے

تو جہاں کے بحرِ عمیق میں سرِ پُر ہوا نہ بلند کر
کہ یہ پنج روزہ جو بود ہی کسو موج پر کا حباب ہے

رکھو آرزو مئے خام کی کرو گفتگو خطِ جام کی
کہ سیاہ کاروں سے حشر میں نہ حساب ہے نہ کتاب ہے

مرا شور سُن کے جو لوگوں نے کیا پوچھنا تو کہے ہی کیا
جسے میرؔ کہتے ہیں صاحبو! یہ وہی تو خانہ خراب ہے

سینہ ہی چاک جگر پارہ ہی دل سب خوں ہی
اُس سے آنکھوں کو ملا جی میں رہے کیونکر تاب
آہ یہ رسمِ وفا ہووے بر افتاد کہیں
کبھو اس دشت سے اُٹھتا ہی جو ایک ابر تنک
کیونکہ بے بادہ لبِ جو پہ چمن میں یہ رہے
یار بھی ہو نہ کلیجے کے تو پھر کیا بلبل
شہر کتنا جو کوئی ان میں سرشک افشاں ہو

تس پہ یہ جان بلب آمدہ بھی محزوں ہی
چشمِ اعجاز مژہ سحر نگہ افسوں ہی
اس ستم پر بھی مرا دل اُسی کا ممنوں ہی
گرد نمناک پریشاں شدۂ مجنوں ہی
عکسِ گل آب میں تکلیف مےِ گلگوں ہی
مصرعِ نالۂ جگر کا دی ہے گو موزوں ہی
روشِ گریۂ غم حوصلۂ ہاموں ہی

فتراک سے نہ باندھے دیکھے نہ تو تڑپنا
کس آرزو پہ کوئی تیرا شکار ہووے

ازبس لہو پیا ہے میں تیرے غم میں گلرو
تربت سے میری شاید حشر بہار ہووے

میں مست مر گیا ہوں کرنا عجب نہ ساقی
گر سنگ شیشہ میرا سنگِ مزار ہووے

اے غیر میر تجھ کو گر جوتیاں نہ مارے
سید نہ ہووے پھر تو کوئی چمار ہووے

رہی نہ پختگی عالم میں دور خامی ہے
ہزار حیف کمینوں کا چرخ حامی ہے

نہ اُٹھ تو گھر سے اگر چاہتا ہے ہوں مشہور
نگیں جو بیٹھا ہے گڑ کر تو کیسا نامی ہے

ہوئی ہیں فکریں پریشان میر یاروں کی
حواسِ خمسہ کرے جمع سو نظامی[1] ہے

انجامِ دلِ غم کش کوئی عشق میں کیا جانے
کیا جانیے کیا ہوگا آخر کو خدا جانے

وھاں آرسی ہے وہ ہے یہاں سنگ ہے چھاتی ہے
گزرے ہے جو کچھ ہم پر سو اُس کی بلا جانے

ناصح کو خبر کیا ہے لذت سے غمِ دل کی
ہے حق بہ طرف اُس کے چکھے تو مزا جانے

میں خطِ جبیں اپنا یارو کسے دکھلاؤں
قسمت کے لکھے کے تئیں یہاں کون مٹا جانے

بیطاقتیِ دل نے ہم کو نہ کیا رسوا
ہے عشق سزا اُسکو جو کوئی چھپا جانے

اس مرتبہ ناسازی نبھتی ہے دلا کوئی
کچھ خلق بھی پیدا کر تا خلق بھلا جانے

لیجائے یہ میر اُس کے دروازہ کی مٹی بھی
اس دردِ محبت کی جو کوئی دوا جانے

---

[1] نظامی گنجوی (ایران) ۵۳۳ھ میں پیدا ہوئے اور ۵۹۶ھ میں وفات پائی۔ انھوں نے پانچ مثنویاں لکھیں جو خمسۂ نظامی کے نام سے مشہور ہیں ان میں سے ہر ایک مثنوی کسی خاص فرمائش اور خاص محل پر لکھی گئی۔ چنانچہ خسرو شیریں طغرل ابن سلجوقی کے نام پر لکھی اور اُس کے جائزہ میں چودہ گاؤں ملے اور مخزن اسرار بہرام شاہ کے نام پر لکھی اور اُس نے صلہ میں پانچ ہزار اشرفیاں اور ایک قطار شتر مختلف مال و متاع سے بھرے ہوئے پیش کئے۔ اس وقت ان کا سن تقریباً ۲۵ سال کا تھا۔ اسی طرح لیلیٰ مجنوں منوچہر کے حکم سے ۵۸۴ھ میں تمام کی۔ اسی طرح ہفت پیکر سلطان غیاث الدین کرب ارسلان علاء الدین آقسنقری کی فرمائش سے اور سکندر نامہ کو اپنے شوق سے لکھا مگر ابوبکر نصرۃ الدین کے نام موسوم کیا۔ میر تقی مرحوم نے اسی خمسہ کی طرف اشارہ کیا ہے اور کہا ہے کہ ہمارے زمانہ میں یہ حال ہے کہ جو حواس خمسہ جمع کرلے وہی نظامی ہے۔ آسی

بجھ سوز بعد مرگ سے آگاہ کون ہے
شمع مزار میر بجز آہ کون ہے

بیکس ہوں مضطرب ہوں مسافر ہوں بیوطن
دوری راہ بن مرے ہمراہ کون ہے

لبریز جس کے حسن سے مسجد ہی اور دیر
ایسا بتوں کے بیچ وہ اللہ کون ہے

رکھیو قدم سنبھل کے کہ تو جانتا نہیں
مانندِ نقشِ پا یہ سرِ راہ کون ہے

ایسا اسیر خستہ جگر میں سنا نہیں
ہر آہ میر جس کی ہی جانکاہ کون ہی

دیکھا کروں تجھی کو منظور ہی تو یہ ہے
آنکھیں نہ کھولوں تجھ بن مقدور ہی تو یہ ہی

نزدیک تجھ سے سب ہے کیا قتل کیا جلانا
ہم غمزدوں سے ملنا اک دور ہی تو یہ ہی

رونے میں دن کٹیں ہیں آہ و فغاں سے راتیں
گر شغل ہے تو یہ ہے مذکور ہی تو یہ ہی

چاک جگر کو میرے بر جا ہے جو کہو تم
گر زخم ہے تو یہ ہے ناسور ہی تو یہ ہی

کہتا ہی کوئی عاشق کوئی کہے ہی خبطی
دنیا سے بھی نرالا رنجور ہی تو یہ ہی

کیا جانوں کیا کسل ہی واقع میں میر کے تئیں
دو چار روز سے جو مشہور ہی تو یہ ہے

کوئی ہوا نہ روکش ٹک میری چشم تر سے
کیا کیا نہ ابر آکر یہاں روز روز برسے

وحشت ہے میری یارو خاطر نہ جمع رکھیو
پھر آوے یا نہ آوے نو پر اٹھا جو گھر سے

اب جوں سرشک ان سے پھر نے کی چشم مت رکھ
جو خاک میں ملے ہیں گر کر تری نظر سے

دیدار خواہ اس کے کم ہوں تو شور کم ہو
ہر صبح اک قیامت اٹھتی ہی اسکی در سے

داغ ایک ہو چلا بھی خون ایک ہو بہا بھی
اب بحث کیا ہی دل سے کیا گفتگو جگر سے

دل کس طرح نہ کھینچیں اشعار ریختہ کے
بہتر کیا ہی میں نے اس عیب کو ہنر سے

انجام کار بلبل دیکھا ہم اپنی آنکھوں
آوارہ تھے چمن میں دو چار ٹوٹے پر سے

بیطاقتی نے دل کی آخر کو مار رکھا
آفت ہمارے جی کی آئی ہمارے گھر سے

دلکش یہ منزل آخر دیکھا تو راہ نکلی
سب یار جا چکے تھے آئے جو ہم سفر سے

آوارہ میر شاید وہاں خاک ہو گیا ہے
اک گرد اٹھ چلے ہی گاہ اس کی رہگذر سے

وعدہ وعید پیارے کچھ تو قرار ہووے
دل کی معاملت ہی کیا کوئی خوار ہووے

ایسے ہنس مکھ کو شمع سے تشبیہ
شمع مجلس کی رونی صورت ہے

باطل السحر دیکھ باطل ہے
تیری آنکھوں کا سحر آفت ہے

ابرِ تر کے حضور پھوٹ بہا
دیدۂ تر کو میرے رحمت ہے

کیا ہوا گر غزل قصیدہ ہوئی
عاقبت قصۂ محبت ہے

تربتِ میر پر ہیں اہلِ سخن
قطعہ ہر طرف حرف ہے حکایت ہے

تو بھی تقریب فاتحہ سے چل
بخدا واجب الزیارت ہے

برہم [illegible] عو کی سی ڈالی ہے
کیا تازہ کوئی گل نے اب شاخ نکالی ہے

پھر اُس سے [illegible] دہن غنچہ
تسکیں کے لیے ہم نے اک بات بنالی ہے

سچ پوچھو تو کب کا ہے گڑوا
ترکیب سے کیا کہیے سانچے میں کہ ڈھالی ہے

دیہی کو نہ کچھ پوچھے سارے
پر فائدہ تجھ سے تو آغوش وہ خالی ہے

ہم قد خمیدہ سے آغوش نہیں دیتی
چپ رہیے تو چشمک ہے کچھ کہیے تو گالی ہے

عزت کی کوئی صورت [illegible] ہو عالم
کچھ ساری خدائی سے وہ چال نرالی ہے

دو گام [illegible] کے چلنے میں [illegible] آفت
کیا پیرِ مغاں نے بھی اک چھوکری پالی ہے

ہیگی تو دو [illegible]
کب سر تو فرو لایا ہمت تری عالی ہے

خونریزی میں ہمسولی کی جو خاک برابر ہیں
جوں توں یہ بلا سر سے فرہاد نے ٹالی ہے

جب سر چڑھے ہوں ایسے تب عشق کریں سو بھی
مندیل تری اب کے ہم نے تو بچالی ہے

ان مغبچوں میں زاہد سر زدہ مت آنا

کیا میر تو روتا ہے پامالیِ دل ہی کو
ان لونڈوں نے تو دلی سب سر پہ اٹھالی ہے

نازِ چمن وہی ہے بلبل سے گو خزاں ہے
ٹہنی جو زرد بھی ہے سو شاخ زعفراں ہے

گر اس چمن میں وہ بھی اک ہی لب و دہاں ہے
لیکن سخن کا تجھ سے غنچے کو منہ کہاں ہے

ہنگام جلوہ اُس کے مشکل ہے ٹھہرے رہنا
چتون ہے دل کی آفت چشمک بلائے جاں ہے

پتھر سے توڑنے کے قابل ہے آرسی تو
پر کیا کریں کہ پیارے منہ تیرا درمیاں ہے

باغ و بہار ہے وہ میں کشت زعفراں ہوں
جو لطف اک اُدھر ہے تو یہاں بھی کستاں ہے

ہر چند ضبط کریے چھپتا ہے عشق کوئی
گزرے ہے دل پہ جو کچھ چہرے ہی سے عیاں ہے

ہنستے ہو روتے دیکھ کر غم سے / چھیڑ رکھی ہے تم نے کیا ہم سے

مند گئی آنکھ ہی اندھیرا پاک / روشنی ہے سو یہاں مردم سے

تم جو دل خواہ خلق ہو ہم کو / دشمنی ہے تمام عالم سے

درہمی آگئی مزاجوں میں / آخر ان گیسوانِ درہم سے

سب نے جانا کہیں یہ عاشق ہی / بہ گئے اشک دیدۂ نم سے

مغتنم یوں ہاتھ سے نہ کھو ہم کو / کہیں پیدا بھی ہوتے ہیں ہم سے

قطعہ اکثر آلاتِ جور اس سے ہوئے / آفتیں آئیں اس کے مقدم سے

دیکھ وے پلکیں برچھیاں چلیاں / تیغ نکلی اس ابروئے خم سے

قطعہ کوئی بیگانہ گر نہیں موجود / منھ چھپانا یہ کیا ہی پھر ہم سے

وجہ پردے کی پوچھیے بارے / ملئے اُس کے کسو جو محرم سے

در پئے خونِ میر ہی نہ رہو / ہو بھی جاتا ہے جرم آدم سے

نالۂ عجز نقص الفت ہے / رنج و محنت کمال راحت ہے

عشق ہی گریۂ ندامت ہے / ورنہ عاشق کو چشم خفت ہے

تا دمِ مرگ غم خوشی کا نہیں / دلِ آزردہ گر سلامت ہے

دل میں ناسور پھر جدھر چاہے / ہر طرف کوچۂ جراحت ہے

رونا آتا ہے دم بدم شاید / کسو حسرت کی دل سے رخصت ہے

فتنے رہتے ہیں اُس کے سایہ میں / قد و قامت ترا قیامت ہے

نہ تجھے رحم نے اُسے ٹک صبر / دل پہ میرے عجب مصیبت ہے

قطعہ تو تو نادان ہے نپٹ ناصح / کب مؤثر تری نصیحت ہے

دل پہ جب میرے آکے یہ ٹھہرا / کہ مجھے خوش دلی اذیت ہے

رنج و محنت سے باز کیونکہ رہوں / وقت جاتا رہے تو حسرت ہے

کیا ہے پھر کوئی دم کو کیا جانو / دم غنیمت میاں جو فرصت ہے

قطعہ تیرا شکوہ مجھے نہ میرا تجھے / چاہیے یوں جو فی الحقیقت ہے

تجھ کو مسجد ہے مجھ کو میخانہ / واعظا اپنی اپنی قسمت ہے

کیا دلفریب جائے ہے آفاق ہمنشیں ۔۔۔ دو دن کو یہاں جو آئے سو برسوں نہ جا سکے

(ق)

مشعر ہے اس پہ مردنِ دشوارِ رفتگاں ۔۔۔ یعنی جہاں سے دل کو نہ آسان اٹھا سکے

بدلوں گا اس غزل کے بھی میں قافیہ کو میر
پھر فکر کو نہ عہدے سے اس کے بر آ سکے

کیا غم میں ویسے خاک فتادہ سے ہو سکے ۔۔۔ دامن پکڑ کے یار کا جو ٹک نہ رو سکے

ہم ساری ساری رات رہے گریہ ناک لیک ۔۔۔ مانند شمع داغ جگر کا نہ دھو سکے

رونا تو ابر کا سا نہیں یار جانتے ۔۔۔ اتنا تو روئیے کہ جہاں کو ڈبو سکے

برسوں ہی منتظر سر رہ پر ہمیں ہوئے ۔۔۔ اس قسم کا تو صبر کسو سے نہو سکے

رہتی ہے[۱] ساری رات مرے دم سے چہل میر
نالہ رہے تو کوئی محلے میں سو سکے

آتش کے شعلے سر سے ہمارے گزر گئے ۔۔۔ بس اے تپِ فراق کہ گرمی میں مر گئے

منزل نہ کر جہان کو کہ ہم نے سفر سے آہ ۔۔۔ جن کا کیا سراغ سنا دے گزر گئے

مشتِ نمک سے بھی تو کبھو یاد کر ہمیں ۔۔۔ اب داغ کھاتے کھاتے فلک جی تو بھر گئے

ناصح نہ روویں کیونکہ محبت کے جی کو ہم ۔۔۔ اے خانماں خراب ہمارے تو گھر گئے

تلوار آپ کھینچیے حاضر ہے یہاں بھی سر ۔۔۔ بس عاشقی کی ہم نے جو مرنے سے ڈر گئے

کر دیں گے آسمان و زمیں ایک حشر کو ۔۔۔ اس معرکہ میں یار جی ہم بھی اگر گئے

یہ راہ و رسم دل شدگاں گفتنی نہیں ۔۔۔ جانے دے میر صاحب و قبلہ جدھر گئے

(قطعہ)

روز وداع اس کی گلی تک تھے ہم بھی ساتھ ۔۔۔ جب درد مند ہم کو وے معلوم کر گئے

گر یک نگاہِ یاس کی ٹپ سے سے رو دیا
پھر ہم ادھر کو آئے میاں وے اُدھر گئے

دن کو نہیں ہے چین نہ ہے خواب شب مجھے ۔۔۔ مرنا پڑا ضرور ترے غم میں اب مجھے

ہنگامہ میری نعش پہ تیری گلی میں ہے ۔۔۔ لیجائیں گے جنازہ کشاں یہاں سے کب مجھے

ٹک داد میری اہلِ محلہ سے چاہیو ۔۔۔ تجھ بن خراب کرتے رہے ہیں یہ سب مجھے

طوفاں بجائے اشک ٹپکتے تھے چشم سے ۔۔۔ اے ابر تر دماغ تھا رونے کا جب مجھے

دو حرف اس کے منہ کے تو لکھ بھیجیو شتاب ۔۔۔ قاصد چلا ہے چھوڑ کے تو جاں بلب مجھے

[۱] اسی طرح گر میر روتا رہیگا ۔ تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہیگا ۱۲ میر

ہم سے
اوّل تو میں سند ہوں پھر یہ مری زباں ہے توہم سے
گر خاک ہو اُڑے ہو اور آب ہو، واں قلم سے
خونریزی کی ہماری رنگین داستاں ہم سے

...ات میر
...س فن میں کوئی بے تہ کیا ہو مرا معارض
...عالم میں آب و گل کا ٹھہراؤ کس طرح ہو
چرچا رہیگا اس کا تا حشر میکشاں میں
از خویش رفتہ اُس بن رہتا ہے میر اکثر
کرتے ہو بات کس سے وہ آپ میں کہاں ہے

کیا جی تدرو کا جو ترے آگے چل سکے
تیرا خرام دیکھے تو جا سے نہ ہل سکے
فانوس کی سی شمع جو [illegible] حجاب سے نکل سکے
اس دل جلے کی تاب کے لانے کو عشق ہے
اتنا تو ہو کہ آہ جیا تا بسحر سے [illegible] ڈھل سکے
کہتا ہے کون تجھ کو کہ اے سینہ رک نہ جا
حسرت سے اُس آفتاب کی پھر دن ڈھل سکے
گرد و پھر کو اُس کو نکلنے دے ناز کی
جو اپنی بے وفائی نہ رہا غمی سے مکھی نہ جھل سکے
کیا اس غریب کو ہو سر سایۂ ہما
اپنے اُپر جو کام سے کوئی گھڑی ہاتھ مل سکے
پھر جائے حیف بزم جہاں مل لے ای پتنگ
ایسا تو ہو کہ محنت سہے گھڑی جی سنبھل سکے
کس کو ہے آرزوے افاقت فراق میں
چشمہ ہے یہ واشق کو چشم خفتہ کہ دریا سکے
مت بر چشم کم سے مری چشم تر کو دیکھ
کہتا ہے وہ تو ایک کی دس میر کم تر دیں کہ جل سکے
اُس کی زباں کے عہدے سے کیونکر نکل سکے

سر ردو ریکھ تو طبیعت کا چل سکے
تغیر قافیہ سے یہ طرحی غزل کہوں
تا جس میں زاستمی شرط ہے جو تاب لا سکے
خورشید تیرے چہرہ کے آگو نہ آ سکے
اُس کو جگر ہے جے کہ کوئی کھوج پا سکے
ہم گرم رو ہیں راہ فنا کے شرر صفت
ایسے نہ جائیں گے کہ جہاں کو جلا سکے
غافل نہ رہیو اہ ضعیفوں سے سرکشاں
طاقت ہے اُس کو یہ کہ بہت ہے
میرا جو بس چلے تو منادی کیا کروں
تا اپنے دل نہ کوئی کسو سے لگا سکے
تدبیر جیب پارہ نہیں کرتی فائدہ
ناصح جگر کا چاک سلا جو سلا سکے
اس کا کمال چرخ پہ سر کھینچتا نہیں
اپنے تئیں جو خاک میں کوئی ملا سکے
یہ تیغ ہے یہ طشت ہے یہ تو ہے بوالہوس
کھانا تجھے حرام ہے جو زخم کھا سکے
اس رشک آفتاب کو دیکھے تو شرم سے
ماہ فلک نہ شہر میں منہ کو دکھا سکے

کب تلک جی رکے خفا ہووے · آہ کریے کہ ٹک ہوا ہووے

جی ٹھہر جائے یا ہوا ہووے · دیکھیے ہوتے ہوتے کیا ہووے

کاہشِ دل کی کیجیے تدبیر · جان میں کچھ بھی جو رہا ہووے

چپ کا باعث ہے بے تمنائی · کہیے کچھ بھی تو مدعا ہووے

بے کلی مارے ڈالتی ہے نسیم · دیکھیے اب کے سال کیا ہووے

مر گئے ہم تو مر گئے تو جیے · دل گرفتہ تری بلا ہووے

عشق کیا ہے درست اے ناصح · جانے وہ جس کا دل لگا ہووے

پھر نہ شیطاں سجود آدم سے · شاید اس پردے میں خدا ہووے

نہ سنا رات ہم نے اک نالہ · غالباً میر مر رہا ہووے

کچھ تو کہہ وصل کی پھر رات چلی جاتی ہے · دن گزر جائیں ہیں پر بات چلی جاتی ہے

رہ گئے گاہ تبسم پہ گہے بات ہی پر · بارے اے ہمنشیں اوقات چلی جاتی ہے

ٹک تو وقفہ بھی کر اے گردشِ دوراں یہ کہ جان · عمر کے حیف ہی کیا ساتھ چلی جاتی ہے

یھاں تو آتی نہیں شطرنجِ زمانہ کی چال · اور وھاں بازی ہوئی مات چلی جاتی ہے

روز آنے پہ نہیں نسبتِ عشقی موقوف · عمر بھر ایک ملاقات چلی جاتی ہے

خرقہ مندیل و ردا مست لیے جاتے ہیں · شیخ کی ساری کرامات چلی جاتی ہے

ہے موذن جو بڑا مرغ مصلی اس کی · مستوں سے ٹوک ہی کی بات چلی جاتی ہے

پاؤں رکتا نہیں مسجد سے دمِ آخر بھی · مرنے پر آیا ہے پر لات چلی جاتی ہے

ہر سحر درپے آرام مے آشاماں ہے · لکر و طامات کی اک گھات چلی جاتی ہے

ایک ہم ہی سے تفاوت ہے سلوکوں میں میر · یوں تو اوروں کی مدارات چلی جاتی ہے

منصف جو تو ہے کب تئیں یہ دکھ اٹھائیے · کیا کیجیے میری جان اگر مر نہ جائیے

اظہار رازِ عشق کئے بن رہے نہ اشک · اس طفل ناسمجھ کو کہاں تک پڑھائیے

تم نے جو اپنے دل سے بھلایا ہمیں تو کیا · اپنے تئیں تو دل سے ہمارے بھلائیے

فکرِ معاش یعنی غمِ زیست تا بہ کے · مر جائیے کہیں کہ ٹک آرام پائیے

کچھ ہے جواب جو میں کروں حشر کو سوال
مارا تھا تو نے جان سے کہہ کس سبب مجھے

قطعہ

غیر از خموش رہنے کے ہونٹھوں کے سوکھنے
لیکن نہیں ہے یار جھگڑنیکا ڈھب مجھے
پوچھا تھا راہ جاتے کہیں اُن نے میر کو
آتا ہے اُس کی بات کا اب تک عجب مجھے

کاتب کہاں دماغ جواب شکوہ ٹھانئے
بس ہے یہ ایک حرف کہ مشتاق جانئے
غیروں کا ساتھ موجب صد وہم ہے بتاں
اس امر میں خدا بھی کہے تو نہ مانئے
شب خواب کا لباس ہے عریاں تنی ہیں یہ
جب سوئیے تو چادرِ مہتاب تانئے

قطعہ

اپنا یہ اعتقاد ہے تجھ جستجو میں یار
لے اس سرے سے اس سرے تک خاک چھانئے
پھر یا نصیب یہ بھی ہے طالع کی یاوری
مر جائیں ہم تو اس پہ بھی ہم کو نہ جانئے
لوٹے ہے خاک و خون میں غیر اس کیساتھ میر
ایسے تو نیم کشتہ کو ان میں نہ سانئے

مرے اس رک کے مر جانے سے وہ غافل ہے کیا جانے
گزرنا جان سے آساں بہت مشکل ہے کیا جانے
کوئی سر سنگ سے مارو کسی کا واپسیں دم ہو
وہ آئینے میں اپنے ناز پر مائل ہے کیا جانے
نظر مطلق نہیں ہجراں میں اس کو حال پر میرے
مرا دل اُس کے غم میں گو یا اس کا دل ہے کیا جانے
جنونی خبطی دیوانہ سڑی کوئی عشق کو سمجھے
فلاطوں سے نہیں یہاں بحث وہ عاقل ہے کیا جانے
تڑپنا نقش پائے ناقہ پر جانے ہے اک مجنوں
بیاباں میں وہ لیلی کا کدھر محمل ہے کیا جانے
پڑھایا اُس کو بہتیرا کہ مت لا رازِ دل منہ پر
یہ طفلِ اشک کو دیکھا تو نا قابل ہے کیا جانے
طرف ہونا مرا مشکل ہے میر اس شعر کے فن سے
یونہیں سودا کبھو ہوتا ہے سو جاہل ہے کیا جانے

کاہیکو یہ انداز تھا اعراضِ بتاں کا / ظاہر ہے کہ منہ پھیر لیا ہم سے خدا نے

ان ہی چمنوں میں کہ جنھوں میں نہیں اب چھائی / کن کن روشوں ہم کو پھرایا ہے ہوا نے

کب کب مری عزت کو لئی بیٹھی ہو ٹک پاس / آئے بھی جو ہو تو مجھے مجلس سے اٹھانے

پایا ہی نہ ہم نے دلِ گم گشتہ کو اپنے / خاک اسکی سرِ راہ کی کوئی کب تئیں چھانے

کچھ تم کو ہمارے جگروں پر بھی نظر ہے / آتے جو ہو ہر شام و سحر تیر لگانے

مجروح بدن سنگ سے طفلاں کی نہ ہوتے / کم جاتے جو اس کوچہ میں پر ہم تھے دوانے

آنے میں تعلل ہی کیا عاقبت کار / ہم جی سے گئے پر نہ گئے اس کی بہانے

گلیوں میں بہت ہم تو پریشاں سے پھرے ہیں
اوباش کسو روز لگا دیں گے ٹھکانے

تن ہجر میں اس یار کے رنجور ہوا ہے / بیطاقتیِ دل کو بھی مقدور ہوا ہے

پہنچا نہیں کیا سمع مبارک میں مرا حال / یہ قصّہ تو اس شہر میں مشہور ہوا ہے

بیخوابی تری آنکھوں پہ دیکھوں ہوں مگر رات / افسانہ مرے حال کا مذکور ہوا ہے

کل صبح ہی مستی میں سرِ راہ نہ آیا / یہاں آج مرا شیشۂ دل چور ہوا ہے

کیا سوجھے اسے جس کی ہو یوسف ہی نظر میں / یعقوب بجا آنکھوں سے معذور ہوا ہے

پر شور سے ہے عشق مغنی پسراں کے / یہ کاسۂ سر کاسۂ طنبور ہوا ہے

تلوار لئے پھرنا تو اب اس کا سنا میں / نزدیک مرے کب کا یہ سر دور ہوا ہے

خورشید کی محشر میں تپش ہوگی کہاں تک / کیا ساتھ مرے داغوں کے محشور ہوا ہے

اے رشکِ سحر بزم میں لے منہ پہ نقاب اب / اک شمع کا چہرہ ہے سو بے نور ہوا ہے

اس شوق کو ٹک دیکھ کہ چشم نگراں ہے
جو زخم جگر کا مرے ناسور ہوا ہے

چل قلم غم کی رقم کوئی حکایت کیجے / ہر سر حرف پہ فریاد نہایت کیجے

گو کہ یہ خاک قدم پر ترے لوٹے اس میں / اپنا شیوہ ہی نہیں یہ کہ شکایت کیجے

ہم جگر سوختہ کے جی میں جو آوے تو ابھی / دودِ دل ہو کے فلک تجھ میں سرایت کیجے

عشق میں آپ کے گزرے نہ ہماری تو مگر / عوض جور و جفا ہم پہ عنایت کیجے

سلہ پہنچا تو ہو گا سمع کا مبارک میں حال میر / اس پر بھی جی میں آوے تو دل کو لگا ... اہ

جاتے ہیں کیسی کیسی لئے دل میں حسرتیں
ٹک دیکھنے کو جاں بلبوں کے بھی آئیے
لوٹوں ہوں جیسے خاک چمن پر میں ای امیر
گل کو بھی میری خاک پہ وونہی لٹائیے

پہنچا تو ہوگا سمع مبارک میں حال میر
اس پر بھی جی میں آوے تو دل کو لگائیے

نہیں وسواس جی گنوانے کے
ہائے رے ذوق دل لگانے کے
میرے تغییر حال پر مت جا
اتفاقات ہیں زمانے کے
دم آخر ہی کیا نہ آنا تھا
اور بھی وقت تھے بہانے کے
اس کدورت کو ہم سمجھتے ہیں
ڈھب ہیں یہ خاک میں ملانے کے
بس ہیں دو برگ گل قفس میں صبا
نہیں بھوکے ہم آب و دانے کے
مرنے پر بیٹھے ہیں سنو صاحب
بندے ہیں اپنے جی جلانے کے
اب گریباں کہاں کہ ای ناصح
چڑھ گیا ہاتھ اُس دوانے کے
چشم نجم سپہر جھپکی ہے
صدقے اس انکھڑیاں لڑانے کے
دل و دین ہوش و صبر سب ہی گئے
آگے آگے تمھارے آنے کے
کب تو سوتا تھا گھر مرے آکر
جاگے طالع غریب خانے کے
مژہ ابرو نگہ سے اُسکی میر
قطعہ
کشتہ ہیں اپنے دل لگانے کے
تیر و تلوار و سیل یکجا ہیں
سارے اسباب مار جانے کے

کم فرصتی گل جو کہیں کوئی نہ مانے
ایسے گئے ایام بہاراں کہ نہ جانے
تھے شہر میں ای رشک پری جتنے سیانے
سب ہوگئے ہیں شور تر اُس کے دوانے
ہمراہ جوانی گئے ہنگامے اٹھانے
اب ہم بھی نہیں رہنے کے ہیں وے ہیں نہ مانے
پیری میں جو باقی نہیں جامے میں تو کیا دور
پھٹنے لگے ہیں کپڑے جو ہوتے ہیں پرانے
مرتے ہی سنے ہم نے کسلمند محبت
اس درد میں کس کس کو کیا نفع دوانے
ہے کس کو میسر تری زلفوں کی اسیری
شانہ کے نصیبوں میں تھے یوں ہاتھ بندھانے
ٹک آنکھ بھی کھولی نہ زخود رفتہ نے اُس کے
ہر چند کیا شور قیامت نے سرہانے
لوہے کے توے ہیں جگر اہل محبت
رہتے ہیں ترے تیر ستم ہی کے نشانے

جانگداز اتنی کہاں آوازِ عود و چنگ ہے — دل کھنچے نالوں کا ان پردوں میں کچھ آہنگ ہے

رو و خال و زلف سے ہیں سنبل و سبزہ و گل — آنکھیں ہوں تو یہ چمن آئینۂ نیرنگ ہے

بیستوں کھودے سے کیا آخر ہوئی سب کار عشق — بعد ازاں اے کوہکن سر ہے ترا اور سنگ ہے

آہ ان خوش قامتوں کو کیونکہ بر میں لائیے — جن کے ہاتھوں سے قیامت پر بھی عرصہ تنگ ہے

عشق میں وہ گھر ہے اپنا جس میں سے مجنوں یہ ایک — ناخلف سارے قبیلہ کا ہمارے ننگ ہے

چشمِ کم سے دیکھ مت قمری تو اس خوش قد کو ٹک — آہ بھی سروِ گلستانِ شکست رنگ ہے

ہم سے تو جایا نہیں جاتا کہ یکسر دل میں واں — دو قدم اس کی گلی کی راہ سو فرسنگ ہے

ایک بوسے پر تو کی ہے صلح پر ای زود رنج — تجھ کو مجھ کو اتنی اتنی بات اوپر جنگ ہے

پاؤں میں چوٹ آنے کے پیارے بہانے جانے دے — پیش رفت آگے ہمارے کب یہ عذر لنگ ہے

قطعہ

فکر کو نازک خیالوں کی کہاں پہنچے ہیں یار — ورنہ ہر مصرع یہاں معشوق شوخ و شنگ ہے

سرسری کچھ سن لیا پھر واہ وا کر اٹھ گئے — شعر یہ کم فہم سمجھے ہیں خیال بنگ ہے

صبر بھی کریے بلا پر میر صاحب جی کبھو
جب نہ تب رونا ہی کڑھنا یہ بھی کوئی ڈھنگ ہے

خنجر بکف وہ جب سے سفاک ہو گیا ہے — ملک ان ستمزدوں کا سب پاک ہو گیا ہے

جس سے اسے لگاؤں رکھا ہی ہو ملے ہے — سینے میں جل کر از بس دل خاک ہو گیا ہے

کیا جانوں لذت درد اس کی جراحتوں کی — یہ جانوں ہوں کہ سینہ سب چاک ہو گیا ہے

صحبت سے اس جہاں کی کوئی خلاص ہوگا — اس فاحشہ پہ سب کو امساک ہو گیا ہے

دیوار کہنہ ہے یہ مت بیٹھ اس کے سایہ — اٹھ چل کہ آسماں تو کاواک ہو گیا ہے

شرم و حیا کہاں کی ہر بات پر ہے شمشیر — اب تو بہت وہ ہم سے بے باک ہو گیا ہے

زیر فلک بھلا تو رووے ہے آپ کو میر
کس کس طرح کا عالم یاں خاک ہو گیا ہے

ساقی گھر چاروں اور آیا ہے — دے بھی مے ابر زور آیا ہے

غارت دل کرے ہے ابر سیاہ — بے طرح گھر میں چور آیا ہے

آج تیری گلی سے ظالم میر
لوہو میں شور بور آیا ہے

مت چلا عشق کی رہ کی کہ کہیں ہے یہاں خضر | آپھی گمراہ ہیں ہم کس کو ہدایت کیجے

کس کے کہنے کو ہے تاثیر کہ اک میر ہی ہے
رمز و ایما و اشارات و کنایت کیجے

دل جو پُر بیقرار رہتا ہے | آجکل مجھ کو مار رہتا ہے
ترے بن دیکھے میں مکدر ہوں | آنکھوں پر اب غبار رہتا ہے
جبر یہ ہے کہ تیری خاطر دل | روز بے اختیار رہتا ہے
دل کو مت بھول جانا میرے بعد | مجھ سے یہ یادگار رہتا ہے
دور میں چشم مست کے تیرے | فتنہ بھی ہوشیار رہتا ہے
بسکہ تیرا ہوا بلا گرداں | سر کو میرے دوار رہتا ہے
ہر گھڑی رنجش ایسی باتوں میں | کوئی اخلاص و پیار رہتا ہے
تجھ بن آئے ہیں تنگ جینے سے | مرنے کا انتظار رہتا ہے
دل کو گو ہاتھ میں رکھواب تم | کوئی یہ بیقرار رہتا ہے
غیرمت کھا فریب خلق اس کا | کوئی دم میں وہ مار رہتا ہے
دلبرو دل چراتے ہو ہر دم | یوں کہیں اعتبار رہتا ہے
کیوں نہ ہووے عزیز دلہا میر | کس کے کوچے میں خوار رہتا ہے

دہر بھی میر طرفہ مقتل ہے | جو ہے سو کوئی دم کا فیصل ہے
کثرت غم سے دم لگا رُکنے | حضرت دل میں آج دنگل ہے
روز کہتے ہیں چلنے کو خوباں | لیکن اب تک تو روز اول ہے
چھوڑ مت نقد وقت نسیہ پر | آج جو کچھ ہے سو کہاں کل ہے
بند ہو تجھ سے یہ کھلا نہ کبھو | دل ہے یا خانۂ مقفل ہے
سینہ چاکی بھی کام رکھتی ہے | یہی کر جب تلک معطل ہے
ابھی ہاتھوں میں شوق کے تیرے | قطعہ | دامن بادیہ کا آنچل ہے
ٹک گریباں میں سر کو ڈال کے دیکھ | دل بھی کیا لق و دق جنگل ہے
ہجر باعث ہے بدگمانی کا | غیرت عشق ہے تو کب کل ہے
مر گیا کوہکن اسی غم میں | آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل ہے

اس آرزوئے وصل نے مشکل کیا جینا مرا
ورنہ گزرنا جان سے اتنا نہیں آسان ہے

بس بیوپاری ہو چکی گلیوں میں خواری ہو چکی
اب پاس کر ٹک میر کا دو چار دن مہمان ہے

خوب تھے وے دن کہ ہم تیرے گرفتاروں میں تھے
غمزدوں، اندوہ گینوں، ظلم کے ماروں میں تھے

دشمنی جانی ہے اب تو ہم سے غیروں کے لئے
اک سماں سا ہو گیا وہ بھی کہ ہم یاروں میں تھے

مت تبختر سے گزر قمری ہماری خاک پر
ہم بھی اک سروِ رواں کے نازبرداروں میں تھے

مر گئے لیکن نہ دیکھا تونے ادھر آنکھ اٹھا
آہ کیا کیا لوگ ظالم تیرے بیماروں میں تھے

گرچہ جرمِ عشق غیروں پر بھی ثابت تھا ولے
قتل کرنا تھا ہمیں ہم ہی گنہگاروں میں تھے

اک رہا مژگاں کی صف میں ایک کے ٹکڑے ہوئے
دل جگر جو میر دونوں اپنے غمخواروں میں تھے

جس جگہ دورِ جام ہوتا ہے
وھاں یہ عاجز مدام ہوتا ہے

ہم تو اک حرف کے نہیں ممنون
کیسا خط و پیام ہوتا ہے

تیغ ناکاموں پر نہ ہر دم کھینچ
اک کرشمہ میں کام ہوتا ہے

پوچھ مت آہ عاشقوں کی معاش
روز ان کا بھی شام ہوتا ہے

زخم بن، غم بن اور غصہ بن
اپنا کھانا حرام ہوتا ہے

شیخ کی سی ہی شکل ہے شیطان
جس پہ شب احتلام ہوتا ہے

میر[1] صاحب بھی اُس کے ہاں تھے پر
جیسے کوئی غلام ہوتا ہے

[1] میر صاحب بھی اُس کے ہاں تھے لیکن، بندۂ زر خریدہ سے مانند (میر)

فقیرانہ آئے صدا کر چلے — میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم — سو اس عہد کو اب وفا کر چلے

شفا اپنی تقدیر ہی میں نہ تھی — کہ مقدور تک تو دوا کر چلے

وہ کیا چیز ہے آہ جس کے لئے — ہراک چیز سے دل اُٹھا کر چلے

کوئی نا امیدانہ کرتے نگاہ — سو تم ہم سے منہ بھی چھپا کر چلے

بہت آرزو تھی گلی کی تری — سو یہاں سے لہو میں نہا کر چلے

دکھائی دئے یوں کہ بیخود کیا — ہمیں آپ سے بھی جدا کر چلے

قطعہ

جبیں سجدہ کرتے ہی کرتے گئی — حقِ بندگی ہم ادا کر چلے

پرستش کی یہاں تک کہ اے بت تجھے — نظر میں سبھوں کی خدا کر چلے

قطعہ

جھڑے پھول جس رنگ گلبن سے یوں — چمن میں جہاں کے ہم آ کر چلے

نہ دیکھا غمِ دوستاں شکر ہے — ہمیں داغ اپنا دکھا کر چلے

قطعہ

گئی عمر در بندِ فکرِ غزل — سو اس فن کو ایسا بُرا کر چلے

کہیں کیا جو پوچھے کوئی ہم سے میرؔ
جہاں میں تم آئے تھے کیا کر چلے

اپنا سرِ شوریدہ تو وقفِ خمِ چوگان ہے
آ بلہوس گر ذوق ہے یہ گو ہے یہ میدان ہے

عالم مری تقلید سے خواہش تری کرنے لگا
میں تو پشیماں ہو چکا لوگوں کو اب ارمان ہے[1]

ہر چند بیش از بیش ہے دعویٰ تو رونیکا تجھے
پر دیدۂ نمناک بھی اے ابرِ تر طوفان ہے

اس بیدمی میں بھی کبھو دل بھر اُٹھے ہے دم ترا
آٹک شتابی بے وفا اب تک تو مجھ میں جان ہے

ہر لحظہ خنجر درمیاں ہر دم زباں زیرِ زباں
وہ طور وہ اسلوب ہے یہ عہد یہ پیمان ہے

۱۔ ایک ہم ہیں جو ہوئے ایسے پشیمان کہ بس + ایک وہ ہیں کہ جنھیں چاہ کے ارماں ہونگے ۔ مومن

کرو توکل کہ عاشقی میں نہ یوں کروگے تو کیا کروگے
الم جو یہ ہے تو دردمندو کہاں تلک تم دوا کروگے
جگر میں طاقت کہاں ہے اتنی کہ دردِ ہجراں سے مرتے رہیے
ہزار دل وعدے وصال کے تھے کوئی بھی جیتے وفا کروگے
جہاں کی مسلخ تمام حیرت نہیں ہے تس پر نگہ کی فرصت
نظر پڑے گی بسانِ بسمل کبھو جو مژگاں کو وا کروگے
اخیر الفت یہی نہیں ہے کہ جل کے آخر ہوئے پتنگے
ہوا جو یہاں کی یہ ہے تو یارو غبار ہوکر اُڑا کروگے
بلا ہے ایسا طپیدنِ دل کہ صبر اس پر ہے سخت مشکل
دماغ اتنا کہاں رہے گا کہ دست بر دل رہا کروگے
عدم میں ہم کو یہ غم رہیگا کہ اوروں پر اب ستم رہیگا
تمھیں تو لت ہے ستانے ہی کی کسو پر آخر جفا کروگے
اگرچہ اب تو خفا ہو لیکن موئے گئے پر کبھو ہمارے
جو یاد ہم کو کروگے پیارے تو ہاتھ اپنے ملا کروگے
سحر کو محرابِ تیغِ قاتل کبھو جو یارو ادھر ہو مائل
تو ایک سجدہ بسانِ بسمل مری طرف سے ادا کروگے

غمِ محبت سے میر صاحب بہ تنگ ہوں میں فقیر ہو تم
جو وقت ہوگا کبھو مساعد تو میرے حق میں دعا کروگے

قطعہ

بو کہ ہو سوئے باغ نکلے ہے — باؤ سے اک داغ نکلے ہے
ہے جو اندھیر شہر میں خورشید — دن کو لیکر چراغ نکلے ہے
چو بکاری ہی سے رہیگا شیخ — اب تو لیکر چماغ نکلے ہے
وے ہے جنبش جو وہاں کی خاک کو باؤ — جگر داغ داغ نکلے ہے
ہر سحر حادثہ مری خاطر — بھر کے خون کا ایاغ نکلے ہے

سلہ چماغ بروزن براق سر کے عصا جس کو ہانڈی کہتے ہیں ۱۲

فقب تنگ ہم آئے ہیں جان سے — وقتِ شکیب خوش کہ گیا درمیان سے
جو سنجی کا ذکر تھا شب اُنکی بزم میں — نکلا نہ حرفِ خیر کسو کی زبان سے
شر سے بھی نہ گئی سوزشِ جگر — کیا جانیئے یہ آگ ہے کس دودمان سے
ق جنگ دہر سے مت پڑھ کہ خوش ہیں ہم — اس قصے کی کتاب میں اس داستان سے
نے کا اس چمن میں سبب بیکلی ہوئی — جوں برق ہم تڑپ کے گرے آشیان سے
اب چھیڑ یہ رکھی ہے کہ عاشق ہے تو کہیں — القصہ خوش گزرتی ہے اس بدگمان سے

داغوں سے ہی چمن جگر میرؔ دہر میں
اُن نے بھی گل چنے بہت اس گلستان سے

چاک پر چاک ہوا جوں جوں سلایا ہم نے — اس گریباں ہی سے اب ہاتھ اُٹھایا ہم نے
حسرتِ لطفِ عزیزانِ چمن جی میں رہی — سر پہ دیکھا نہ گل و سرو کا سایا ہم نے
جی میں تھا عرش پہ جا باندھئے تکیہ لیکن — بسترا خاک ہی میں اب تو بچھایا ہم نے
بعد یک عمر کہیں تم کو جو تنہا پایا — ڈرتے ڈرتے ہی کچھ احوال سنایا ہم نے
یہاں فقط ریختہ ہی کہنے نہ آئے تھے ہم — چار دن یہ بھی تماشا سا دکھایا ہم نے
بارے کل باغ میں جا مرغِ چمن سے ملکر — خوبیِ گل کا مزا خوب اُڑایا ہم نے
تازگی داغ کی ہر شام کو بے ہیچ نہیں — آہ کیا جانیے دیا کس کا بجھایا ہم نے
دشت و کہسار میں سر مار کے چندے تجھ بن — قیس و فرہاد کو پھر یاد دلایا ہم نے
بے کلی سے دلِ بیتاب کی مر گزرے تھے — سو تہِ خاک بھی آرام نہ پایا ہم نے

یہ ستم تازہ ہوا اور کہ پائیز میں میرؔ
دل خس و خار سے ناچار لگایا ہم نے

ظالم کہیں تو مل کبھو دارو پیئے ہوئے — پھرتے ہیں ہم بھی ہاتھ میں سر کو لئے ہوئے
آؤگے ہوش میں تو ٹک اک سدھ بھی لیجیو — اب تو نشے میں جاتے ہو زخمی کئے ہوئے
جی ڈوبتا ہے اس گہرِ تر کی یاد میں — پایانِ کارِ عشق میں ہم مرچلے ہوئے
سی چاک دل کہ چشم سے ناصح لہو تھمے — ہوتا ہی کیا ہمارے گریباں سیئے ہوئے

کافر ہوئے بتوں کی محبت میں میرؔ جی
مسجد میں آج آئے تھے قشقہ دیئے ہوئے

کب کب تم نے سچ نہیں مانیں جھوٹی باتیں غیروں کی
تم ہم کو وہیں نہیں جلائے گئے وے تم کو وو ہیں لگائے گئے

صبح وہ آفت اُٹھ بیٹھا تھا تم نے نہ دیکھا صد افسوس
کیا کیا فتنے سر جوڑے پلکوں کے سائے سائے گئے

اللہ رے یہ دیدہ درائی ہوں نہ مکدّر کیونکہ ہم
آنکھیں ہم سے ملائے گئے پھر خاک میں ہم کو ملائے گئے

آگ میں غم کی ہو کے گدازاں جسم ہوا سب پانی سا
یعنی بن اُن شعلہ رخوں کے خوب ہی ہم بھی تائے گئے

ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی بھی حد ایک آخر ہوتی ہے
کشتو اُس کی تیغِ ستم کے گور تئیں کب لائے گئے

خضر جو مل جاتا ہے گاہے آپ کو بھولا خوب نہیں
کھوئے گئے اُس راہ کے ورنہ کاہیکو پھر پائے گئے

مرنے سے کیا میر جی صاحب ہم کو ہوش تھے کیا کرئے
جی سے ہاتھ اُٹھائے گئے پر اُس سے دل نہ اُٹھائے گئے

ادھر سے ابر اُٹھ کر جو گیا ہے
ہماری خاک پر بھی رو گیا ہے
مصائب اور تھے پر دل کا جانا
عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے
مقامر خانۂ آفاق وہ ہے
کہ جو آیا ہے یہاں کچھ کھو گیا ہے
کچھ آؤ زلف کے کوچہ میں درپیش
مزاج اپنا ادھر اب تو گیا ہے

سرھانے میر[1] کے کوئی نہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

عمر بھر ہم رہے شرابی سے
دل پُرخون کی اک گلابی سے
جی ڈہا جائے ہے سحر سے آہ
رات گزرے گی کس خرابی سے
کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے
اُس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے

[1] سودا سودا کی جو بالیں پہ ہوا شورِ قیامت ۔ خدامِ ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے

۲ | اُس گلی کی زمین تفتہ سے | دل جلوں کا سراغ نکلے ہے

شاید اُس زلف سے لگی ہے میرؔ
باؤ میں اک دماغ نکلے ہے

ہے خاک جیسے ریگِ رواں سب نہ آب ہے
دریائے موج خیز جہاں کا سراب ہے
روز شمار میں بھی محاسب ہے گر کوئی
تولے حساب کچھ نہ کر آخر حساب ہے
اس شہر دل کو تو بھی جو دیکھے تو اب کہے
کیا جانئے کہ بستی یہ کب کی خراب ہے
منھ پر لئے نقاب تو اے ماہ کیا چھپے
آشوبِ شہر حسن ترا آفتاب ہے
کس رشکِ گل کی باغ میں زلفِ سیہ کھلی
موجِ ہوا میں آج نپٹ پیچ وتاب ہے
کیا دل مجھے بہشت میں لے جائے گا بھلا
جس کے سبب یہ جان پہ میری عذاب ہے
سن کان کھول کر کہ تنک جلد آنکھ کھول
غافل یہ زندگانی فسانہ ہے خواب ہے
رہ آشنائے لطف حقیقت کے بحر کا
ہے رشکِ زلف و چشم جو موج حباب ہے

آتش ہے سوز سینہ ہمارا مگر کہ میرؔ
نامے سے عاشقوں کے کبوتر کباب ہے

کیا کیا بیٹھے بگڑ بگڑ تم پر ہم تم سے بنائے گئے
چپکے باتیں اُٹھائے گئے سر گاڑے وہیں آئے گئے
اُٹھے نقاب جہان سے یارب جس سے تکلف بیچ میں ہے
جب نکلے اُس راہ سے ہو کر منھ تم ہم سے چھپائے گئے

دیوانِ دوم

میر تقی میرؔ دہلوی

برقع اُٹھتے ہی چاند سا نکلا | داغ ہوں اُس کی بےحجابی سے

کام تھے عشق میں بہت پر میر
ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے

دن دوریِ چمن میں جو ہم شام کریں گے | تا صبح دو صد نالہ سرانجام کریں گے
ہوگا ستم و جور سے تیرے ہی کنایہ | وہ شخص جہاں شکوۂ ایام کریں گے
آمیزشِ بیجا ہی تجھے جن سے ہمیشہ | وے لوگ ہی آخر تجھے بدنام کریں گے
نالوں سے مرے رات کے غافل نہ رہا کر | اک روز یہی دل میں ترے کام کریں گے

گر دل ہے یہی مضطرب الحال تو اے میر
ہم زیرِ زمیں بھی بہت آرام کریں گے

تھی گفتگوئے باغ فدک جڑ فساد کی ‌‌‌ ق ‌‌‌ جانے ہی جس کو علم ہی دیں کے اصول کا
دعویٰ جو حق شناسی کا رکھئے سو اس قدر ‌‌‌ پھر جان بوجھ کر لیے تلف حق بتول کا

پروائے حشر کیا ہی تجھے میرؔ شاد رہ
ہی عذر خواہ جرم جو وہ تجھ ملول کا

جو معتقد نہیں ہی علیؑ کے کمال کا ‌‌‌ ہر بال اُس کے تن پہ ہی موجب وبال کا
عزت علیؑ کی قدر علیؑ کی بہت ہی دور ‌‌‌ مورد ہی ذوالجلال کے عز و جلال کا
پایا علیؑ کو جا کے محمدؐ نے اُس جگہ ‌‌‌ جس جا نہ تھا لگاؤ گمان و خیال کا
رکھنا قدم پہ اُس کے قدم کب ملک سے ہو ‌‌‌ مخلوق آدمی نہ ہوا ایسی چال کا
شخصیت ایسی کس کی تھی ختم رسل کے بعد ‌‌‌ تھا مشورت شریک، حقِ لایزال کا
توڑا بتوں کو دوشِ نبی پر قدم کو رکھ ‌‌‌ چھوڑا نہ نام کعبہ میں کفر و ضلال کا
راہِ خدا میں اُن نے دیا اپنے بھی تئیں ‌‌‌ یہ جود منہ تو دیکھو کسو اشتمال کا
نسبت نہ بندگی کی ہوئی جس کی واں درست ‌‌‌ رونا مجھے ہی حشر میں اُس کی ہی چال کا

فکرِ نجات میرؔ کو کیا مدح خواں ہی وہ
اولاد کا علیؑ کی محمدؐ کی آل کا

لذت سے نہیں خالی جانوں کا کھپا جانا ‌‌‌ کب خضر و مسیحا نے مرنے کا مزا جانا
ہم جاہ و حشم یہاں کا کیا کہئے کہ کیا جانا ‌‌‌ خاتم کو سلیماں کی انگشترِ پا جانا
یہ بھی ہی ادا کوئی خورشید نمط پیارے ‌‌‌ منہ صبح دکھا جانا پھر شام چھپا جانا
کب بندگی میری سی بندہ کرے گا کوئی ‌‌‌ جانے ہی خدا اس کو میں تجھ کو خدا جانا
تھا ناز بہت ہم کو دانست پر اپنی بھی ‌‌‌ آخر وہ بُرا نکلا ہم جس کو بھلا جانا
گردن کشی کیا حاصل مانند بگولے کے ‌‌‌ اس دشت میں سر گاڑے جوں سیل چلا جانا
اس گریۂ خونیں کا ہو ضبط تو بہتر ہی ‌‌‌ اچھا نہیں چہرے پر لوہو کا بہا جانا
یہ نقش دلوں پر سے جانے کا نہیں اس کو ‌‌‌ عاشق کے حقوق آکر ناحق بھی مٹا جانا
ڈھب دیکھنے کا ایدھر ایسا ہی تمھارا تھا ‌‌‌ جاتے تو ہو پر ہم سے ٹک آنکھ ملا جانا
اس شمع کی مجلس میں جانا ہمیں پھر واں سے ‌‌‌ اک زخمِ زباں تازہ ہر روز اُٹھا جانا
ہی شورِ قیامت ہم سوتے ہی نہ رہ جاویں ‌‌‌ اس راہ سے نکلے تو ہم کو بھی جگا جانا

لکھنے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہر ذی حیات کا ہی سبب جو حیات کا
نکلے ہی جی ہی اس کے لئے کائنات کا

بکھرے ہی زلف اس رخِ عالم فروز پر
ورنہ بناؤ ہووے نہ دن اور رات کا

در پردہ وہ ہی معنی مقوم نہ ہوں اگر
صورت نہ پکڑے کام فلک کی ثبات کا

ہیں مستحیل خاک سے اجزائے نو خطاں
کیا سہل ہی زمیں سے نکلنا نبات کا

مستہلک اس کے عشق کے جانے ہیں قدرِ مرگ
عیسیٰ و خضر کو ہی مزا کب وفات کا

اشجار خامہ ہوویں جو آبِ سیہ بحار
لکھنا نہ تو بھی ہو سکے اس کی صفات کا

اس کے فروغِ حسن سے جھمکے ہی سب میں نور
شمعِ حرم ہو یا کہ دیا سومنات کا

بالذات ہی جہاں میں وہ موجود ہر جگہ
ہی دید چشمِ دل کے کھلے عین ذات کا

ہر صفحے میں ہی محو کلام اپنا دس جگہ
مصحف کو کھول دیکھ ٹک انداز بات کا

ہم مذہبوں میں صرف کرم سے ہی گفتگو
مذکور و ذکر یہاں نہیں صوم و صلوات کا

کیا میرؔ تجھ کو نامہ سیاہی کا فکر ہی
ختم رسل سا شخص ہی ضامن نجات کا

جلوہ نہیں ہی نظم میں حسنِ قبول کا
دیواں میں شعر گر نہیں نعتِ رسولؐ کا

حق کی طلب ہی کچھ تو محمدؐ پرست ہو
ایسا وسیلہ ہی بھی خدا کے حصول کا

مطلوب ہی زمان و مکان و جہان سے
محبوب ہی ملک کا فلک کا عقول کا

محمد کو ہم نے جان رکھا ہی وہی احد
مذہب کچھ اور ہو گا کسی بوالفضول کا

جن مرداں کو آنکھیں دیا ہی خدا نے وے
سرمہ کریں ہیں رہ کی تری خاکِ دھول کا

مقصود ہر علیؑ کا ولی کا سبھی کا تو
ہی قصد سب کو تیری رضا کے حصول کا

واعظ کو یہ جلن ہے شاید کہ فربہی سے
رہتا ہے حوض ہی میں اکثر پڑا مگر سا

اندازے سے ہے پیدا سب کچھ خبر ہے اس کو
گو میر بے سر و پا ظاہر ہے بے خبر سا

تیغِ ستم سے اس کی مرا سر جدا ہوا
شکرِ خدا کہ حقِ محبت ادا ہوا

قاصد کو دے کے خط نہیں کچھ بھیجنا ضرور
جاتا ہے اب تو جی ہی ہمارا چلا ہوا

وہ تو نہیں کہ اشک تھمے ہی نہ آنکھ سے
نکلے ہے کوئی لختِ دل اب سو جلا ہوا

حیران رنگِ باغِ جہاں تھا بہت کا
تصویر کی کلی کی طرح دل نہ وا ہوا

عالم کی بے فضائی سے تنگ آ گئے تھے ہم
جاگہ سے دل گیا جو ہمارا بجا ہوا

درپے ہمارے جی کے ہوا غیر کے لئے
انجامِ کار مدعی کا مدعا ہوا

اس کے گئے پہ دل کی خرابی نہ پوچھیے
جیسے کسو کا کوئی نگر ہو لٹا ہوا

بدتر ہے زیست مرگ سے ہجرانِ یار میں
بیمار دل بھلا نہ ہوا تو بھلا ہوا

کہتا تھا میر حال تو جب تک تو تھا بھلا
کچھ ضبط کرتے کرتے ترا حال کیا ہوا

تار و طور و طرز و روش کا یہ ڈھب ہے کیا
پہلے سلوک ایسے ہی تیرے تھے اب ہے کیا

م دل زدہ نہ رکھتے تھے تم سے یہ چشم داشت
کرتے ہو قہر لطف کی جاگہ غضب ہے کیا

رت بھی بعدِ ذلتِ بسیار چھیڑ ہے
مجلس میں جب خفیف کیا پھر ادب ہے کیا

ے ہم آپ میں تو نہ پہچانے پھر گئے
اس راہِ صعب عشق میں یارو تعب ہے کیا

اں ہیں اس دہن کے عزیزانِ خوردہ بیں
یہ بھی مقام ہائے! تامل طلب ہے کیا

ہیں جو ہوویں تیری تو توہین کر رکھے
عالم تمام گروہ نہیں تو یہ سب ہے کیا

ں آفتاب بن نہیں کچھ سوجھتا ہمیں
گریہ ہی اپنے دن ہیں تو تاریک شب ہے کیا

نے ہمیشہ جور و ستم بے سبب کئے
اپنا ہی ظرف تھا جو نہ پوچھا سبب ہے کیا

لکہ تمھاری بات کرے کوئی اعتبار
ظاہر میں کیا کہو ہو۔ سخن زیرِ لب ہے کیا

اس مہ بغیر میر کا مرنا عجب ہوا
ہرچند مرگِ عاشقِ مسکیں عجب ہے کیا

جھمکی دکھا کے طور کو جن نے جلا دیا
آئی قیامت ان نے جو پردا اٹھا دیا

کیا پانی کے مول آکر مالک نے گہر بیچا
ہے سخت گراں سستا یوسف کا بکا جانا

ہے میرے ترے نسبت روح اور جسد کی سی
کب آپ سے میں تجھ کو اے جان جدا جانا

جاتی ہے گزر جی پر اس وقت قیامت سی
یاد آوے ہے جب تیرا یکبار کی آ جانا

برسوں سے مری اس کی رہتی ہے یہی صحبت
تیغ اُس کو اٹھانا تو سر مجھ کو جھکا جانا

کب میر بسر آئے تم ویسے فریبی سے
دل کو تو لگا بیٹھے لیکن نہ لگا جانا

ہائے خطاب کیا کیا دیکھے عتاب کیا کیا
دل کو لگا کے ہم نے کھینچے عذاب کیا کیا

کاٹے ہیں خاک اڑا کر جوں گرد باد برسوں
گلیوں میں ہم ہوئے ہیں اُس بن خراب کیا کیا

کچھ گل سے ہیں شگفتہ کچھ سرو سے ہیں قدکش
اس کے خیال میں ہم دیکھے ہیں خواب کیا کیا

انواع جرم میرے پھر بے شمار و بے حد
روز حساب لیں گے مجھ سے حساب کیا کیا

اک آگ لگ رہی ہے سینوں میں کچھ نہ پوچھو
جل جل کے ہم ہوئے ہیں اُس بن کباب کیا کیا

افراط شوق میں تو رونق رہی نہ مطلق
کہتے ہیں میرے منہ پر اب شیخ و شاب کیا کیا

پھر پھر گیا ہے آکر منہ تک جگر ہمارے
گزرے ہیں جان و دل پر یہاں اضطراب کیا کیا

آشفتہ اُس کے گیسو جب سے ہوئے ہیں منہ پر
تب سے ہمارے دل کو ہے پیچ و تاب کیا کیا

کچھ سوجھتا نہیں ہے مستی میں میر جی کو
کرتے ہیں پوچھ کوئی پی کر شراب کیا کیا

دامن وسیع تھا تو کاہے کو چشم ترسا
رحمت خدا کی تجھ کو اے ابر زور برسا

شاید کباب کر کر کھایا کبوتراں نے
نامہ اُڑا پھرے ہے اُس کی گلی میں پرسا

وحشی مزاج ازبس مانوس بادیہ ہیں
ان کے جنوں میں جنگل اپنا ہوا ہے گھر سا

جس ہاتھ میں رہا کی اُس کی کمر ہمیشہ
اُس ہاتھ مارنے کا سر پر بندھا ہے کر سا

سب پیچ کی یہ باتیں ہیں شاعروں کی ورنہ
باریک اور نازک مو کب ہے اُس کمر سا

طرز نگاہ اُس کی دل لے گئی سبھوں کے
کیا مومن و برہمن کیا گبر اور ترسا

تم واقف طریق بے طاقتی نہیں ہو
یہاں راہ دو قدم ہے اب دور کا سفر سا

کچھ بھی معاش ہے یہ کی اُن نے ایک چشمک
جب مدتوں ہمارا جی دیکھنے کو ترسا

ٹک ترک عشق کرئے لاغر بہت ہوئے ہم
آدھا نہیں رہا ہے اب جسم رنج فرسا

ستم سے گو یہ ترے کشتۂ وفا نہ رہا
رہے جہان میں تو دیر میں رہا نہ رہا

کب اُس کا نام لیے غش نہ آگیا مجھ کو
دلِ ستم زدہ کس وقت اُس میں جا نہ رہا

ملانا آنکھ کا ہر دم فریب تھا دیکھا
پھر ایک دم میں وہ بے دید آشنا نہ رہا

موئے تو ہم پہ دلِ پُر کو خوب خالی کر
ہزار شکر کسو سے ہمیں گلا نہ رہا

اُدھر کھلی مری چھاتی اُدھر نمک چھڑکا
جراحت اس کو دکھانے کا اب مزا نہ رہا

ہوا ہوں تنگ بہت کوئی دن میں سن لیجو
کہ جی سے ہاتھ اُٹھا کر وہ اُٹھ گیا نہ رہا

قطعہ

ستم کا اس کے بہت میں نزار ہوں ممنون
جگر تمام ہوا خون و دل بجا نہ رہا

اگرچہ رہ گئے تھے استخوان و پوست ولے
لگائی ایسی کہ تسمہ بھی پھر لگا نہ رہا

حمیت اس کے تئیں کہتے ہیں جو میرؔ میں تھی
گیا جہاں سے پہ تیری گلی میں آ نہ رہا

کرتے ہی نہیں ترکِ بتاں طورِ جفا کا
شاید ہمیں دکھلا دیں گے دیدار خدا کا

ہے ابر کی چادر شفقی جوش سے گل کے
میخانے کے ہاں دیکھیے یہ رنگ ہوا کا

بہتیری گرو جنس کلالوں کے پڑی ہے
کیا ذکر ہے واعظ کے مصلیٰ و ردا کا

مر جائے گا باتوں میں کوئی غمزدہ یوں ہی
ہر لحظہ نہ ہو ممتحن اربابِ وفا کا

تدبیر تھی تسکیں کیلئے لوگوں کی ورنہ
معلوم تھا مدت سے ہمیں نفع دوا کا

ہاتھ آئینہ رویوں سے اُٹھا بیٹھیں کیونکر
بالعکس اثر پاتے تھے ہم اپنی دعا کا

آنکھ اس کی نہیں آئنہ کے سامنے ہوتی
حیرت زدہ ہوں یار کی میں شرم و حیا کا

برسوں سے تو یوں ہے کہ گھٹا جب اُمنڈ آئی
تب دیدۂ تر سے بھی ہوا ایک جھڑا کا

آنکھ اس سے نہیں اٹھنے کی صاحب نظروں کی
جس خاک پہ ہوگا اثر اُس کی کفِ پا کا

تلوار کے سایہ ہی میں کاٹے ہے تو اے میرؔ
کس دل زدہ کو ہوئے ہے یہ ذوقِ فنا کا

رہتا ہے ہڈیوں سے مرے جو ہما لگا
کچھ دردِ عاشقی کا اُسے بھی مزا لگا

غافل نہ سوزِ عشق سے رہ پھر کباب ہے
گر لائحہ اس آگ کا ٹک دل کو جا لگا

دیکھا ہمیں جہاں وہ تہاں آگ ہو گیا
بھڑکا رکھا ہے لوگوں نے اس کو لگا لگا

مہلت تنک بھی ہو تو سخن کچھ اثر کرے
میں اُٹھ گیا کہ غیر ترے کانوں آ لگا

اس فتنے کو جگا کے پشیماں ہوئی نسیم / کیا کیا عزیز لوگوں کو اس نے سلا دیا

اب بھی دماغ رفتہ ہمارا ہی عرش پر / گو آسماں نے خاک میں ہم کو ملا دیا

جاتی نہ قدر اس گہر شب چراغ کی / دل ریزۂ خذف کی طرح میں اٹھا دیا

تقصیر جان دینے میں ہم نے کبھو نہ کی / جب تیغ وہ بلند ہوئی سر جھکا دیا

گرمی چراغ کی سی نہیں وہ مزاج میں / اب دل فسردگی سے ہوں جیسے بجھا دیا

وہ آگ ہو رہا ہی خدا جانے غیر نے / میری طرف سے اس کے تئیں کیا لگا دیا

آنا کہا تھا فرش تری رہ کے ہم ہوں کاش / سو تو نے مار مار کے آ کر بچھا دیا

اب گھٹتے گھٹتے جان میں طاقت نہیں رہی / ٹک لگ چلی صبا کہ دیا سا بڑھا دیا

تنگی لگا ہی کرنے دم اپنا بھی ہر گھڑی / کڑھنے نے دل کے جی کو ہمارے کھپا دیا

کی چشم تو نے باز کہ کھولا در ستم / کس مدعی خلق نے تجھ کو جگا دیا

کیا کیا زیان میر نے کھینچے ہیں عشق میں / دل ہاتھ سے دیا ہی جدا سر جدا دیا

بہتوں کو آگے تھا یہی آزار عشق کا / جیتا رہا ہی کوئی بھی بیمار عشق کا

بے پردگی بھی چاہ کا ہوتا ہی لازمہ / کھلتا ہی ہر ندان یہ اسرار عشق کا

زندانی سیکڑوں مرے آگے رہا ہوئے / چھوٹا نہ میں ہی تھا جو گنہگار عشق کا

خواہان مرگ میں ہی ہوا ہوں مگر نیا / جی بیچتے ہی پھرے ہی خریدار عشق کا

منصور نے جو سر کو کٹایا تو کیا ہوا / ہر سر کہیں ہوا ہی سزاوار عشق کا

جاتا وہی سنا ہمہ حسرت جہاں سے / ہوتا ہی جس کسو سے بہت بے ہم عشق کا

پھر بعد میرے آج تلک سر نہیں بکا / اک عمر سے کساد ہی حیران عشق کا

لگ جاوے دل کہیں تو اسے جی میں اپنے رکھ / رکھتا نہیں شگون کچھ اظہار عشق کا

چھوٹا جو مر کے قید عبارات میں پھنسا / القصہ کیا رہا ہو گرفتار عشق کا

ق
مشکل ہی عمر کاٹنی تلوار کے تلے / سر میں خیال گو کہ رکھیں یار عشق کا

وصال ستموں کے دعوی کو دیکھا ہی ہمیں قطع / پورا جہاں لگا ہی کوئی وار عشق کا

کھو ہی رہا نہ جان کو نا آزمودہ کار / ہوتا نہ میر کاش طلبگار عشق کا

میں جو کہا اک آگ سی سلگے ہے دل کے بیچ
کہنے لگا کہ یوں ہی کوئی دن تو جل پڑا

بل کیوں نہ کھائیے کہ لگا رہنے اب تو وھاں
بالوں میں اور پیچ میں پگڑی کے بل پڑا

تھے اختلال اگرچہ مزاجوں میں کب سے ایک
ملنے میں اُس بلا کے نہایت خلل پڑا

رہتا نہیں ہے آنکھ سے آنسو ترے لئے
دیکھی جو ایسی شئ تو یہ لڑکا مچل پڑا

سر اُس کے پاؤں سے نہیں اٹھتے ستم ہے میر
گر خوش غلاف نیمچہ اُس کا اُگل پڑا

دل فرطِ اضطراب سے سیماب سا ہوا
چہرہ تمام زرد زرِ ناب سا ہوا

شاید جگر گداختہ یک لخت ہو گیا
کچھ آب دیدہ اب سے خوں ناب سا ہوا

دے دن گئے کہ اشک سے چھڑکاؤ سا کیا
اب رونے لگ گئے ہیں تو تالاب سا ہوا

اک دن کیا تھا یار نے قد ناز سے بلند
خجلت سے سرو جوئے چمن آب سا ہوا

کیا اور کوئی روئے کہ اب جوشِ اشک سے
حلقہ ہماری چشم کا گرداب سا ہوا

قصہ تو مختصر تھا دلے طول کو کھنچا
ایجاز دل کے شوق سے اطناب سا ہوا

عمامہ ہے مؤذنِ مسجد کہ بارِ سر
قد تو ترا خمیدہ ہو محراب سا ہوا

بات اب تو سن کہ جائے سخن حسن میں ہوئے
خط پشت لب کا سبزۂ سیراب سا ہوا

چل باغ میں بھی سوتے سے اُٹھ کر کبھو کہ گل
تک تک کے راہ دیدۂ بے خواب سا ہوا

سمجھے تھے ہم تو میر کو عاشق اُسی گھڑی
جب سن کے تیرا نام وہ بیتاب سا ہوا

دیکھ آرسی کو یار ہوا محو ناز کا
خانہ خراب ہو جیو آئینہ ساز کا

ہوتا ہے کون دست بسر واں غرور سے
گالی ہے اب جواب سلام نیاز کا

ہم تو سمندِ ناز کے پامال ہو چکے
اس کو وہی ہے شوق ابھی ترک تاز کا

ہے کیمیا گرانِ محبت میں قدر خاک
پر وقر کچھ نہیں ہے دلِ بے گداز کا

اس لطف سے نہ غنچۂ نرگس کھلا کبھو
کھلنا تو دیکھ اس مژۂ نیم باز کا

کوتاہ تھا فسانہ جو مر جاتے ہم شتاب
جی پر وبال سب ہے یہ عمر دراز کا

مارا نہ اپنے ہاتھ سے مجھ کو ہزار حیف
کشتہ ہوں یار میں تو ترے امتیاز کا

لگتی ہے یوں پلک کہ گڑی دل میں جا بجا
انداز دیدنی ہے مرے دل نواز کا

اب آبِ چشم ہی ہی ہمارا محیطِ خلق ۔ دریا کو ہم نے کب کا کنارے رکھا لگا
ہر چند اس کی تیغِ ستم تھی بلند لیک ۔ وہ طور بد ہمیں تو قیامت بھلا لگا
مجلس میں اس کی بار نہ مجھ کو ملی کبھو ۔ دروازے ہی سے گرچہ بہت میں رہا لگا
بوسہ لبوں کا مانگتے ہی منہ بگڑ گیا ۔ کیا اتنی میری بات کا تم کو برا لگا

عالم کی سیر میر کی صحبت میں ہو گئی
طالع سے میرے ہاتھ یہ بے دست و پا لگا

خط سے وہ زور صفائے حسن اب کم ہو گیا ۔ چاہِ یوسفؑ تھا ذقن سو چاہِ رستم ہو گیا
سینہ کوبی سنگ سے دل خون ہونے میں رہی ۔ حق بجانب تھا ہمارے سخت ماتم ہو گیا
ایک سا عالم نہیں رہتا ہے اس عالم کے بیچ ۔ اب جہاں کوئی نہیں یاں ایک عالم ہو گیا
آنکھ کے لڑتے تری آشوب سا برپا ہوا ۔ زلف کے درہم ہوئے اک جمع برہم ہو گیا
اس لب جاں بخش کی حسرت نے مارا جان سے ۔ آبِ حیواں یمن طالع سے مرے سم ہو گیا
وقت تب تک تھا تو سجدہ مسجدوں میں کفر تھا ۔ فائدہ اب جبکہ قد محراب سا خم ہو گیا
عشق ان شہری غزالوں کا جنوں کو اب کھنچا ۔ وحشتِ دل بڑھ گئی آرامِ جاں رم ہو گیا
جی کھنچے جاتے ہیں فرطِ شوق سے آنکھوں کی اور ۔ جن نے دیکھا ایک دم اس کو سو لے دم ہو گیا
ہم نے جو کچھ اس سے دیکھا سو خلافِ چشم داشت ۔ اپنا عزرائیل وہ جانِ مجسم ہو گیا

کیا کہوں کیا طرحیں بدلیں چاہ نے آخر کو میر
تھا گرہ جو درد چھاتی میں سو اب غم ہو گیا

کیفی ہو کیوں تو ناز سے پھر گرم رہ ہوا ۔ برسوں سے صوفیوں کا مصلیٰ تو تہ ہوا
معلوم تیرے چہرۂ پرنور کا سا لطف ۔ بالفرض آسماں پہ گیا پھول مہ ہوا
پوچھ اس سے دردِ ہجر کو جس کا بہ نازکی ۔ جا گہ سے اپنے عضو کوئی بے جگہ ہوا
ہم پلہ اپنا کون ہے اس معرکے کے بیچ ۔ کس کی ترازو یار کا تیرِ نگہ ہوا

ایسا فقیر ہونا بھلا کیا ضرور تھا
دونوں جہاں میں میر عبث روسیہ ہوا

مذکور میری سوختگی کا جو چل پڑا ۔ مجلس میں سن سپند یکایک اچھل پڑا
پہنچے ہے کوئی اس تنِ نازک کے لطف کو ۔ گل گو چمن میں جامے سے اپنے نکل پڑا

وہ ترکِ مست کسو کی خبر نہیں رکھتا
کہ میں شکارِ زبوں ہوں جگر نہیں رکھتا

بلا سے آنکھ جو پڑتی ہے اُس کی دس جاگہ
ہمارا حال تو مدِ نظر نہیں رکھتا

رہے نہ کیونکہ یہ دل باختہ سدا تنہا
کہ کوئی آوے کہاں میں تو گھر نہیں رکھتا

جنھوں کے دم میں ہے تاثیر اور ہیں وے لوگ
ہمارا نالۂ جانکاہ اثر نہیں رکھتا

کہیں ہیں اب کی بہت رنگ اُڑ چلا گل کا
ہزار حیف کہ میں بال و پر نہیں رکھتا

تو کوئی زور ہی نسخہ ہے اے مفرّحِ دل
کہ طبع عشق میں ہرگز ضرر نہیں رکھتا

خدا کی اُور سے ہے سب یہ اعتبار نہ
جو خوب دیکھو تو میں کچھ ہنر نہیں رکھتا

غلط ہے دعوئِ عشق اس فضول کا بے ریب
جو کوئی خشک لب و چشم تر نہیں رکھتا

جدا جدا پھرے ہے میرؔ سب سے کس خاطر
خیال ملنے کا اُس کے اگر نہیں رکھتا

گیا میں جان سے وہ بھی جو ٹک آتا تو کیا ہوتا
قدم دو ساتھ میری نعش کے جاتا تو کیا ہوتا

پھرا تھا دور اُس سے مدتوں میں کوہ و صحرا میں
بلا کر پاس اپنے مجھکو بٹھلاتا تو کیا ہوتا

ہوئے آخر کو سارے کام ضائع ناشکیبی سے
کوئی دن اور تابِ ہجر دل لاتا تو کیا ہوتا

دمِ بسمل ہمارے زیرِ لب کچھ کچھ کہا سب نے
جو وہ بے رحم بھی کچھ منہ سے فرماتا تو کیا ہوتا

کہے سے غیر کے وہ توڑ بیٹھا وو ہیں یاروں سے
گئے جاتا اگر ٹک چاہ کا ناتا تو کیا ہوتا

کبھو سرگرمِ بازی ہمدموں سے یہاں بھی آ جاتا
ہمیں یک چند اگر وہ اور بہلاتا تو کیا ہوتا

گئے لے میرؔ کو کل قتل کرنے اُس کے در پر سے
ہو وہ بھی گھر سے باہر اپنے ٹک آتا تو کیا ہوتا

میں غش کیا جو خط لے اُدھر نامہ بر چلا
یعنی کہ فرطِ شوق سے جی بھی اُدھر چلا

شُدہ لے گئی تری بھی کوئی زلفِ مشکبو
گیسوئے پیچدار جو منہ پر بکھر چلا

لڑکا ہی تھا نہ قاتلِ ناکردہ خوں ہنوز
کپڑے گلے کے سارے مرے خوں میں بھر چلا

ہے مایۂ حیات گیا جس کنے سے تو
آفت رسیدہ پھر وہ کوئی دم میں مر چلا

تیاری آج رات کہیں رہنے کی سی ہے
کس خانماں خراب کے اے مہ تو گھر چلا

دیکھوگے کوئی گوشہ نشیں ہو چکا غریب
تیرِ مژہ اُس ابرو کماں کا اگر چلا

بے مے رہا بہار میں ساری ہزار حیف
لطفِ ہوائے شیخ بہت بے خبر چلا

پھر میرؔ آج مسجدِ جامع کے تھے امام
داغِ شراب دھوتے تھے کل جا نماز کا

غم ابھی کیا محشرِ مشہور کا
شور سا ہے تو ولیکن دُور کا

حق تو سب کچھ ہی ہے تو ناحق نہ بول
بات کہتے سر کٹا منصور کا

بیچ سے کب کا گیا اب ذکرِ لب
اُس دلِ مرحوم کا مغفور کا

طرفہ آتش خیز سنگستان ہے دل
مقتبس یہاں سے ہے شعلہ طور کا

ق
مر گئے پر خاک ہے سب کبر و ناز
مت جھکو سر گو کسو مغرور کا

ٹھیکرے کو قدر ہے اس کو نہیں
ٹوٹے جب کاسہ سرِ فغفور کا

ق
ہو کھڑا وہ تو پری سی ہے کھڑی
مُنہ کھلے تو جیسے چہرہ حور کا

دیکھ اُسے کیونکر ملک جھپکیں نہوں
آنکھ کے آگے یہ پُتلا نور کا

چشم بہنے سے کبھو رہتی نہیں
کچھ علاج ای میرؔ اس ناسور کا

نظر میں طور رکھ اس کم نما کا
بھروسا کیا ہے عمرِ بے وفا کا

گلوں کے پیرہن ہیں چاک سارے
کھلا تھا کیا کہیں بند اُس قبا کا

پرستش اب اسی بت کی ہے ہر سو
رہا ہوگا کوئی بندہ خدا کا

بلا ہیں قادر انداز اس کی آنکھیں
کیا یکہ جنازہ جس کو تاکا

بچا ہے عمر سے اب ایک حسرت
گیا وہ شور سر کا زور پا کا

مداوا خاطروں سے تھا وگرنہ
ہدایت مرتبہ تھا انتہا کا

لگا تھا روگ جب سے یہ تبھی سے
اثر معلوم تھا ہم کو دوا کا

مروت چشم رکھنا سادگی ہے
نہیں شیوہ یہ اپنے آشنا کا

کہیں اُس زلف سے کیا لگ چلی ہے
پڑے ہے پانوں بے ڈھب کچھ صبا کا

نکالو تو دیر صوفی خانقہ سے
ہمیں تو پاس ہے ابر و ہوا کا

ق
نکالو میرؔ کو ایسا ہی چپکا
نمونہ ہے یہ آشوبِ بلا کا

کرو دن ہی سے رخصت ورنہ شب کو
نہ سونے دیگا شور اس بے نوا کا

بارے کل بھڑ گئے اس ظالمِ خونخوار سے ہم
منصفی کیجے تو کچھ کم نہ جگر ہم نے کیا

اُس رُخ و زلف کی تسبیح ہی یہاں اکثر میر
وِرد اپنا ہی اب شام و سحر ہم نے کیا

اس قدر آنکھیں چھپاتا ہی تو ای مغرور کیا
ٹک نظر ایدھر نہیں کہ اس سے ہی منظور کیا

وصل و ہجراں سے نہیں ہی عشق میں کچھ گفتگو
لاگ دل کی چاہیئے ہی یہاں قریب و دور کیا

ہو خرابی اور آبادی کی عاقل کو تمیز
ہم دِوانے ہیں ہمیں ویران کیا معمور کیا

اُٹھ نہیں سکتا ترے دَر سے شکایت کیا مری
حال میں اپنے ہوں عاجز میں مجھے مقدور کیا

سب ہیں یکساں جب فنا یکبارگی طاری ہوئی
ٹھیکرا اس مرتبے میں کیا سرِ فغفور کیا

لطف کے حرف و سخن پہلے جو تھے بہرِ فریب
مدتیں جاتی ہیں اُن باتوں کا اب مذکور کیا

دیکھ بہتی آنکھ میری ہنس کے بولا کل وہ شوخ
یہ نہیں اب تک ہوا مُنہ کا ترے ناسور کیا

میں تو دیکھوں ہوں تمھارے مُنہ کو تم نے دل لیا
تم مجھے رہتے ہو اکثر مجلسوں میں گھور کیا

ابر سا روتا جو میں نکلا تو بولا طنز سے
آرسی جا دیکھ گھر بر سے ہی مُنہ پر نور کیا

سنگِ بالیں میر کا جو باٹ کا روڑا ہوا
سخت کر جی کو گیا اس جا سے وہ رنجور کیا

جوں ابرِ قبلہ دل ہی نہایت ہی بھر رہا
رونا مرا سنوگے کہ طوفان کر رہا

شب میکدہ سے وارِدِ مسجد ہوا تھا میں
پر شکر ہی کہ صبح تئیں بے خبر رہا

دل جس سے ایکبار نہ پھر تو ہوا دو چار
رُک رُک کے وہ ستمزدہ ناچار مر رہا

تسکینِ دل ہو تب کہ کبھو آ گیا بھی ہو
برسوں سے اس کا آنا ہی صبح پر رہا

اس زلف و رخ کو بھولے مجھے مدتیں ہوئیں
لیکن مرا نہ گریۂ شام و سحر رہا

رہتے تو تھے مکاں پہ ولے آپ میں نہ تھے
اُس بن ہمیں ہمیشہ وطن میں سفر رہا

اب چھیڑ یہ رکھی ہی کہ پوچھے ہی بار بار
کچھ وجہ بھی کہ آپ کا منہ ہی اُتر رہا

الدم میں یہ عجب کہ مرے سر پہ پھر گیا
جو آبِ تیغ برسوں تری تا کمر رہا

کاہے کو میں نے میر کو چھیڑا کہ ان نے آج
یہ دردِ دل کہا کہ مجھے دردِ سر رہا

دل دفعۃً جنون کا مہیا سا ہو گیا
دیکھی کہاں وہ زلف کہ سودا سا ہو گیا

کیا جانیے ملاپ کسے کہتے ہیں یہ لوگ
برسوں ہوئے کہ ہم سے تو وہ ہی لڑا ہوا

بحرِ بلا سے کوئی نکلتا مرا جہاز
بارے خدائے عزّ و جل ناخدا ہوا

اس بحر میں اک اور غزل تو بھی میر کہہ
دریا تھا تو تو تیری روانی کو کیا ہوا

اس کام و جان و دل سے جو کوئی جدا ہوا
دیکھا پھر اُس کو خاک میں ہم نے ملا ہوا

گر ترک گرچہ بیٹھے ہیں پر ہے وہی تلاش
رہتا نہیں ہے ہاتھ ہمارا اُٹھا ہوا

کھینچا بغل میں میں جو اُسے مست پا کے رات
کہنے لگا کہ آپ کو بھی اب نشا ہوا

نے صبر ہے نہ ہوش ہے نے عقل ہے نہ دین
آتا ہے اُس کے پاس سے عاشق لٹا ہوا

اُٹھتا ہے میرے دل سے کبھو جوش سا تو پھر
جاتا ہے دونوں آنکھوں سے دریا بہا ہوا

جوں صیدِ نیم کشتہ تڑپتا ہے ایک سا
کیا جانیے کہ دل کو مرے کیا بلا ہوا

خط آئے پر جو گرم وہ پرکار مل چلا
میں سادگی سے جانا کہ اب آشنا ہوا

ہم تو لگے کنارے ہوئے غیر ہمکنار
ایکوں کی عید ایکوں کے گھر میں دہا ہوا

جوں برق مجھ کو ہنستے نہ دیکھا کسو نے آہ
پایا تو ابر سا کہیں روتا کھڑا ہوا

جس شعر پر سماع تھا کل خانقاہ میں
وہ آج میں سُنا تو ہے میرا کہا ہوا

پایا مجھے رقیب نے آ اُس کی زیرِ تیغ
دل خواہ بارے مدعی کا مدعا ہوا

بیمارِ مرگ سا تو نہیں روز اب بتر
دیکھا تھا ہم نے میر کو کچھ تو بھلا ہوا

کل دل آزردہ گلستاں سے گزر ہم نے کیا
گل لگے کہنے کہو منھ نہ اُدھر ہم نے کیا

گر گئی خواب سے بیدار نہیں صبح کی باد
بے دماغ اتنے جو ہو ہم پہ مگر ہم نے کیا

سیدھی تلوار کے مُنہ پر ترے ہم آئے چلے
کیا کریں اس دلِ خستہ کو سپر ہم نے کیا

نیمچہ ہاتھ میں مستی سے لہو سی آنکھیں
سج تری دیکھ کر اے شوخ حذر ہم نے کیا

پاؤں کے نیچے کی مٹی بھی نہ ہوگی ہم سی
کیا کہیں عمر کو اس طرح بسر ہم نے کیا

کھا گیا ناخنِ سر تیز جگر دل دونوں
رات کی سینہ خراشی میں ہنر ہم نے کیا

کام اُن ہونٹھوں سے وہ لے جو کوئی ہم سا ہو
دیکھتے دیکھتے آنکھوں میں گھر ہم نے کیا

جیسے حسرت لئے جاتا ہے جہاں سے کوئی
آہ یوں کوچۂ دلبر سے سفر ہم نے کیا

غنچہ ہی وہ دہان ہی گویا — ہونٹھ پر رنگِ پان ہی گویا

میرے مرنے سے بھی وہ چونکے ہی — اب تلک مجھ میں جان ہی گویا

چاہیے جیتے گزرے اس کا نام — منہ میں جب تک زبان ہی گویا

سربسر کیں ہی لیک وہ پرکار — دیکھو تو مہربان ہی گویا

حیرتِ روئے گل سے مرغِ چمن — چپ ہی یوں بے زبان ہی گویا

مسجد ایسی بھری بھری کب ہی — میکدہ اک جہان ہی گویا

جائے ہی شور سے فلک کی طرف — نالۂ صبح بان ہی گویا

بسکہ ہیں اس غزل میں شعر بلند — یہ زمین آسمان ہی گویا

وہی شورِ مزاج شیب میں ہی
میر اب تک جوان ہی گویا

ان سختیوں میں کس کا میلان خواب پر تھا — بالیں کی جائے ہر شب یہاں سنگ زیرِ سر تھا

ان ابرو و مژہ سے کب میرے جی میں ڈر تھا — تیغ و سناں کے منہ پر اکثر مرا جگر تھا

ان خوبصورتوں کا کچھ لطف کم ہی مجھ پر — یک عمر ورنہ اس جا پریوں ہی کا گزر تھا

تیشے سے کوہکن کے کیا طرفہ کام نکلا — اپنے تو ناخنوں میں اس طور کا ہنر تھا

عصمت کو اپنی وھاں تو روئے ملک پھریں ہیں — لغزش ہوئی جو مجھ سے کیا عیب ہیں بشر تھا

کل ہم وہ دونوں یکجا ناگاہ ہوگئے تھے — وہ جیسے برقِ خاطف میں جیسے ابرِ تر تھا

ہوش اڑ گئے سبھوں کے شورِ سحر سے اُس کے — مرغِ چمن اگرچہ یکمشت بال و پر تھا

پھر آج یہ کہانی کل شب پہ رہ گئی ہی — سوتا نہ رہتا ٹک تو قصہ ہی مختصر تھا

رشک اس شہید کا ہی خضر و مسیح کو بھی — جو کشتہ اُس کی جانب دو گام پیشتر تھا

ہشیاری اس کی دیکھو کیفی ہو مجھ کو مارا — تا اُن کے سب کہیں یہ وہ مست و بیخبر تھا

صد رنگ ہی خرابی کچھ تو بھی رہ گیا ہی — کیا نقل کریے یارو دل کوئی گھر سا گھر تھا

تھا وہ بھی اک زمانہ جب نالے آتشیں تھے — چاروں طرف سے جنگل جلتا دہردہر تھا

جب نالہ کش ہوا وہ تب مجلسیں رلائیں
تھا میر دل شکستہ یا کوئی نوحہ گر تھا

تیغ لے کر کیوں تو عاشق پر گیا — زیرِ لب جب کچھ کہا وہ مر گیا

ٹک جوش سنا اُٹھا تھا مرے دل سے رات کو — دیکھا تو ایک پل ہی میں دریا سا ہو گیا
بے رونقیِ باغ ہی جنگل سے بھی پرے — گل سوکھ تیرے ہجر میں کانٹا سا ہو گیا
جلوہ ترا تھا جب تئیں باغ و بہار تھا — اب دل کو دیکھتے ہیں تو صحرا سا ہو گیا
کل تک تو ہم وے ہنستے چلے آئے تھے ہیں — مرنا بھی میر جی کا تماشا سا ہو گیا

دل کی واشد کیلئے کل باغ میں میں ٹک گیا — سن گلہ بلبل سے گل کا اور بھی جی رک گیا
عشق کی سوزش نے دل میں کچھ نچھوڑا کیا کہیں — لگ اٹھی یہ آگ ناگاہی کہ گھر سب پھک گیا
ہم نہ کہتے تھے کہ غافل خاک ہو پیش از فنا — دیکھ اب پیری میں قد تیرا کدھر کو جھک گیا
خدمت معقول ہی سب منغبچے کرتے رہے — شیخ آیا میکدے کی اور جب تب تھک گیا
میر اس قاضی کے لونڈے کے لئے آخر موا — سب کو قضیہ اس کے جینے کا تھا بارے چک گیا

پھرتا ہی زندگی کے لئے آہ خوار کیا — اس وہم کی نمود کا ہی اعتبار کیا
کیا جانیں ہم اسیر قفس زاد ای نسیم — گل کیسے باغ کہتے ہیں کس کو بہار کیا
آنکھیں برنگ نقش قدم ہو گئیں سفید — پھر اور کوئی اس کا کرے انتظار کیا
سیکھی ہی طرح سینہ فگاری کی سب مری — لائے تھے ساتھ چاک دل ایسا انار کیا
سرکش کسو سے ایسی کدورت رکھے وہ شوخ — ہم اس کی خاک راہ ہیں ہم غبار کیا
نے وہ نگہ چبھی ہی نہ وے پلکیں گڑ گئیں — کیا جانئے کہ دل کو ہی یہ خار خار کیا
لیتا ہی ابر اب تئیں اس ناچیے سے آب — روئے ہیں ہم بھی برسوں تئیں زار زار کیا
عاشق کے دل سے رکھ نہ تسلی کی چشم داشت — ہی برق پارہ یہ اسے آدے قرار کیا
صحبت رہی بگڑتی ہی اس کینہ ور سے آہ — ہم جانتے نہیں ہیں کہ تو ہی پیار کیا
مارا ہو ایک دو کو تو ہو مدعی کوئی — کشتوں کا اس کے روز جزا ہیں شمار کیا
مدت سے جرگہ جرگہ سر تیر ہیں غزال — کم ہو گیا ہی یاروں کا ذوق شکار کیا (یار کا)
بلتے ہیں اپنے حال میں مجبور سب کو ہم — کہنے کو اختیار ہی پر اختیار کیا
آخر زمانہ سازی سے کھویا نہ وقر میر — یہ اختیار تم نے کیا روزگار کیا

ﻪ مرزا غالب: دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں — آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا۔

کب تھی جرأت رقیب کی اتنی / تم نے بھی کچھ کیا تغافل سا

یک نگہ ایک چشمک ایک سخن / اس میں بھی تم کو ہے تامل سا

بارے مستوں نے ہوشیاری کی / دے کے کچھ محتسب کا منہ جھلسا

شرم آتی ہے پہنچتے اودھر / خط ہوا شوق سے ترسل سا

ٹوٹی زنجیر پائے میر مگر / رات سنتے رہے ہیں ہم غل سا

چمن میں جا کے جو میں گرم وصف یار ہوا / گل اشتیاق سے میرے گلے کا ہار ہوا

تمھارے ترکش مژگاں کی کیا کروں تعریف / جو تیر اس سے چلا سو جگر کے پار ہوا

ہماری[1] خاک پہ اک بیکسی برستی ہے / ادھر سے ابر جب آیا تب اشکبار ہوا

کریں نہ کیونکہ یہ مژگاں بلند پروازی / انھوں کا طائر سدرہ نشیں شکار ہوا

کبھو بھی اس کو تہ دل سے ملتے پایا پھر / فریب تھا وہ کوئی دن جو ہم سے یار ہوا

بہت دنوں سے درونے میں اضطراب سا تھا / جگر تمام ہوا خون تب قرار ہوا

شکیب میر جو کرتا تو وقر رہ جاتا / ادھر کو جا کے عبث یہ حبیب خوار ہوا

ایک دل کو ہزار داغ لگا / اندرونے[2] میں جیسے باغ لگا

اس سے یوں گل نے رنگ پکڑا ہے / شمع سے جیسے لیں چراغ لگا

خوبی یک پیچہ بند خوباں کی / خوب باندھوں گا گر دماغ لگا

پاؤں دامن میں کھینچ لیں گے ہم / ہاتھ گر گوشۂ فراغ لگا

میر اس بے نشاں کو پایا جان / کچھ ہمارا اگر سراغ لگا

تیغ کی اپنی صفت لکھتے جو کل وہ آگیا / ہنس کے اس پرچے کو میرے ہی گلے بندھوا گیا

دست و پا گم کرنے سے میرے کھلے اسرار عشق / دیکھ کر کھویا گیا سا مجھ کو ہر یک پا گیا

داغ محجوبی ہوں اس کا میں کہ میرے روبرو / عکس اپنا آرسی میں دیکھ کر شرما گیا

ہم بشر عاجز ثبات پا ہمارا کس قدر / دیکھ کر اس کو ملک سے بھی نہ یہاں ٹھہرا گیا

یار کے بالوں کا بندھنا تھا ہی پگڑی کے ساتھ / ایک عالم دوستاں اس پیچ میں مارا گیا

[1] میر تقی میر سے ادھر سے ابر جو اٹھ کر گیا ہے۔ ہماری خاک پر بھی رو گیا ہے۔ [2] اندرونے یعنی دل باطن۔

تڑپے زیرِ تیغ ہم بے ڈول آہ
دامنِ پاک اس کا خوں میں بھر گیا

خاک ہو پکڑے اگر سونا بھی پھر
ہاتھ سے جس کے وہ سیمیں بر گیا

کیا بندھا ہے اس کے کوچے میں طلسم
پھر نہ آیا جو کوئی اودھر گیا

خانداں کیا کیا ہوئے اس بن خراب
آج تک وہ شوخ کس کے گھر گیا

ابرو و مژگاں ہی میں کاٹی ہے عمر
کیا سنان و تیغ سے میں ڈر گیا

کہتے ہیں ضائع کیا اپنے تئیں
میر تو دانا تھا یہ کیا کر گیا

جی رک گئے اے ہمدم دل خون ہو بھر آیا
اب ضبط کریں کب تک منہ تک تو جگر آیا

تھی چشم دمِ آخر وہ دیکھنے آوے گا
سو آنکھوں میں جی آیا پر وہ نہ نظر آیا

بے شدھ پڑے ہیں سارے سجادوں پہ اسلامی
دارو پیئے وہ کافر کاہے کو ادھر آیا

ہر خستہ ترا خواہاں یک زخمِ دگر کا تھا
کی مشقِ ستم تو نے پر خون نہ کر آیا

گل برگ ہی کچھ تنہا پانی نہیں خجلت سے
جنبش سے ترے لب کی یاقوت بھی تر آیا

بالفعل تو ہے قاصد محو اس خط و گیسو کا
ٹک چیتے تو ہم پوچھیں کیا لے کے خبر آیا

تابوت پہ بھی میرے پتھر پڑے لے جاتے
اس نخل میں ماتم کے کیا خوب ثمر آیا

ہے حق بطرف اس کے یوں جس کے گیا ہو تو
سج ایسی تری دیکھی ہم کو بھی خطر آیا

کیا کہیے کہ پتھر سے سر مارتے ہم گزرے
یوں اپنا زمانہ تو بن یار بسر آیا

صنعت گریاں[1] ہم نے کیں سیکڑوں یہاں لیکن
جس سے کبھو وہ ملتا ایسا نہ ہنر آیا

در ہی کے تئیں تکتے پتھرا گئیں آنکھیں تو
وہ ظالمِ سنگیں دل کب میر کے گھر آیا

یار ہے میر کا مگر گل سا
کہ سحر نالہ کش ہے بلبل سا

یہاں کوئی اپنی جان دو دشوار
وہاں وہی ہے سو ہے تساہل سا

دود دل کو ہمارے ٹک دیکھو
یہ بھی پُرپیچ اب ہے کاکل سا

شوق ان اس کے لمبے بالوں کا
یہاں چلا جائے ہے تسلسل سا

[1] آزاد، معاصر دلی سے آئیں جہاں کی ساری آزاد صنعتیں پر ؎ جس سے کہ یار ملتا ایسا ہنر نہ آیا
میر تقی میر سے صنعت گریاں بہتیری کیں لیک دریغ ہزار دریغ ؎ جس سے یار بھی ملتا ہم سے ایسا وہ ہنر نہ آیا

عزت و عشق کہاں جمع ہوئے اے ہمدم
ننگ خواری تھا اگر دل کا لگانا کیا تھا

گر خطِ سبز سے اس کے نہ تھیں تھی کچھ لاگ
پھر بھلا میر جی یہ زہر کا کھانا کیا تھا

وارد گلشن غزل خواں وہ جو کل سحر یہاں ہوا
دامن گل گریۂ خونیں سے سب افشاں ہوا

طائران باغ کو تھا بیت بحثی کا دماغ
پر ہر اک دردِ سخن سے میر کے نالاں ہوا

دل کی آبادی کو پہنچا اپنے گویا چشمِ زخم
دیکھتے ہی دیکھتے یہ شہر سب ویراں ہوا

سبز بختی پر ہے اس کے طائرِ سدرہ کو رشک
جو شکار اس تیغ کے سایہ تلے بیجاں ہوا

خاک پر بھی دوڑتی ہے چشمِ مہر و ماہ چرخ
کس دلی الطبع کے گھر جا کے میں مہماں ہوا

تھا جگر میں جب تلک قطرہ ہی تھا خوں کا سرشک
اب جو آنکھوں سے تجاوز کر چلا طوفاں ہوا

اس کے میرے بیچ میں آئینہ آیا تھا و لے
صورتِ احوال ساری دیکھ کر حیراں ہوا

دل نے خوں ہو عشق خوباں میں بھی کیا بد ہے رنگ
چہروں کو غازہ ہوا ہونٹھوں کا رنگِ پاں ہوا

تم جو کل اس راہ نکلے برق سے ہنستے گئے
ابر کو دیکھو کہ جب آیا ادھر گریاں ہوا

جی سے جانا بن گیا اس بن ہمیں پل مارتے
کام تو مشکل نظر آتا تھا پر آساں ہوا

جب سے ناموسِ جنوں گردن بندھا ہے تب سے میر
جیبِ جاں وابستۂ زنجیر تا داماں ہوا

آیا ہے ابر جب کا قبلے سے تیرا تیرا
مستی کے ذوق میں ہیں آنکھیں بہت ہی خیرا

خجلت سے ان لبوں کے پانی ہو بہ چلے ہیں
قند و نبات کا بھی نکلا ہے خوب شیرا

مجنوں نے حوصلے سے دیوانگی نہیں کی
جاگہ سے اپنی جانا اپنا نہیں وتیرا

اس راہزن سے مل کر دل کیونکہ کھو نہ بیٹھیں
انداز و ناز اچکے، غمزہ اٹھائی گیرا

کیا کم ہے ہولناکی صحرائے عاشقی کی
شیروں کو اس جگہ پر ہوتا ہے قشعریرا

آئینے کو بھی دیکھو پر ٹک ادھر بھی دیکھو
حیران چشمِ عاشق دمکے ہے جیسے ہیرا

نیت پہ سب بنا ہے یہاں مسجد اک بڑی تھی
پیرِ مغاں موا سو اس کا بنا حظیرا

ہمراہ خوں تلک ہو ٹک پانوں کے چھوئے سے
ایسا گناہ مجھ سے وہ کیا ہوا کبیرا

غیرت سے میر صاحب سب جذب ہو گئے تھے
نکلا نہ بوند لوہو سینہ جوان کا چیرا

ہم نہ جانا اختلاط اس طفل بازی کوش کا
گرم بارے آگیا تو ہم کو بھی بہلا گیا

کیا کروں ناچار مرنے کو ہوا تیار میں
دل لگی روز و شب کی بیتابی سے جی گھبرا گیا

جی کوئی لگتا ہے اس کے اٹھ گئے پر باغ میں
گل نے بہتیرا کہا ہم سے نہ ٹک ٹھہرا گیا

ہو گئے تحلیل سب اعضا مرے پاکر گداز
رفتہ رفتہ ہجر کا اندوہ مجھ کو کھا گیا

یوں تو کہتا تھا کوئی ویسے کو باندھے ہے گلے
پر وہ پھندنا سا جو آیا میر بھی پھندلا گیا

دل عشق میں خوں دیکھا آنکھوں کو گیا دیکھا
پیغمبر کنعاں نے دیکھا نہ کہ کیا دیکھا

مجروح ہے سب سینہ تس پر ہے نمک پاشی
آنکھوں کے لڑانے کا ہم خوب مزا دیکھا

یکبار بھی آنکھ اپنی اس پر نہ پڑی مرتے
سو مرتبہ بالیں سے ہم سر کو اٹھا دیکھا

کاہش کا مری اب یہ کیا تجھ کو تعجب ہے
بیماری دل والا کوئی بھی بھلا دیکھا

آنکھیں گئیں کچھ تجھ بن کیا کیا نہ عزیزوں کی
پر تو نے مروت سے ٹک ان کو نہ جا دیکھا

جی دیتے ہیں مرنے پر سب شہر محبت میں
کچھ ساری خدائی سے یہ طور نیا دیکھا

کہہ دل کو گنوایا ہے یا رنج اٹھایا ہے
اے میر تجھے ہم نے کچھ آج خفا دیکھا

ناگاہ جو وہ صنم ستم ایجاد آگیا
دیکھے سے طور اس کے خدا یاد آگیا

پھوڑا تھا سر تو ہم نے بھی پر اس کو کیا کریں
جو چشم روزگار میں فرہاد آگیا

اپنا بھی قصد تھا سر دیوار باغ کا
توڑا ہی تھا قفس کو پہ صیاد آگیا

جور و ستم اٹھانے ہی اس کے پڑیں گے شیخ
مسجد میں گر وہ عاشق بے داد آگیا

دیکھیں گے آدمی کی روش میر ہم تری
گر سامنے سے ٹک وہ پری زاد آگیا

گرم مجھ سوختہ کے پاس سے جانا کیا تھا
آگ لینے مگر آئے تھے یہ آنا کیا تھا

برسوں یک بوسۂ لب مانگتے جاتے ہیں ہمیں [لہ]
رات آتے ہی کہا تم نے جو مانا کیا تھا

دیکھنے آئے دم نزع لیے منہ پہ نقاب
آخری وقت مرے منہ کا چھپانا کیا تھا

جب نہ تب مرنے کو تیار رہے عشق میں ہم
جی کے تئیں اپنے کبھو ہم نے نہ جانا کیا تھا

مدعی ہوتے ہیں اک ان میں اب تو دلدار
مہر جب رسم تھی یارب وہ زمانا کیا تھا

لہ طالع شہرت رسوائی مجنوں [illegible] است و صد دشت من [illegible] بہم انتقاد (لاادری)
[illegible]

کل صبح سیر باغ میں دل اور میرا رک گیا
بلبل نہ بولا منہ سے کچھ گل ٹک نہ مجھ سے وا ہوا

وے دن گئے جو یہاں کبھو اٹھتا تھا دل سے جوش سا
اب لگ گئے رونے جہاں پل مارتے دریا ہوا

کتنوں کے دل بیجاں ہوئے کتنے نہ جانا کیا ہوئے
چلنے میں اس کے دو قدم ہنگامہ اک برپا ہوا

مستی میں لغزش ہو گئی معذور رکھا چاہیے
اے اہلِ مسجد اس طرف آیا ہوں میں بہکا ہوا

جوں حسن ہے اک فتنہ گر تو عشق بھی ہے پردہ در
وہ شہرۂ عالم ہوا میں خلق میں رسوا ہوا

فرہاد و مجنوں وواں گئے ہم اور واسق یوں چلے
اس عارضے سے جاہ کے وہ کون سا اچھا ہوا

یا حرفِ خط ہے درمیاں یا گیسوؤں کا ہے بیاں
کیا میر صاحب کے تئیں پھر ان دنوں سودا ہوا

تمام روز جو کل میں پیے شراب پھرا
بسانِ جام لیے دیدۂ پُر آب پھرا

اثر بن آہ کے وہ منہ ادھر نہ ہوتا تھا
ہوا پھری ہے مگر کچھ کہ آفتاب پھرا

نہ لکھے خط کی نمط ہو گئیں سفید آنکھیں
تجھے بھی عشق ہے قاصد بھلا شتاب پھرا

قطعہ

وہ رشکِ گنج ہی نایاب تھا بہت ورنہ
خرابہ کونسا جس میں نہ میں خراب پھرا

کسو سے حرفِ محبت کا فائدہ نہ ہوا
بغل میں میں تو لیے یہاں بہت کتاب پھرا

لکھا تو دیکھ کہ قاصد پھرا جو مدت میں
جوابِ خط کا مرے صاف بے جواب پھرا

کہیں ٹھہرنے کی جا یہاں نہ دیکھی میں نے میر
چمن میں عالمِ امکاں کے جیسے آب پھرا

بے رنگ بے ثباق یہ گلستاں بنایا
بلبل نے کیا سمجھ کر یہاں آشیاں بنایا

اُڑتی ہے خاک یارب شام و سحر جہاں میں
کس کے غبارِ دل سے یہ خاکداں بنایا

اک رنگ پر نہ رہنا یہاں کا عجب نہیں ہے
کیا کیا نہ رنگ لائے تب یہ جہاں بنایا

آئینے میں کہاں ہے ایسی صفا کہ تو
جبہوں سے راستوں کے وہ آستاں بنایا

سرگشتہ ایسی کس کی ہاتھ آگئی تھی مٹی
جو چرخ زن قضا نے یہ آسماں بنایا

نقشِ قدم سے اُس کے گلشن کی طرح ڈالی
گردِ رہ اُس کی لے کر سروِ رواں بنایا

ہونے پہ جمع اپنے پھولا بہت تھا لیکن
کیا غنچہ تنگ آیا جب وہ دہاں بنایا

اس صحن پر یہ وسعت اللہ رے تیری صنعت
معمار نے قضا کے دل کیا مکاں بنایا

ق
دل تنگ ادھر نہ آیا ایدھر سے کچھ نہ پایا
کہنے کو ترک لے کر اک سوانگ یہاں بنایا

یہاں اپنی آنکھیں پھر گئیں پردہ نہ آ پھرا
دیکھا نہ بدگمان ہمارا بھلا پھرا

آیا نہ پھر وہ آئینہ رو ٹک نظر مجھے
میں منہ پر اپنے خاک ملے جابجا پھرا

کیا اور جی رندھے کسو کا تیرے ہجر میں
سو بار اپنے منہ سے جگر تو گیا پھرا

اللہ رے دلکشی کہیں دیکھا جو گرمِ ناز
جوں سایہ اس کے ساتھ ملک پھر لگا پھرا

سن لیجو ایک بار مسافر ہی ہو گیا
بیمارِ عشق گور سے گو بارہا پھرا

کہہ وہ شکستہ پا ہمہ حسرت نہ کیونکہ جائے
جو ایک دن نہ تیری گلی میں چلا پھرا

طالع پھرے سپہر پھرا، قلب پھر گئے
چندے وہ رشکِ ماہ جو ہم سے جدا پھرا

پر بے نمک ہے ملنے کی اس وقت بن تلاش
بارے وہ ربط و دوستی سب کا مزا پھرا

آنسو گرا نہ رازِ محبت کا پاس کر
میں جیسے ابر برسوں تئیں دل بھرا پھرا

بے صرفہ رونے لگ گئے ہم بھی اگر کبھو
تو دیکھیو کہ بادیہ سارا بہا پھرا

بندہ ہی پھر کہاں کا جو صاحب ہو بے دماغ
اس سے خدائی پھرتی ہے جس سے خدا پھرا

خانہ خراب[۱] میر بھی کتنا غیور تھا
مرنے موا پر اس کے کبھو گھر نہ جا پھرا

پھرتے کب تک شہر میں اب سوئے صحرا رو کیا
کام اپنا اس جنوں میں ہم نے بھی یکسو کیا

عشق نے کیا کیا تصرف یہاں کیے ہیں آجکل
چشم کو پانی کیا سب دل کو سب لوہو کیا

نکہتِ خوش اس کے پنڈے کی سی آتی ہے مجھے
اس سبب گل کو چمن کے دیر میں نے بو کیا

کام میں قدرت کے کچھ بولا نہیں جاتا ہے ہائے
خوبرو اس کو کیا لیکن بہت بدخو کیا

جانا اس آرام گہ سے ہے بعینہ بس یہی
جیسے سوتے سوتے ایدھر سے ادھر پہلو کیا

عزلتی اسلام کے کیا کیا پھرے ہیں جیب چاک
تو نے مائل کیوں ادھر کو گوشۂ ابرو کیا

وہ اتو کش کا ابھی پر کیا ہے سرگرمِ جفا
مارے تلواروں کے ان نے بہتوں کو اتو کیا

ہاتھ پر رکھ ہاتھ اب وہ دو قدم چلتا نہیں
جن نے بالشِ خواب کا برسوں مرا بازو کیا

پھولِ نرگس کا لیے بیچک کھڑا تھا راہ میں
کس کی چشمِ پرفسوں نے میر کو جادو کیا

عاشق ترے لاکھوں ہوئے مجھ سا نہ پھر پیدا ہوا
تجھ پر کوئی اے کامِ جاں دیکھا نہ یوں مرتا ہوا

مدت ہوئی الفت گئے برسوں ہوئے طاقت گئے
دل مضطرب ایسا نہ تھا کیا جانیے اب کیا ہوا

۱ ممیت اس کے تئیں کہتے ہیں جو تیرے میں تھی، گیا جہاں سے پتہ تیری گلی میں آ دبا۔

عزت اسلام کی کچھ رکھ لی خدا نے ورنہ
زلف نے تیری تو زنار بندھایا ہوتا

گھر کے آگے سے ترے نعش گئی عاشق کی
اپنے دروازے تلک تو بھی تو آیا ہوتا

جو ہے سو بیخودِ رفتار ہے تیرا اے شوخ
اس روش سے نہ قدم تو نے اٹھایا ہوتا

اب تو صد چند ستم کرنے لگے تم اے کاش
عشق اپنا تجھیں میں نے جتایا ہوتا

دل سے خوش طرح مکاں پھر بھی کہیں بنتے ہیں
اس عمارت کو ٹک اک دیکھ کے ڈھایا ہوتا

دل پہ رکھتا ہوں کبھو سر سے کبھو زانو میں
ہاتھ پانوں کو نہیں تیرے لگایا ہوتا

کم کم اٹھتا وہ نقاب آہ کہ طاقت رہتی
کاش یک بار ہمیں منہ نہ دکھایا ہوتا

میر اظہارِ محبت میں گیا جی نہ ترا
ہائے ناداں بہت تو نے چھپایا ہوتا

مکث طالع دیکھ وہ ایدھر کو چل کر رہ گیا
رات جو تھی چاند سا گھر سے نکل کر رہ گیا

خواب میں کل پانوں اپنے دوست کے ملتا تھا میں
آنکھ دشمن کھل گئی سو ہاتھ مل کر رہ گیا

ہم تو تھے سرگرم پابوسی خدا نے خیر کی
نیمچہ کل خوش غلاف اس کا اگل کر رہ گیا

ہم بھی دنیا کی طلب میں سر کے بل ہوتے کھڑے
بارے اپنا پانوں اس رہ میں پھسل کر رہ گیا

کیا کہوں بیتابی شب ہے کہ ناچار اس بغیر
دل مرے سینے میں دو دو ہاتھ اچھل کر رہ گیا

کیا ہمیں کو یار کے سینے نے کھا کر دم لیا
ایسے بہتیروں کو یہ اژدر نگل کر رہ گیا

دو قدم ساتھ اس جفا جو کے چلا جاتا ہے جی
بلہوس عیار تھا دیکھا نہ ٹل کر رہ گیا

آنکھ کچھ اپنی ہی اس کے سامنے ہوتی نہیں
جن نے وہ خونخوار سج دیکھی دہل کر رہ گیا

ایک ڈھیری راکھ کی تھی صبح جائے میر پر
برسوں سے جلتا تھا شاید رات جل کر رہ گیا

طریق خوب ہے آپس میں آشنائی کا
نہ پیش آوے اگر مرحلہ جدائی کا

ہوا ہے کنج قفس ہی کی بے پری میں خوب
کہ پھر کئی سال تلک لطف تھا رہائی کا

یہیں ہیں دیر و حرم اب تو یہ حقیقت ہے
دماغ کس کو ہے ہر در کی جبہہ سائی کا

نہ پوچھ مہندی لگانے کی خوبیاں اپنی
جگر ہے خستہ ترے پنجۂ حنائی کا

نہیں جہان میں کس طرز گفتگو دیسی
یہ ایک قطرۂ خوں ہے طرف[۱] خدائی کا

کسو پہاڑ میں جوں کوہکن سر اب ماریں
خیال ہم کو بھی ہے بخت آزمائی کا

[۱] طرف - مقابل ۱۲

دریوزہ کرتے گزری گلیوں میں عمر اپنی
درویش کب ہوئے ہم تکیہ کہاں بنایا

وہ تو مٹا گیا تھا تربت بھی میر جی کی
دو چار اینٹیں رکھ کر پھر میں نشاں بنایا

اُس کام جان و دل نے عالم کا جان مارا
زلفوں کی درہمی سے برہم جہان مارا

بلبل کا آتشیں دم دل کو لگا ہمارے
ایسا کنھوں نے جیسے چھاتی میں بان مارا

خوں کچھ نہ تھا ہمارا مرکوز خاطر اُس کو
للہ اک ہمیں بھی یوں درمیان مارا

سرچشمہ حسن کا وہ آیا نظر نہ مجھ کو
اس راہزن نے غافل کیا کاروان مارا

صبر و حواس و دانش سب عشق کے زبوں ہیں
میں کاوشِ مژہ سے عالم کو چھان مارا

کیا خون کا مزا ہے ای عشق تجھ کو ظالم
ایک ایک دم میں تو نے سو سو جوان مارا

ہم عاجزوں پر آ کر یوں کوہِ غم گرا ہے
جیسے زمیں کے اوپر ایک آسمان مارا

کب جی بچے ہے یارو خوش رد و مو بتاں سے
گر صبح بچ گیا تو پھر شام آن مارا

کہتے نہ تھے کہ صاحب اتنا کڑھا نہ کریے
اس غم نے میر تم کو جی سے ندان مارا

یہ میر ستم کشتہ کسو وقت جواں تھا
اندازِ سخن کا سبب، شور و فغاں تھا

جادو کی پڑی پرچۂ ابیات تھا اس کا
منہ تکتے غزل پڑھتے عجب سحر بیاں تھا

جس راہ سے وہ دل زدہ دلّی سے نکلتا
ساتھ اُس کے قیامت کا سا ہنگامہ رواں تھا

افسردہ نہ تھا ایسا کہ جوں آب زدہ خاک
آندھی تھا، بلا تھا، کوئی آشوبِ جہاں تھا

کس مرتبہ تھی حسرتِ دیدار مرے ساتھ
جو پھول مری خاک سے نکلا نگراں تھا

مجنوں کو عبث دعوئے وحشت ہے مجھی سے
جس دن کہ جنوں مجھ کو ہوا تھا وہ کہاں تھا

غافل تھے ہم احوالِ دلِ خستہ سے اپنے
وہ گنج اسی کنجِ خرابی میں نہاں تھا

کس زور سے فرہاد نے خاراشکنی کی
ہر چند کہ وہ بیکس و بیتاب و تواں تھا

گو میر جہاں میں کنھوں نے تجھ کو نہ جانا
موجود نہ تھا تو تو کہاں نام و نشاں تھا

عشق کو بیچ میں یارب تو نہ لایا ہوتا
یا تن آدمی میں دل نہ بنایا ہوتا

دل نہ تھا ایسی جگہ جس کی نہ سُدھ لیجے کبھو
اُجڑی اس بستی کو پھر تو نے بسایا ہوتا

یہ پیروی کسو سے کاہے کو ہو سکے ہی — رکھتا ہی داغ ہم کو قامت کا اس کی سایا
دیکھی نہ پیش جاتے ہرگز خرد وری یاں — دانستہ باؤلا ہم اپنے تئیں بنایا
کتنی تھی بیدماغی اک شور ما دمن میں — آنکھوں کے مُند گئے پر آرام سا تو پایا

گل پھول سے بھی تو جو لیتا ہی منہ کو پھیرے
مکھڑے سے کس کے تو نے ای میر دل لگایا

نکتہ مشتاق و یار ہی اپنا — شاعری تو شعار ہی اپنا
بیخودی لے گئی کہاں ہم کو — دیر سے انتظار ہی اپنا
روتے پھرتے ہیں ساری ساری رات — اب یہی روزگار ہی اپنا
دے کے دل ہم جو ہو گئے مجبور — اس میں کیا اختیار ہی اپنا
کچھ نہیں ہم مثال عنقا لیک — شہر شہر اشتہار ہی اپنا
جس کو تم آسمان کہتے ہو — سو دلوں کا غبار ہی اپنا

صرفہ آزار میر میں نہ کرو
خستہ اپنا ہی زار ہی اپنا

رو کش ہوا جو شب وہ بالائے بام نکلا — ماہِ تمام یارو کیا ناتمام نکلا
ہو گوشہ گیر شہرت مدنظر اگر ہی — عنقا کی طرح اپنا علت سے نام نکلا
تھا جن کو عاشقی میں دعوائے پختہ مغزی — سودا انھوں کا آخر دیکھا تو خام نکلا
نومید قیس پایا ناکام کوہ کن کو — اس عشق فتنہ گر سے وہ کس کا کام نکلا

کیونکر نہ مر رہے جو بیتاب میر ہو
اک آدھ دن تو گھر سے دل تھام تھام نکلا

کیا کہیں کچھ کہا نہیں جاتا — اب تو چپ بھی رہا نہیں جاتا
غم میں جاتی ہی عمرِ دہ روزہ — اپنے ہاں سے دہا نہیں جاتا
طاقتِ دل تلک تعب سے کھنچے — اب ستم ٹک سہا نہیں جاتا
اس دُرِ تر کا حیرتی ہی بحر — تب تو اس سے بہا نہیں جاتا

کب تری رہ میں میر گرد آلود
لوہو میں آ نہا نہیں جاتا

بجا رہا نہ دلِ شیخ شورِ محشر سے
جگر بھی چاہیے ہے کچھ تھامنا اوائی کا

پکھا ہی باز ہیں دربدر کے پھرنے سے
سرِ دل پہ اپنی ہے احسان شکستہ پائی کا

لا کہیں تو دکھا دیں گے عشق کا جنگل
بہت ہی خضر کو غرہ ہے رہنمائی کا

نہ اُکس مجھ سے ہوا اُس کو میں ہزار کہا
جگر میں داغ ہے اُس گل کی بیوفائی کا

جہاں سے میر ہی کے ساتھ جانا تھا لیکن
کوئی شریک نہیں ہے کسو کی آئی کا

یہ رفتگی بھی ہوئی ہے جی ہی چلا گیا
کل حال میر دیکھ کے غش مجھ کو آگیا

کیا کہیے ایک عمر میں وے لب ہلے تھے کچھ
سو بات پان کھاتے ہوئے وہ چبا گیا

ثابت ہے اس کے پہلو سے پہنچے ہے ہم کو رنج
دیکھا نہ دردِ دل کے کیے سر جھکا گیا

نالاں ہے عندلیب گل آشفتہ رفتہ سرو
ٹک بیٹھ کر چمن میں وہ فتنہ اٹھا گیا

پڑھتا تھا میں تو سبحہ لیے ہاتھ میں درود
صلواتیں مجھ کو آکے وہ ناحق سنا گیا

رکھنا نشان قبر کا میری نہ خوش کیا
آیا سو اور خاک میں مجھ کو ملا گیا

منصف ہو تو ہی شیخ کہ اس مستِ ناز بن
ہم آپ سے بھلا گئے تجھ سے رہا گیا

ہرگز کبھی نہ سر سے لگی آہ عشق میں
مانند شمع داغ ہی سب ہم کو کھا گیا

کیوں میں کہا کہ ہنس کے نمک زخم پر چھڑک
بے لطف اس کے ہونے میں سارا مزا گیا

آنسو تو ڈر سے پی گئے لیکن وہ قطرہ آب
اک آگ تن بدن میں ہمارے لگا گیا

وقتِ اخیر کیا یہ ادا تھی کہ غش سے میں
جب آنکھ کھولی بالوں میں منہ کو چھپا گیا

کیا پوچھتے ہو داغ کیا مرگ میر نے
مرکر وہ سینہ سوختہ چھاتی جلا گیا

سوزِ دروں سے آخر بھسمنت دل کو پایا
اس آگ نے بھڑک کر دربست گھر جلایا

جی دے کے لیتے ایسے معشوق بے بدل کو
یوسف عزیز دلہا سستا بہت بکایا

زلفِ سیاہ اُس کی جاتی نہیں نظر سے
اس چشم رو سیہ نے روزِ سیہ دکھایا

نام اُس کا سُن کے آنسو گرہی پڑے پلک سے
دل کا لگاؤ یارو چھپتا نہیں چھپایا

تھا لطفِ زیست جن سے وے اب نہیں میسر
مدت ہوئی کہ ہم نے جینے سے ہاتھ اٹھایا

مہندی لگی تھی تیرے پانوں میں کیا پیارے
ہنگامِ خونِ عاشق سر پہ جو تو نہ آیا

صد شکر کہ داغِ دل افسردہ ہوا ورنہ
یہ شعلہ بھڑکتا تو گھر بار جلا جاتا

کہتے تو ہو یوں کہتے یوں کہتے جو وہ آتا
یہ کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

ان[۱] آنکھوں سے ہم چشمی بر جا ہے جو میں جل کر
بادام کو کل یار و مجلس ہی میں کھا جاتا

صحبت سگ و آہو کی یک عمر رہی باہم
وہ بھاگتا مجھ سے تو میں اس سے لگا جاتا

گر عشق نہیں ہے تو یہ کیا ہے بھلا مجھ کو
جی خود بخود اے ہمدم کاہے کو کھپا جاتا

جوں ابر نہ تھم سکتا آنکھوں کا مری جھمکا
جوں برق اگر وہ بھی جھمکی سے دکھا جاتا

تکلیف نہ کی ہم نے اس وحشی کو مرنے کی
تھا میر تو ایسا بھی دل جی سے اٹھا جاتا

بالقوہ ٹک دکھایئے چشمِ پُر آب کا
دامن پکڑ کے روئیے یک دم سحاب کا

جو کچھ نظر پڑے ہے حقیقت میں کچھ نہیں
عالم میں خوب دیکھو تو عالم ہے خواب کا

دریا دلی جنھیں ہے نہیں ہوتے کاسہ لیس
دیکھا ہے واژگوں ہی پیالہ حباب کا

شاید کہ قلب یار بھی ٹک اس طرف پھرے
میں منتظر زمانے سے ہوں انقلاب کا

بارے نقاب دن کو جو رکھتا ہے منہ پہ تو
پردہ سا رہ گیا ہے کچھ اک آفتاب کا

تلوار بن نکلتے نہیں گھر سے ایک دم
خوں کر رہو گے تم کسو خانہ خراب کا

بے[۲] ہوش دیکھ آگے مرے ساتھ غیر کے
رکھتا ہے پانوں مست ہو جیسے شراب کا

مجنوں میں اور مجھ میں کرے کیوں نہ فرق عشق
چھپتا نہیں مزا تو جلے سے کباب کا

رو فرصتِ جوانی پہ جوں ابر بے خبر
انداز برق کا سا ہے عہدِ شباب کا

وھاں سے تو نامہ بر کو ہے کب کا جواب صاف
میں سادگی سے لاگو ہوں خط کے جواب کا

ٹپکا کرے ہے زہر ہی صرف اس نگاہ سے
وہ چشم گھر ہے غصہ و ناز و عتاب کا

لائق تھا یہ سمجھنے ہی کے مصراعِ قدِ یار
میں معتقد ہوں میر ترے انتخاب کا

خندۂ دنداں نما کرتا جو وہ کافر گیا
گوہر تر جوں سرشک آنکھوں سے سب کی گر گیا

کیا گزر کوے محبت میں ہنسی ہے کھیل ہے
پانوں رکھا جس نے ٹک ودھر پھر اس کا سر گیا

کیا کوئی زیرِ فلک اونچا کرے فرقِ غرور
ایک پتھر حادثے کا آ لگا سر چر گیا

---

[۱] آغا بیگم کا ایک شعر ہے: ؎ مقابل ہو ترے لب کے اگر مصری چبا جاؤں ۔ تری آنکھوں کی ہم چشمی کرے بادام کھا جاؤں

[۲] بر دوش غیر دست نہاد از رہ کرم ۔ مارا چو دید لغزش پا را بہانہ ساخت (قتیل)

کبھی اُس کی جو میں جتانے لگا — سب تجھے سیدھیاں وہ سنانے لگا
تحمل نہ تھا جس کو ٹک سو وہ میاں — ستم کیسے کیسے اُٹھانے لگا
رُندھے عشق میں کوئی یوں کب تلک — جگر آہ مُنہ تک تو آنے لگا
پریشاں ہیں اس وقت میں نیک و بد — ہوا جو کوئی وہ ٹھکانے لگا
کروں یاد اُسے ہوں جو میں آپ میں — سو یہاں جی ہی اب بھول جانے لگا
پس از عمر اُودھر گئی تھی نگاہ — سو آنکھیں وہ مجھ کو دکھانے لگا

نہیں رہتے ہماقن علاقے بغیر
کہیں میر دل کو دوانے لگا

اللہ رے غرور و ناز تیرا — مطلق نہیں ہم سے ساز تیرا
ہم سے کہ تجھی کو جانتے ہیں — جاتا نہیں احتراز تیرا
مل جن سے شراب تو پئے آہ — کہہ دیتے ہیں وہ ہی راز تیرا
کچھ عشق و ہوس میں فرق بھی کر — کیدھر ہے وہ امتیاز تیرا

کہتے نہ تھے میر مت کڑھا کر
دل ہو نہ گیا گداز تیرا

نظر میں آوے گا جب جی کا کھونا — ملے گا نیند بھر تب مجھ کو سونا
مرا خون تجھ پہ ثابت ہی کرے گا — کنارے بیٹھ کر ہاتھوں کو دھونا

وصیت میر نے مجھ کو یہی کی
کہ سب کچھ ہونا تو عاشق نہ ہونا

اُس آستان داغ سے میں زر لیا کیا — گل دستہ جس کو چراغی دیا کیا
کیا بعدِ مرگ یاد کروں گا وفا تجھے — سہتا رہا جفائیں میں جب تک جیا کیا

اب وہ جگر طپش سے تڑپتا ہے تشنہ لب
مدت تلک جو میر کا لوہو پیا کیا

آنسو مری آنکھوں میں ہر دم جو نہ آجاتا — تو کام مرا اچھا پردے میں چلا جاتا
اصلح ہے حجاب اُس کا ہم شوق کے ماروں سے — بے پردہ جو وہ ہوتا تو کس سے رہا جاتا
طفلی کی ادا تیری جاتی نہیں یہ جی سے — ہم دیکھتے تجھ کو تو تو منہ کو چھپا جاتا

آنسو تھما نہ جب سے گیا وہ نگاہ سے
پایانِ کار آنکھوں کو اپنی میں رو رہا

کیا ہے شریک زندگی کی شیخ شہر نے
شاباش بھی وہی تھا وہی مردہ شور رہا

یاروں نے جل کے مرنے سے میر کیا خطا
روتے تھے ہم تو دل ہی کو تو جی بھی کھو رہا

جب رات سر پٹکنے نے تاثیر کچھ نہ کی
ناچار میر منہ کو کری شی مار سو رہا

لعل پر لب دل مرا مائل ہوا
اُس لب خاموش کا قائل ہوا

لڑ گئیں آنکھیں اُٹھائی دل نے چوٹ
یہ تماشائی عبث گھائل ہوا

ناشکیبی سے گئی ناموس فقر
عاقبت بوسے کا میں سائل ہوا

ایک سے تھے ہم دے نہ ہوتے ہست اگر
اپنا ہونا بیچ میں حائل ہوا

میر ہم کس ذیل میں دیکھ اُس کی چشم
ہوش اہلِ قدس کا زائل ہوا

کوئی فقیر یہ اے کاش کے دعا کرتا
کہ مجھ کو اُس کی گلی کا خدا گدا کرتا

کبھو جو آن کے ہم سے بھی تو ملا کرتا
تو تیرے جی میں مخالف نہ اتنی جا کرتا

چمن میں پھول گل اب کے ہزار رنگ کھلے
دماغ کاش کے اپنا بھی ٹک وفا کرتا

فقیر بستی میں تھا تو ترا زیاں کیا تھا
کبھو جو آن نکلتا کوئی صدا کرتا

علاج عشق نے ایسا کیا نہ تھا اس کا
جو کوئی اور بھی مجنوں کی کچھ دوا کرتا

فہم کے چھوٹے تھے استادگی مجھی سے ہوئی پہ
کبھو وہ یہاں تو مرے ہاتھ بھی لگا کرتا

بدی نتیجہ ہد نیکی کا اس زمانے میں
بھلا کسو سے جو کرتا تو تو برا کرتا

تلاطم آنکھ کے صد رنگ بہتے تھے تجھ بن
کبھو کبھو جو یہ دریائے خوں چڑھا کرتا

کہاں سے نکلی یہ آتش نہ مانتا تھا میں
شروع ربط میں اس کے جو دل جلا کرتا

گلی سے یار کی ہم لے گئے سر پر شور
وگرنہ شام سے ہنگامہ ہی رہا کرتا

خراب مجھ کو کیا دل کی لاگ نے ورنہ
فقیر تکیے کے کاہیکو یوں اٹھا کرتا

گئے پہ تیرے نہ تھا ہمنفس کوئی اے گل
کبھو نسیم سے میں درد دل کہا کرتا

کہیں کی خاک کوئی منہ پہ کب تلک ملتا
خراب و خوار کہاں تک بھلا پھرا کرتا

موئے ہی رہنی تھی عزت مری محبت میں
ہلاک آپ کو کرتا نہ میں تو کیا کرتا

نیزہ بازانِ مژہ میں دل کی حالت کیا کہوں
ایک ناکسبی سپاہی دکھنیوں میں گھر گیا

بعد مدت اس طرف لایا تھا اس کو جذبِ عشق
سخت کی برگشتگی سے آتے آتے پھر گیا

تیز دست اتنا نہیں وہ ظلم میں اب فرق ہے
یعنی لوہا تھا کڑا تیغ ستم کا گر گیا

سخت ہم کو میر کے مرجانے کا افسوس ہے
تم نے دل پتھر کیا وہ جان سے آخر گیا

اس بدزباں نے حرف سخن آہ کب کیا
چپکے ہی چپکے ان نے ہمیں جاں بلب کیا

طاقت سے میرے دل کی خبر تجھ کو کیا نہ تھی
ظالم نگاہ چشم ادھر کی غضب کیا

یکساں کیا نہیں ہے ہمیں خاک رہ سے آج
ایسا ہی کچھ سلوک کیا ان نے جب کیا

عمامہ لے کے شیخ کہیں میکدے سے جا
بس مغبچوں نے حد سے زیادہ ادب کیا

اس رخ سے دل اٹھایا تو زلفوں میں جا پھنسا
القصہ اپنے روز کو ہم نے بھی شب کیا

ظاہر ہوا نہ مجھ پہ کچھ اس ظلم کا سبب
کیا جانوں خون ان نے مرا کس سبب کیا

کچھ آگے آئے ہوتے جو منظور لطف تھا
ہم جی سے اپنے جا چکے تم قصد تب کیا

بچھڑے تمھارے اپنا عجب حال ہو گیا
جس کی نگاہ پڑ گئی ان نے عجب کیا

برسوں سے اپنے دل کی ہے دل میں کہ یار نے
اک دن جدا نہ غیر سے ہم کو طلب کیا

کی زندگی سو وہ کی موے اب سو اس طرح
جو کام میر جی نے کیا سو کڈھب کیا

اب چھاتی کے جلنے نے کچھ طور بدل ڈالا
جب درد ہو شدت کا اس دل ہی کو دل ڈالا

ہم عاجزوں کا کھونا مشکل نہیں ہے ایسا
کچھ چونٹیوں کو لے کر پانوں تلے مل ڈالا

اٹکھیلی کی بھی اس کی دل تاب نہیں لاتا
کیا پگڑی کے پیچوں میں لے بالوں کو بل ڈالا

تشویش سے اب خالی کس دن ہے مزاج اپنا
اس دل کی خلش نے بھی کیا آہ خلل ڈالا

کچھ مست کو کیا نسبت اے میر مسائل سے
منہ شیخ کا مسجد میں ہیں رک کے مسل ڈالا

طوفان میرے رونے سے آخر کو ہو رہا
یونان کی طرح بستی یہ سب میں ڈبو رہا

بہتوں نے چاہا کہئے پہ کوئی نہ کہہ سکا
احوال عاشقی کا مری گو مگو رہا

آخر موا ہی واں سے نکلتا سنا اسے
کوچے میں اس کے جا کے ستم دیدہ جو رہا

داغ حرماں ہی خاک میں بھی ساتھ / جی گیا پر نہ یہ نشان گیا
کل نہ آنے میں ایک یہاں تیرے / آج سو سو طرف گمان گیا
حرف نشنو کوئی اسے بھی ملا / تب تو میں نے کہا سو مان گیا
دل سے مت جا کہ پھر وہ پچھتایا / ہاتھ سے جس کے یہ مکان گیا
پھرتے پھرتے تلاش میں اس کی / ایک میرا ہی یوں نہ جان گیا
ق
اب جو عیسیٰ فلک پہ ہی وہ بھی / شوق میں برسوں خاک چھان گیا

کون جی سے بچائے گا ای میر
حیف[1] یہ ہی کہ تو جوان گیا

ہنگام شرح غم جگر خامہ شق ہوا / سوز دروں سے نامہ کباب ورق ہوا
بندہ خدا ہی پھر تو اگر گزرے آپ سے / مرتا ہی جو کوئی اسے کہتے ہیں حق ہوا
دل میں رہا نہ کچھ تو کیا ہم نے ضبط شوق / یہ شہر جب تمام لٹا تب نسق ہوا
وہ رنگ وہ روش وہ طرح سب گئی بباد / آتے ہی تیرے باغ میں منہ گل کا فق ہوا
برسوں تری گلی میں چمن ساز جو رہا / سو دیدہ اب گداختہ ہو کر شفق ہوا
لے کر زمیں سے تا بفلک کی گیا ہی آہ / کس دردمند عشق کو یارب قلق ہوا

اس نو ورق میں میر جو تھا شرح و بسط سے
بیٹھا جو درس کے پیں تو ترا اک سبق ہوا

کل میں کہا وہ طور کا شعلہ کہاں گرا / دل نے جگر کی اور اشارت کی یہاں گرا
منظر خراب ہونے کو ہی چشم تر کا حیف / پھر دید کی جگہ نہیں جو یہ مکاں گرا
روح القدس کو سہل کیا یار نے شکار / اک تیر میں وہ مرغ بلند آشیاں گرا
پہنچایا مجھ کو عجز نے مقصود دل کے تئیں / یعنی کہ اس کے در ہی پہ میں ناتواں گرا
شور اک مری نہاد سے تجھ بن اٹھا تھا رات / جس سے کیا خیال کہ یہ آسماں گرا
کیا کم تھا شعلہ شوق کا شعلے سے طور کے / پتھر بھی وہاں کے جل گئے جا کر جہاں گرا

ڈوبا خیال چاہ زنخداں میں اس کے میر
دانستہ کیوں کوئیں میں بھلا یہ جواں گرا

آتے ہی آتے تیرے یہ ناکام ہو چکا / وہاں کام ہی رہا تجھے یہاں کام ہو چکا

[1] این ماتم سخت است گویند جوان مرد ۱۲

تیرے مزاج میں تاب تعب تھی میر کہاں
کسو سے عشق نہ کرتا تو تو بھلا کرتا

بندھا رات آنسو کا کچھ تار سا
ہوا ابر رحمت گنہگار سا

کوئی سادہ ہی اس کو سادہ کہے
لگے ہی ہمیں تو وہ عیار سا

محبت ہی یا کوئی جی کا ہی روگ
سدا میں تو رہتا ہوں بیمار سا

گل و سرو اچھے سبھی ہیں ولے
نہ نکلا چمن میں کوئی یار سا

جو ایسا ہی تم ہم کو سمجھو ہو سہل
ہمیں بھی یہ جینا ہی دشوار سا

فلک نے بہت کھینچے آزار لیک
نہ پہنچا بہم اُس دل آزار سا

مگر آنکھ تیری بھی چپکی کہیں
ٹپکتا ہی چتون سے کچھ پیار سا

چمن ہووے جو انجمن تجھ سے وہاں
لگے آنکھ میں سب کی گل خار سا

کھڑے منتظر ضعف[1] جو آگیا
گرا اُس کے در پہ میں دیوار سا

دکھاؤں متاع وفا کب اُسے
لگا وہاں تو رہتا ہی بازار سا

عجب کیا جو اس زلف کا سایہ دار
پھرے راتوں کو بھی پریدار[2] سا

نہیں میر مستانہ صحبت کا باب
مصاحب کرو کوئی ہشیار سا

حیراں ہی لحظہ لحظہ طرز عجب عجب کا
جو رفتۂ محبت واقف ہی اس کے ڈھب کا

کہتے ہیں کوئی صورت بن معنی یہاں نہیں ہی
یہ وجہ ہی کہ عارف منہ دیکھتا ہی سب کا

نسبت درست جس کی اس رو و مو سے پائی
ہے درہم اور برہم حال اس کے روز و شب کا

افسوس ہی نہیں تو انصاف دوست ورنہ
شایان لطف دشمن شائستہ میں غضب کا

سودائی ایک عالم اس کا بنا پھرے ہی
ہر چند عرلتی ہی وہ خال کنج لب کا

منہ اس کے منہ کے اوپر شام و سحر رکھوں ہوں
اب ہاتھ سے دیا ہی سر رشتہ میں ادب کا

کیا اُجکل سے اُس کی یہ بے تو جہی ہی
منہ اُن نے اس طرف سے پھیرا ہی میر کب کا

سیکڑوں بیکسوں کا جان گیا
پر یہ تیرا نہ امتحان گیا

وائے احوال اس جفاکش کا
عاشق اپنا جسے وہ جان گیا

[1] ضعف بمعنی غش [2] پریدار - آسیب زدہ [illegible]

تجھ روئے خوں فشاں سے انجم ہی کیا خجل ہیں ۔ ہی آفتاب کو بھی ای ماہ سال تیرا
اب صبح پاس گل کے ہو کر نہیں نکلتی ۔ دیکھا نسیم نے بھی شاید جمال تیرا
پہلا قدم ہی انساں پامال مرگ ہونا ۔ کیا جانے رفتہ رفتہ کیا ہو مآل تیرا
ہوگی جو چل سر مو پنہاں نہیں رہیگی ۔ اک دن زبان ہوگا ایک ایک بال تیرا
تفصیل حال میری تھی باعث کدورت ۔ سو جی کو خوش نہ آیا ہرگز ملال تیرا

کچھ زرد زرد چہرہ کچھ لاغری بدن میں
کیا عشق میں ہوا ہی ای میر حال تیرا

فرو آتا نہیں سر ناز سے اب کے اسیروں کا ۔ اگرچہ آسماں تک شور جاوے ہم فقیروں کا
تبسم سحر ہی جب پان سے لب سرخ ہوں اس کے ۔ دلوں میں کام کر جاتا ہی یہاں جادو کے تیروں کا
سر کنا اس کے درباں پاس سے ہی شب کو بھی مشکل ۔ سر زنجیر زیر سر رکھے ہی ہم اسیروں کا
گئے بہتوں کے سر لڑکوں نے جو یہ باندھنوں باندھے ۔ شہید اک میں نہیں ان باندھنوں کے سرخ چیروں کا
قفس کے چاک سے دیکھوں ہوں میں تو تنگ آتا ہوں ۔ چمن میں غنچہ ہو آنا گلوں پر ہم صفیروں کا
ہمارے دیکھتے زیر نگیں تھا ملک سب جن کے ۔ کوئی اب نام بھی لیتا نہیں ان ملک گیروں کا

دل میر کو تو ان پلکوں ہی نے سب چھان مارا تھا
کیا میر ان نے خالی یوں ہی ترکش اپنے تیروں کا

ہوئیں رسوائیاں جس کیلئے چھوٹا دیار اپنا ۔ ہوا وہ بے مروت بے وفا ہرگز نہ یار اپنا
خدا جانے ہمیں اس بیخودی نے کس طرف پھینکا ۔ کہ مدت ہو گئی ہم کھینچتے ہیں انتظار اپنا
ذلیل اس کی گلی میں ہوں تو ہوں آزردگی کیسی ۔ کہ رنجش اس جگہ ہووے جہاں ہو اعتبار اپنا
اگرچہ خاک اڑائی دیدۂ تر نے بیاباں کی ۔ ولے نکلا نہ خاطر خواہ رونے سے غبار اپنا
کہا بد وضع لوگوں نے جو دیکھا رات کو ملتے ۔ ہوا صحبت میں ان لڑکوں کی ضائع روزگار اپنا
کریں جو ترک عزلت واسطے مشہور ہونے کے ۔ مگر شہروں میں کم ہی جیسے عنقا اشتہار اپنا
دلِ بے تاب دبے طاقت سے کچھ چلتا نہیں ورنہ ۔ کھڑا ابھی وہاں نہ جاکر ہوں اگر ہو اختیار اپنا

---

۵۱ حسرت موہانی ـ عشق بتاں کو جی کا جنجال کر لیا ہی ؛ حسرت یہ تو نے اپنا کیا حال کر لیا ہی ۔
۵۲ میر تقی میر ـ بیخودی لے گئی کہاں ہم کو ؛ دیر سے انتظار ہی اپنا ۔
میر تقی میر ـ ہم آپ سے گئے سو آئے کہاں گئے ؛ مدت ہوئی کہ اپنا ہمیں انتظار ہی ۔

موسم گیا وہ ترکِ محبت کا ناصحا / میں اب تو خاص و عام میں بدنام ہو چکا
یا خط چلے ہی آتے تھے یا حرف ہی نہیں / شاید کہ سادگی کا وہ ہنگام ہو چکا
ناآشنائے حرف تھا وہ شوخ جب تبھی / ہم سے تو ترکِ نامہ و پیغام ہو چکا
تڑپے ہے جب کہ سینے میں اُچھلے ہے دو دو ہاتھ
گر دل یہی ہے میرؔ تو آرام ہو چکا

سنبل تمھارے گیسووں کے غم میں لٹ گیا / ابرو کی تیغ دیکھ مہِ عید کٹ گیا
عالم میں جاں کے مجھ کو تنزہ تھا اب تو میں / آلودگی جسم سے ماٹی میں اٹ گیا
ظلم و جفا و جور پر اصرار اس قدر / ہٹ دیکھ دیکھ تیری دل اپنا ہی ہٹ گیا
اب وہ سماں نہیں ہے کہ وہ کام جانِ خلق / مغموم ہم کو دیکھ کے دوڑا لپٹ گیا
دشوار سیتے ہیں گے جو بیٹھے ٹک پھٹی ہے جیب / بیطوریوں سے اس کی دل اپنا تو پھٹ گیا
داماں و جیب دونوں ہوئے ٹکڑے ایک جا / اب کی یہ کام ہاتھ سے میرے سمٹ گیا
خاطر اگر ہو جمع پریشانی بھی نبھے / سو دل تو دو طرف تری لٹوں سے بٹ گیا
ٹک رات اس کے منہ سے ہوا تھا مقابلہ / پھر ماہِ چار دہ کو جو دیکھا تو گھٹ گیا
کیا پوچھو ہو نصیب ہمارے اُلٹ گئے / چل کر ادھر کو یار پھر اودھر الٹ گیا
بلبل کی اور گل کی جو صحبت کی میرؔ
دل اپنا دلبروں کی طرف سے اُچٹ گیا

سینے میں شوقِ میرؔ کے سب درد ہو گیا / دل پر رکھا تھا ہاتھ سو مُنہ زرد ہو گیا
نکلا تھا آج صبح بہت گرم ہو ولے / خورشید اُس کو دیکھتے ہی سرد ہو گیا
بے پردہ اس کی شوخی قیامت ہے دیکھیو / یہاں خاک سی اڑا دی فلک گرد ہو گیا
کشتی ہر اک فقیر کی بھر دی شراب سے / اس دور میں کلال عجب مرد ہو گیا
دفتر لکھے ہیں میرؔ نے دل کے الم کے یہ
یہاں اپنے طور و طرز میں وہ فرد ہو گیا

کیا تو نمود کس کی کیسا کمال تیرا / ہے نقش وہم آیا کیدھر خیال تیرا
کیا ہے جو ہو زنخ زن مہ پاس کا ستارا / ہے داغ جانِ عالم ٹھوڑی کا خال تیرا
ہے گل مُغل بچہ وہ مرزا ہے اُس کے آگے / کچھ بھی بھلا لگے ہے منہ لال لال تیرا

شبِ رفتہ میں اس کے در پر گیا — سگِ یار آدم گری کر گیا
شکستہ دلِ عشق کی جان گیا — نظر پھیری تو نے تو وہ مر گیا
ہوئے یار کیا کیا خراب اس بغیر — وہ کس خانہ آباد کے گھر گیا
کشندہ تھا لڑکا ہی ناکردہ خوں — مجھے دیکھ کر محتضر ڈر گیا

بہت رفتہ رہتے ہو تم اس کے اب
مزاج آپ کا میرؔ کیدھر گیا

بے طاقتی میں تو تو اے میرؔ مر رہے گا — ایسی طپش سے دل کی کوئی جگر رہے گا
کیا ہے جو راہ دل کی طے کرتے مر گئے ہم — جوں نقشِ پا ہمارا تا دیر اثر رہے گا
مت کر لڑکپن اتنا خوں ریزی میں ہماری — اس طور لوہو میں تو دامن کو بھر رہے گا
آگاہ پائی ہم نے کھوئے گئے سے یعنی — پہنچی خبر ادھر کی دل بے خبر رہے گا
فردا کا سوچ تجھ کو کیا آج ہی پڑا ہے — کل کی سمجھیو کل ہی کل تو اگر رہے گا
لوگوں کا پاس ہم کو مارے رکھے ہے ورنہ — ماتم میں دل کے شیون دو دو پہر رہے گا
پایانِ کار دیکھیں کیا ہووے دل کی صورت — ایسا ہی جو وہ چہرہ پیشِ نظر رہے گا
اب رفتگی رویّہ اپنا کیا ہے میں نے — میرا یہ ڈھب دلوں میں کچھ راہ کر رہے گا

ہم کوئی بیت جا کر اس ہی کے منہ سنیں گے
وحشت زدہ کسو دن گر میرؔ گھر رہے گا

پند گو مشفق عبث میرا نصیحت گر ہوا — سختیاں جو میں بہت کھینچیں سو دل پتھر ہوا
گاڑ کر مٹی میں روے عجز کیا ہم ہی موے — خون اس کے رہ گزر کی خاک پر اکثر ہوا
اب اٹھا جاتا نہیں مجھ پاس پھر ٹک بیٹھ کر — گرد اس کے جو پھرا سر کو مرے چکر ہوا
کب کھبا جاتا تھا یوں آنکھوں میں جیسا صبح تھا — پھول خوش رنگ اور اس کے فرش پر بچھکر ہوا
کیا سنی تم نے نہیں بد حالیِ فرہاد و قیس — کونسا بیمار دل کا آج تک بہتر ہوا
کون کرتا ہے طرف مجھ عاشقِ بیتاب کی — صورتِ خوش جن نے دیکھی اس کی سو ادھر ہوا
جل گیا یاقوت اس کے لعلِ لب جب ہل گئے — گوہرِ خوش آب اندازِ سخن سے تر ہوا
کیا کہوں اب کی جنوں میں گھر کا بھی رہنا گیا — کام جو مجھ سے ہوا سو عقل سے باہر ہوا
شب نہ کرتا شور اس کوچے میں گر میں جانتا — اس کی بے خوابی سے ہنگامہ مرے سر پر ہوا

عجب ہم بے بصیرت ہیں کہاں کھولا ہے بار اگر
جہاں سے لوگ سب رختِ سفر کرتے ہیں بار اپنا

نہ یوں میکدہ مسجد سا پر واں ہوش جاتے ہیں
ہوا ہے دونوں جاگہ ایک دو باری گزار اپنا

سراپا آرزو ہم لوگ ہیں کاہیکو رندوں میں
رہے ہیں اب تلک جیتے و لے دل مار مار اپنا

گیا وہ بوجھ سب ہلکے ہوئے ہم میر آخر کو
مناسب تھا نہ جانا اس گلی میں بار بار اپنا

ربط دل زلف سے اس کی جو نہ چسپاں ہوتا
اس قدر حال ہمارا نہ پریشاں ہوتا

ہاتھ دامن میں ترے مارتے جھنجھلا کے نہ ہم
اپنے جامے میں اگر آج گریباں ہوتا

میری زنجیر کی جھنکار نہ کوئی سنتا
شور مجنوں نہ اگر سلسلہ جنباں ہوتا

ہر سحر آئینہ رہتا ہے ترا منہ تکتا
دل کی تقلید نہ کرتا تو نہ حیراں ہوتا

وصل کے دن سے بدل کیونکہ شبِ ہجراں ہو
شاید اس طور میں ایام کا نقصاں ہوتا

طور اپنے پہ جو ہم روتے تو پھر عالم میں
دیکھتے تم کہ وہی نوح کا طوفاں ہوتا

دل میں کیا کیا تھا ہمارے جو نہ جاتی یاس
یہ نگر کاہیکو اس طرح سے ویراں ہوتا

خاک پا ہو کے ترے قد کا چمن میں رہتا
سرو اتنا نہ اکڑتا اگر انساں ہوتا

میر بھی دیر کے لوگوں ہی کی سی کہنے لگا
کچھ خدا لگتی بھی کہتا جو مسلماں ہوتا

جس پہ اس موج سی شمشیر کا اک وار کیا
کام اس شوق کے ڈوبے ہوئے کا پار کیا

آگیا عشق میں جو پیش نشیب اور فراز
ہو کے میں خاک برابر اسے ہموار کیا

کیا کروں جنس وفا پھیرے لئے جاتا ہوں
بختِ بد نے کسے دل کا خریدار کیا

اتفاق ایسے پڑے ہم تو منافق ٹھہرے
چرخِ ناساز نے غیروں سے اسے یار کیا

ایسے آزار اٹھانے کا ہمیں کب تھا دماغ
کوفت نے دل کی تو جینے سے بھی بیزار کیا

جی ہی جاتے سنے ہیں عشق کے مشہور ہوئے
کیا کیا ہم نے کہ اس راز کو اظہار کیا

دیکھیے اس ماہ کو جو کتنے مہینے گزرے
بڑھ گئی کاہشِ دل ایسی کہ بیمار کیا

نالۂ بلبلِ بیدل ہے پریشان بہت
موسمِ گل نے مگر رخصتِ سفر بار کیا

میر اے کاش زباں بند رکھا کرتے ہم
صبح کے بولنے نے ہم کو گرفتار کیا

ہر چند شعر میرؔ کا دل معتقد نہ تھا
پر اس غزل کو ہم نے بھی سن کر لکھا رکھا

میں جوانی میں مے پرست رہا
گردنِ شیشہ ہی میں دست رہا

در میخانہ میں مرے سر پر
حال ممدود دار بست رہا

سر پہ پتھر جنوں میں کب نہ پڑے
یہ سبو ثابت شکست رہا

ہاتھ کھینچا سو پیر ہو کر جب
تب گنہ کرنے کا نہ دست رہا

آنسو ہی پی گیا جو برسوں میں
دل درونی میں آب خست رہا

جب کہو تب بلند کیے اسے
قد خوباں کا سرو بست رہا

میرؔ کے ہوش کے ہیں ہم عاشق
فصل گل جب تلک تھی مست رہا

چمن بھی ترا عاشقِ زار تھا
گلِ سرخ اک زرد رخسار تھا

گئی نیند شیون سے بلبل کی رات
کہیں دل ہمارا گرفتار تھا

قدِ یار کے آگے سروِ چمن
کھڑا دور جیسے گنہگار تھا

یہی جنس دل کی گراں قدر تھی
ولے جب تلک تو خریدار تھا

بہت روئے ہم شبنم و گل کو دیکھ
کہ چسپاں ہمیں بھی کہیں پیار تھا

مجھے اے دلِ چاک کیا شانہ سا
کسو زلف سے کچھ سروکار تھا

گیا میرؔ یہاں سے کروگے جو یاد
کہو گے کہ مسکین عجب یار تھا

دل گیا مفت اور دکھ پایا
ہو کے عاشق بہت میں پچھتایا

مر گیا تس پہ سنگسار کیا
نخل ماتم مرا یہ پھل لایا

یہ شبِ ہجر سر کرے ہی بری
ہو سفیدی کا جس جگہ سایا

صحن میں میرے اے گلِ مہتاب
کیوں شگوفہ تو کھلنے کا لایا

چاک کر سینہ دل میں پھینک دیا
کھینچے ایذا ہمیشہ کس کی بلا

تم کو جیتا رکھے خدا اے بتاں
مر گئے ہم تو کرتے کرتے وفا

ہووے یارب ان سیہ رو آنکھوں کا خانہ خراب
یک نظر کرتے ہی میرے دل میں اس کا گھر ہوا

استخواں سب پوست سے سینے کے آگئے ہیں نظر
عشق میں ان نوخطوں کے میرؔ میں مسطر ہوا

ٹپکتی پلکوں سے رومال جب گھڑی سرکا
طرف ہوا نہ کبھو ابر دیدۂ تر کا

کبھو تو دیر میں ہوں میں کبھو ہوں کعبہ میں
کہاں کہاں لئے پھرتا ہی شوق اس در کا

غمِ فراق سے پھر سوکھ کر ہوا کانٹا
بچھا جو پھول اُٹھا کوئی اُس کے بستر کا

اسیر جرگے میں ہو جاؤں میں تو ہو جاؤں
وگرنہ قصد ہو کس کو شکارِ لاغر کا

ہمیں کہ جلنے سے خوگر ہیں آگ میں ہی عیش
محیط میں تو تلف ہوتا ہی سمندر کا

قریب خط کا نکلنا ہوا سو خط موقوف
غبار دور ہو کس طور میرے دلبر کا

بتا کے کعبہ کا رستہ اُسے بھلاؤں راہ
نشاں جو پوچھے کوئی مجھ سے یار کے گھر کا

کسو سے مل چلے ٹک وہ تو ہی بہت ورنہ
سلوک کاہیکو شیوہ ہی اُس ستمگر کا

شکستہ بالی و لب بستگی پر اب کی نہ جا
چمن میں شور مرا اب تلک بھی ہی پر کا

تلاشِ دل نہیں کام آتی اُس زنخ میں گئے
کہ چاہ میں تو ہی مرنا بُرا شناور کا

پھرے ہی خاک ملے منہ پہ یا نمد پہنے
یہ آئنہ ہی نظر کردہ کس قلندر کا

نہ ترکِ عشق جو کرتا تو میرؔ کیا کرتا
جفاکشی نہیں ہی کام ناز پرور کا

حلقہ ہوئی وہ زلف کماں کو چھپا رکھا
طاق بلند پر اسے سب نے اُٹھا رکھا

اس مہ سے دل کی لاگ وہی متصل ہی
گو چرخ نے بصورتِ ظاہر جدا رکھا

گڑوا دیا ہو مار کر اک دو کو تو کہوں
کب ان نے خون کر نہ کسو کا دبا رکھا

ٹک میں لگا تھا اس تکی شوخ کے گلے
چھاتی کے میرے زخموں نے برسوں مزا رکھا

کاہیکو آئے چوٹ کوئی دل پہ شیخ کے
اس بلہوس نے اپنے تئیں تو بچا رکھا

ہم سر ہی جاتے عشق میں اکثر سنا کئے
اس راہ خوفناک میں کیوں تم نے پا رکھا

آزارِ دل نہیں ہی کسو دین میں درست
کیا جانوں ان بتوں نے ستم کیوں روا رکھا

کیا میں ہی محو چشمک انجم ہوں خلق کو
اس مہ نے ایک جھمکی دکھا کر لگا رکھا

کیا زہر چشم یار کو کوئی بیاں کرے
جس کی طرف نگاہ کی اُس کو سلا رکھا

دل چلے جائے ہیں خرام کے ساتھ
دیکھی چلنے میں ان بتاں کی ادا

خاک میں مل کے میرؔ ہم سمجھے
بے ادائی تھی آسماں کی ادا

رہا میں تو عزت کا اعزاز کرتا
چلا عشق خواری کو ممتاز کرتا

نہ ہوتا میں حسرت میں محتاجِ گریہ
جو کچھ آنسوؤں کو پس انداز کرتا

نہ ٹھہرا مرے پاس دل ورنہ اب تک
اُسے ایسا ہی میں تو جانباز کرتا

جو جانوں کہ دربر ہی ایسا وہ دشمن
تو کاہے کو الفت میں ساز کرتا

تو تمکین سے کچھ نہ بولا وگرنہ
مسیحا صنم ترکِ اعجاز کرتا

گلوگیر ہی ہو گئی یا وہ گولی
رہا میں خموشی کو آواز کرتا

زیارت گہِ کبک تو ہو بلا سے
ٹک آ میرؔ کی خاک پر ناز کرتا

عید آئندہ تک رہے گا گلا
ہو چکی عید تو گلے نہ ملا

ڈوبا لوہو میں دیکھنا سرِ خار
حیف کوئی بھی آبلہ نہ چھلا

میں تو افسردہ ہر چمن میں پھرا
غنچۂ دل مرا کہیں نہ کھلا

یہ چوٹ کھائی ایسی دل پر کہ جی گنوایا
یعنی جدائی کا ہم صدمہ بڑا اُٹھایا

مدت میں وہ ہوا شب ہم بستر آ کے میرا
خوابیدہ طالعوں نے اک خواب سا دکھایا

اُلجھاؤ پڑ گیا سو سُلجھی نہ اپنی اُس کی
جھگڑے رہے بہت سے گزرے بہت قضایا

آئینہ رو ہمارا آیا نہ نزع میں بھی
وقتِ اخیر اُن نے کیا خوب منہ چھپایا

اس بے مروتی کو کیا کہتے ہیں بتاؤ
ہم مارے بھی گئے پر وہ نعش پر نہ آیا

وہ روئے خوب اب کی ہرگز گیا نہ دل سے
جب گل کھلا چمن میں تب داغ ہم نے کھایا

خلطہ ہمارا اس کا حیرت ہی کی جگہ ہے
ڈھونڈا جہاں ہم اُس کو وہاں آپ کو ہی پایا

طرزِ نگہ سے اُس کی بیہوش کیا ہوں میں ہی
ان مست انکھڑیوں نے بہتیروں کو سُلایا

آنکھیں کھلیں تو دیکھا جو کچھ نہ دیکھنا تھا
خوابِ عدم سے ہم کو کاہے کے تئیں جگایا

باقی نہیں رہا کچھ گھٹتے ہی گھٹتے ہم میں
بیماریِ دلی نے چنگا بہت بنایا

سب گئے ہوش و صبر و تاب و تواں
دل سے اک داغ ہی جدا نہ ہوا

اُٹھ گیا میرؔ وہ جو بالیں سے
پھر مری جان مجھ میں کچھ نہ رہا

اندوہ و غم کے جوش سے دل رُک کے خوں ہوا
اب کے مجھے بہار سے آگے جنوں ہوا

اچھا نہیں ہے رفتنِ رنگیں بھی اس قدر
سنیو کہ ایسی چال پہ اک آدھ خوں ہوا

جی میں تھا خوب جا کے خرابے میں روئیے
سیلاب آیا، آگے چلا، کیا شگوں ہوا

نخچیر گاہ عشق میں افراطِ صید سے
روح الامیں کا نام شکار زبوں ہوا

ہوں داغِ نازکی کہ کیا تھا خیال کو بس
گلبرگ سا وہ ہونٹھ جو تھا نیلگوں ہوا

میں دور ہوں اگرچہ برابر ہوں خاک سے
اس رہ میں نقشِ پا ہی مرا رہنموں ہوا

میرؔ اُن نے سرگزشت سنی ساری رات کو
افسانہ عاشقی کا ہماری فسوں ہوا

مُنہ پر اس آفتاب کے ہے یہ نقاب کیا
پردہ رہا ہے کون سا ہم سے حجاب کیا

اے ابرِ تر یہ گریہ ہمارا ہے دیدنی
برسے ہے آج صبح سے چشمِ پُر آب کیا

دم گنتے گنتے اپنی کوئی جان کیوں نہ دو
وہ پاس آن بیٹھے کسو کے حساب کیا

سو بار اُس کے کوچے تلک جاتے ہیں چلے
دل ہے اگر بجا تو یہ ہے اضطراب کیا

بس اب نہ مُنہ کھلاؤ ہمارا ڈھکے رہو
محشر کو ہم سوال کریں تو جواب کیا

دوزخ سو عاشقوں کو تو دوزخ نہیں رہا
اب وھاں گئے پہ ٹھہرے دیکھیں عذاب کیا

ہم جل کر ایک راکھ کی ڈھیری بھی ہو گئے
ہے اب تکلف آگے جلے گا کباب کیا

ہستی ہے اپنے طور پہ جوں بحر جوش میں
گرداب کیسا، موج کہاں ہے حباب کیا

دیکھا پلک اٹھا کے تو پایا نہ کچھ اثر
اے عمرِ برق جلوہ گئی تو شتاب کیا

ہر چند میرؔ بستی کے لوگوں سے ہے نفور
پر ہائے آدمی ہے وہ خانہ خراب کیا

اے نکھلے یہ تھی کہاں کی ادا
کھب گئی جی میں تیری بانکی ادا

جادو کرتے ہیں اک نگاہ کے بیچ
ہائے رے چشمِ دلبراں کی ادا

بات کہنے میں گالیاں دے ہے
سنتے ہو میرے بدزباں کی ادا

داغ ہوں جلتا ہی دل بے طور اب
دیکھیے کیا گل کھلے ہی اور اب

زخمِ دل غائر ہو پہنچا تا جگر
تم لگے کرنے ہماری غور اب

شعر پڑھتے پھرتے ہیں سب میر کے
اس قلمرو میں ہی ان کا دَور اب

وہ جو کشش تھی اس کی طرف سے کہاں ہی اب
تیر و کماں ہی ہاتھ میں سینہ نشاں ہی اب

اتنا بھی منہ چھپانا خط آئے پہ دجنبر کیا
لڑکا نہیں ہی نامِ خدا تو جواں ہی اب

پھول اس چمن کے دیکھتے کیا کیا جھڑے ہیں ہائے
سیلِ بہار آنکھوں سے میری رواں ہی اب

جن و ملک زمین و فلک سب نکل گئے
بارِ گرانِ عشق و دلِ ناتواں ہی اب

نکلی تھی اُس کی تیغ ہوئے خوش نصیب لوگ
گردن جھکائے میں تو سُنا یہ اماں ہی اب

زردیِ رنگ ہی غمِ پوشیدہ پر دلیل
دل میں جو کچھ ہی منہ سے ہمارے عیاں ہی اب

پیش از دمِ سحر مرا رونا لہو کا دیکھ
پھولے ہی جیسے سانجھ وہی یہاں سماں ہی اب

نالاں ہوئے کہ یاد ہمیں سب کو دے گئے
گلشن میں عندلیب ہماری زباں ہی اب

برسوں ہوئے گئے اُسے پر بھولتا نہیں
یادش بخیر میر رہے خوش جہاں ہی اب

شبنم سے کچھ نہیں ہی گل و یاسمن میں آب
دیکھ اس کو بھر بھر آوے ہی سب کے دہن میں آب

گو سُدھ شتاب فاختۂ گریہ ناک کی
آیا نہیں ہی دیر سے جوئے چمن میں آب

سوزش بہت ہو دل میں تو آنسو کو پی نہ جا
کرتا ہی کام آگ کا ایسی جلن میں آب

تھا گوش زد کہ گوروں میں لگ لگ اٹھے ہی آگ
یہاں دل بھرے ہوئے کے سبب ہی کفن میں آب

جی ڈوب جائے دیکھیں جہاں بھر نظر اِدھر
تم کہتے ہو نہیں مرے چاہِ ذقن میں آب

لب تشنگانِ عشق کے ہیں کام کے وہ لعل
کیا آب کو جو ہووے عقیق یمن میں آب

تب قیس جنگلوں کے تئیں آگ دے گیا
ہم بھر چلے ہیں رونے سے اب سارے بن میں آب

سُن سوزِ دل کو میرے بہت روئی رات شمع
بیرونِ بزم لائے ہیں بھر بھر لگن میں آب

دیکھو تو کس روانی سے کہتے ہیں شعر میر
دُر سے ہزار چند ہی ان کے سخن میں آب

جیسا مزاج آگے تھا میرا سو کب ہی اب
ہر روز دل کو سوز ہی ہر شب تعب ہی اب

تو نے کہ پانوں سے دل باہر نہیں رکھا ہی ۔ عیار پن یہ کن نے تیرے تئیں سکھایا

کس دن ملائمت کی اس بت نے میر ہم سے
سختی کھنچے نہ کیونکر تجھ سے دل لگایا

سمندر کا میں کیوں احساں سہوں گا ۔ مرے آنسو نہیں اُن پر بہوں گا
نہ تو آوے نہ جاوے بے قراری ۔ یوں ہی اک دن سنا میں مر رہوں گا
ترے غم کے ہیں خواہاں سب کھا غم ۔ کمی کیا ہوگی جو اک میں نہ ہوں گا

اگر جیتا رہا میں میر اَی یار
تو شب کو مو بمو قصہ کہوں گا

رکھتا تھا ہاتھ میں سر رشتہ بہت سینے کا ۔ رو گیا دیکھ رفو چاک مرے سینے کا
اَی طپش لو ہو پئے میرا جو تو جھوٹ کہے ۔ کس سے یہ قاعدہ سیکھا ہی لہو پینے کا
اس میں حیران ہوں کس کس کا گلا تجھ سے کروں ۔ بدگمانی کا تغافل کا ترے کینے کا

میر کی نبض پہ رکھ ہاتھ لگا کہنے طبیب
آج کی رات یہ بیمار نہیں جینے کا

عشق سے دل یہ تازہ داغ جلا ۔ اس سیہ خانہ میں چراغ جلا

میر کی گرمی تم سے اچرج ہے
کس سے ملتا ہی یہ دماغ جلا

ردیف الباء

اندوہ سے ہوئی نہ رہائی تمام شب ۔ مجھ دل زدہ کو نیند نہ آئی تمام شب
جب میں شروع قصہ کیا آنکھیں کھول دیں ۔ یعنی تھی مجھ کو چشم نمائی تمام شب
چشمک چلی گئی تھی ستاروں کی صبح تک ۔ کی آسماں نے دیدہ درائی تمام شب
بخت سیہ نے دیر میں کل یاوری سی کی ۔ تھی دشمنوں سے اُس کو لڑائی تمام شب
بیٹھے ہی گزری وعدے کی شب وہ نہ آ پھرا ۔ ایذا عجب طرح کی اٹھائی تمام شب
سناہٹے سے دل سے گزر جائیں سو کہاں ۔ بلبل نے گو کی نالہ سرائی تمام شب
تارے سے میری پلکوں پہ قطرے سرشک کے ۔ دیتے رہے ہیں میر دکھائی تمام شب

مجنوں نے ریگ بادیہ سے دل کے غم گنے
ہم کیا کریں کہ غم [illegible] تو بے حساب

کاش اس کے روبرو نہ کریں مجھ کو حشر میں
کتنے مرے سوال ہیں جن کا نہیں جواب

شاید کہ ہم کو بوسہ بہ پیغام دست دے
پھرتا ہے بیچ میں تو بہت ساغرِ شراب

ہے ان بھوؤں میں خال کا نقطہ دلیلِ فہم
کی ہے سمجھ کے بیت کسو نے یہ انتخاب

گزرے ہے میرؔ لوٹتے دن رات آگ میں
ہے سوزِ دل سے زندگی اپنی ہمیں عذاب

جو کہو تم سو ہے بجا صاحب
ہم بُرے ہی سہی بھلا صاحب

سادہ ذہنی میں نکتہ چیں تھے ہم
اب تو ہیں حرف آشنا صاحب

نہ دیا رحم ٹک بُتوں کے تئیں
کیا کیا ہائے یہ خدا صاحب

بندگی ایک اپنی کیا کم ہے
اور کچھ تم سے کہیے کیا صاحب

مہر افزا ہے مُنہ تمھارا ہی
کچھ غضب تو نہیں ہوا صاحب

خط کے پھٹنے کا تم سے کیا شکوہ
اپنے طالع کا یہ لکھا صاحب

پھر گئیں آنکھیں تم نہ آن پھرے
دیکھا تم کو بھی واہ وا صاحب

شوقِ رخ، یادِ لب، غمِ دیدار
جی میں کیا کیا مرے رہا صاحب

بھول جانا نہیں غلام کا خوب
یاد خاطر رہے مرا صاحب

کس نے سُن شعرِ میرؔ یہ نہ کہا
کہیو پھر ہائے کیا کہا صاحب

عجب صحبت ہے کیونکر صبح اپنی شام کریے اب
یہاں ٹک آن بیٹھے ہم کہ آرام کریے اب

ہزاروں خواہشِ مردہ نے سرِ دل سے نکالا ہے
قیامت جی پہ ہے دیدار کو ٹک عام کریے اب

بلا آشوب تھا گو جان پر آغازِ الفت میں
ہوا سو تو ہوا اندیشۂ انجام کریے اب

بہت کی یا صنم گوئی ہوئے مشہور کافر ہم
وظیفہ کوئی دن اپنا خدا کا نام کریے اب

زباں خامہ کے ہلتے ہی ہزاروں اشک گرتے ہیں
حقیقت اپنے دل کی آہ کیا ارقام کریے اب

کہاں تک کام ناکام اس جفا جو کے لیے مریے
اگر تلوار ہاتھ آوے تو اپنا کام کریے اب

فسانہ شاخ در شاخ اس نہالِ حسن کے غم کا
کہاں اے میرؔ بے برگ و نوا اتمام کریے اب

سُدھ کچھ سنبھالتے ہی وہ عنصر در ہو گیا
ہر آن بید ماغی و ہر دم غضب ہی اب

دوری سے اس کی آہ عجب حال میں ہیں لوگ
کچھ بھی جو پاس وہ نہ کرے تو عجب ہی اب

طاقت کہ جس سے تابِ جفا تھی سو ہو چکی
تھوڑی سی کوفت میں بھی بہت سا تعب ہی اب

دریا چلا ہی آج تو بوس و کنار کا
گر جی چلاوے کوئی دِوانا تو ڈھب ہی اب

جاں بخشیاں جو پیشتر از خط کیا کیے
اُن ہی لبوں سے خلق خدا جاں طلب ہی اب

رنجش کی وجہ آگے تو ہوتی بھی تھی کوئی
رو پوش اک سے یار جو ہی بے سبب ہی اب

نے چاہ وہ اُسے ہی نہ مجھ کو ہی وہ دماغ
جانا مرا سر کو بشرطِ طلب ہی اب

جاتا ہوں دن کو ملنے تو کہتا ہی دلا د میر
جو شب کو جائیے تو کہے ہی کہ شب ہی اب

عشاق کے تئیں ہی عجز و نیاز واجب
ہی فرضِ عین رونا دل کا گداز واجب

یوں سر فرو نہ لاوے ناداں کوئی وگرنہ
رہنا سجود میں ہی جیسے نماز واجب

ناسازیِ طبیعت ایسی پھر اُس کے اوپر
ہی ہر کسو سے مجھ کو ناچار ساز واجب

لڑکا نہیں رہا تو جو کم تمیز ہووے
عشق و ہوس میں اب ہی کچھ امتیاز واجب

لہ صرفہ نہیں ہی مطلق جانِ عزیز کا بھی
اَی میر تجھ سے ظالم ہی احتراز واجب

تابوت پر بھی میرے نہ آیا وہ بے نقاب
میں اُٹھ گیا ولے نہ اُٹھا بیچ سے حجاب

اس آفتابِ حسن کے جلوے کی کس کو تاب
آنکھیں اُدھر کئے سے بھر آتا ہی وہیں آب

اس عمر برق جلوہ کی فرصت بہت ہی کم
جو کام پیش آوے تجھے اس میں ہو شتاب

غفلت سے ہی غرور تجھے ورنہ ہی بھی کچھ
یہاں وہ سماں ہی جیسے کہ دیکھے ہی کوئی خواب

اس موج خیز دہر نے کس کے اُٹھائے ناز
کج بھی ہوا نہ خوب کلہ گوشۂ حباب

یہ بستیاں اُجڑ کے کہیں بستیاں بھی ہیں
دل ہو گیا خراب جہاں پھر رہا خراب

بیتابیاں بھری ہیں مگر کوٹ کوٹ کر
خرقے میں جیسے برق ہمارے ہی اضطراب

ٹک دل کے نسخے ہی کو کیا کر مطالعہ
اس درس گہ میں حرف ہمارا ہی اک کتاب

لہ نظیری ؎ تو بہ جوشن چہ کردی کہ با کنی نظیری ۔ بجز اکہ واجب آمد ز تو احتراز کردن

شکوہ خراب ہونے کا کیا چاہیے ہیں میر
ایسی تو ای عزیز ہیں یہاں خواریاں بہت

یاد ایامی کہ ہنگامہ رہا کرتا تھا رات
شور و شر سے میرے اک فتنہ رہا کرتا تھا رات

کام کیا تھا جیب و دامن سے مجھے پیش از جنوں
سینہ چاکی اپنی میں بیٹھا کیا کرتا تھا رات

جن دنوں کھینچا تھا سر اُس بادشاہِ حُسن نے
ہر گلی میں اک فقیر اس کو دُعا کرتا تھا رات

اب جہاں کچھ بات چھیڑی سوچ لایا پیش ازیں
میں کہا کرتا تا غمِ دل وہ سُنا کرتا تھا رات

ہجر میں کیا کیا سمے دیکھے ہیں ان آنکھوں سے میں
زرد رُخ پر لالہ گوں آنسو بہا کرتا تھا رات

کیا کہوں پھر کیسے کیسے دن دکھاتا سالہا
وہ سخن نشنو جو ٹک میرا کہا کرتا تھا رات

دیکھنے والے ترے دیکھے ہیں سب ای رشکِ شمع
جوں چراغِ وقف دل کا سب جلا کرتا تھا رات

بعد میرے اس غزل پر بھی بہت رو دیں گے لوگ
میں بھی ہر ہر بیت پر اُس کے بکا کرتا تھا رات

دیکھ خالی جا کہیں گے برسوں اہلِ روزگار
میر اکثر دل کا قصہ یہاں کہا کرتا تھا رات

کیا پوچھتے ہو آہ مرے جنگ جو کی بات
گویا وفا ہی عہد میں اُس کے کبھو کی بات

اس باغ میں نہ آئی نظر خرمی مری
گر سبز بھی ہوا ہوں تو جیسے کسو کی بات

آئینہ پانی پانی رہا اس کے سامنے
کہیے جہاں کہوں یہ تو ہے روبرو کی بات

سر گل نے پھر جھکا کر اُٹھایا نہ شرم سے
گلزار میں چلی تھی کہیں اُس کے رو کی بات

حرمت میں مے کے کہنے سے واعظ کے ہی فتور
کیا اعتبار رکھتی ہی اس پوچ گو کی بات

ہم سوختوں میں آتشِ سرکش کا ذکر کیا
چل بھی پڑی ہی بات تو اس تند خو کی بات

کیا کوئی زلفِ یار سے حرف و سخن کرے
رکھتی ہی میر طول بہت اُس کے مو کی بات

سنتا نہیں اگرچہ ہمارا نگار بات
پر منہ پہ آہی جاتی ہی بے اختیار بات

بلبل کے بولنے سے ہی کیوں بے دماغ گل
آپس میں یوں تو ہوتی ہی یارو ہزار بات

منہ تک رہو جو ہو وہ فریبندہ حرف زن
اس تھوڑے سن و سال میں یہ پیچدار بات

وسمے چپکے لب کا کہ تب کچھ نہیں مزا
پاوے گی سارے شہر میں جب اشتہار بات

ہی کس کی صوت انکر اصوات واعظا
کب آدمی کی جنس کرے ہی پکار بات

برقع میں کیا چھپیں وے ہوویں جنھوں کی یہ تاب — رخسار تیرے پیارے ہیں آفتاب مہتاب
اٹکل ہمیں کو اُن نے آخر ہدف بنایا سینے ہمو — ہر چند ہم بلاکش تھے ایک تیر پرتاب
کچھ قدر میں نہ جانی غفلت سے رفتگاں کی — آنکھیں سی کھل گئیں اب جب صحبتیں ہوئیں خواب
ان بن ہی کے سبب ہیں اس لالچی سے سارے — یہاں ہی فقیری محض وہاں چاہیے ہی اسباب
اس بحر حسن کے تئیں دیکھا ہی آب میں کیا — جاتا ہی صدقے اپنے جو لحظہ لحظہ گرداب
اچرج ہی یہ کہ مطلق کوئی نہیں ہی خواہاں — جنس وفا اگرچہ ہیگی بہت ہی کمیاب
تھی چشم یہ رکے گا پلکوں سے گریہ لیکن — ہوتی ہی بند کوئی تنکوں سے راہ سیلاب
تو بھی تو مختلط ہو سبزے میں ہم سے ساقی — ق لیکر بغل میں ظالم میناے بادۂ ناب
نکلی ہیں ابکی کلیاں اس رنگ سے چمن میں — سرجوڑ جوڑ جیسے مل بیٹھتے ہیں احباب

کیا لعل لب کسو کے ای میر چت چڑھے ہیں
چہرے پہ تیرے ہر دم بہتا رہے ہی خوناب

ردیف التاء

دیر کچھ کھنچتی تو کہتے بھی ملاقات کی بات — ملنا اپنا جو ہوا اُس سے سو وہ بات کی بات
گفتگو شاہد وے سے ہی نہ غیبت نہ گلہ — خانقہ کی سی نہیں بات خرابات کی بات
سن کے آواز سگ یار ہوئے ہم خاموش — بولتے وہاں ہیں جہاں ہووے مساوات کی بات
منہ ادھر اور سخن زیر لبی غیر کے ساتھ — اس فریبندہ کی ناگفتنی ہی گھات کی بات
اس لئے شیخ ہی چپکا کہ پڑے شہر میں شور — ہم سمجھتے ہیں یہ شیادی و طامات کی بات
یہ کس آشفتہ کی جمعیت دل تھی منظور — بال بکھرے ترے منہ پر کہیں ہیں رات کی بات

گفتگو وصفوں سے اس ماہ کے کرلیے ای میر
کاہش افزا ہی کروں اُس کی اگر ذات کی بات

ہم تم سے چشم رکھتے تھے دلداریاں بہت — سو التفات کم ہی دل آزاریاں بہت
دیکھیں تو کیا دکھائے یہ افراط اشتیاق — لگتی ہیں تیری آنکھیں ہمیں پیاریاں بہت
جب تک ملے جلے سے جفائیں تھیں اٹھ سکیں — کرنے لگے ہو اب تو ستمگاریاں بہت
آزار میں تو عشق کے جاتا ہی بھول جی — یوں تو ہوئیں تمہیں یاد ہیں بیماریاں بہت

دیکھیے کب ہو وصال اب تو لگے ہے ڈر بہت / گو وقت گزرے ہے فراق یار میں جی پر بہت
دل کی ویسی ہے خرابی کثرت اندوہ سے / جیسے رہ پڑتا ہے دشمن کا کہیں لشکر بہت
ہمنشیں جا بیٹھ، محنت کش کوئی دل چاہئے / عشق تیرا کام ہے تو ہے بغل پرور بہت
بس نہیں مجھ ناتواں کا ہائے جو کچھ کر سکوں / مدعی پر چاک سے اس کی پڑ گیا ہے ور بہت
سخت کر جی کیونکہ یکباری کروں ہم ترک شہر / ان گلی کوچوں میں ہم نے کھائے ہیں پتھر بہت
دیکھ روئے زرد پر بھی میرے آنسو کی ڈھلک / اے کہ تو نے دیکھی ہے غلطانی گوہر بہت
منفس کیا مجھ کو تو رویا کرے ہے روز و شب / رہ گئے ہیں مجھ سے کوئے یار میں مر کر بہت
ہی سے بولنا، کم آنکھ مجھ پر کھولنا / اب عنایت یار کی رہتی ہے کچھ ایدھر بہت

کیا سبب ہے اب مکاں پر جو کوئی پاتا نہیں
میر صاحب آگے تو رہتے تھے اپنے گھر بہت

ملامت گر نہ مجھ کو کر ملامت / جلے کو اور تو اتنا جلا مت
گلے مل عید قرباں کو سبھوں کے / ہمارا آہ تم کاٹو گلا مت
تری نا آشنائی کے ہیں بندے / نہ وہ اب ربط نے صاحب سلامت
بہت رونے نے رسوا کر دکھایا / نہ چاہت کی چھپی ہم سے علامت

کبھو تلوار وہ کھینچے ہے اے میر
لڑی قسمت تو سر کو ٹک ہلا مت

ردیف جیم فارسی

ک سا تو جو ہوا اے گل تر آن کے بیچ / صبح کی باد نے کیا پھونک دیا کان کے بیچ
ہم نہ کہتے تھے کہیں زلف کہیں رخ نہ دکھا / اک خلاف آیا نہ ہندو و مسلمان کے بیچ
باوجود ملکیت نہ ملک میں پایا / وہ تقدس کہ جو ہے حضرت انسان کے بیچ
پاسباں سے ترے کیا دور جو ہمساز رقیب / ہے نہ اک طرح کی نسبت سگ و دربان کے بیچ
جیسی عزت مرے دیواں کی امیروں میں ہوئی / ویسی ہی ان کی بھی ہو گی مرے دیوان کے بیچ
ساتھ ہی اس سر عریاں کی یہ وحشت کرنا / پگڑی الجھی ہے مری اب تو بیابان کے بیچ
سے بہر پا پلکیں اگر کھب گئیں جی میں تو وہیں / رخنے پڑ جائیں گے واعظ ترے ایمان کے بیچ

آہو کو اُس کی چشمِ سخن گو سے مت ملا
شہری سے کر سکے ہے کہیں بھی گنوار بات
یوں بارِ گل سے ابھی جھکے ہیں نہالِ باغ
جھک جھک کے جیسے کرتے ہیں دوچار یار بات
آزردہ دل کو حرف پہ لانے کا لطف کیا
کرتی جو خونچکاں مرے لب سے گزار بات
مرجاں کوئی کہے ہے کوئی ان لبوں کو لعل
کچھ رفتہ رفتہ پا ہی رہے گی قرار بات
یوں چپکے چپکے میر تلف ہو گا کب تلک
کچھ ہووے بھڑ کر اس سے بھی کر ایک بار بات

ہوتا ہے گرچہ کہنے سے یارو پرائی بات
پر ہم سے تو تھمی نہ کبھو منہ پر آئی بات
حرج ہے یہ کہ ہے جو یہ تصنع تو اُس سے کر
تس پہ بھلی تو چھپی نہیں رہتی بنائی بات
جانے نہ تجھ لگے دل ہم باغ سے
رفتار کی جو تیری صبا نے چلائی بات
اگ کر تدرو رہ سے
وہ آگیا تو سامنے اُس کے نہ آئی بات
کہتے تھے اُس سے ملیے تو کیا کیا نہ لیے لید
ہاں تو نے کچھ کہا کہ ادھر ہم نے پائی بات
اب تو ہوئے ہیں ہم بھی ترے ڈھب سے آشنا
پوشیدہ کب رہی ہے کسی کی اٹائی بات
بلبل کے بولنے میں سب انداز ہیں مرے
کچھ روسیہ رقیب نے شاید لگائی بات
بھڑکا تھا رات دیکھ کے وہ شعلہ خو مجھے
یہ شور ہے کہ دیتی نہیں کچھ سنائی بات
عالم سیاہ خانہ ہے کس کا کہ روز و شب
سو مجھ سے ہی سخن نہیں ہیں جو بتائی بات
اک دن کہا تھا یہ کہ خموشی میں ہے وقار
جاتی نہیں ہے مجھ سے کسو کی اٹھائی بات
اب مجھ ضعیف و زار کو مت کچھ کہا کرو
خط لکھتے لکھتے میر نے دفتر کیے رواں
افراطِ اشتیاق نے آخر بڑھائی بات

ہے زباں زد جو سکندر ہو چکا لشکر سمیت
سر بھی اس کا کھپ گیا آخر کو یہاں افسر سمیت
چشمے آبِ شور کے نکلا کریں گے واں جہاں
رکھیں گے مجھ تلخ کامِ غم کو چشمِ تر سمیت
ہم اُٹھے روتے تو لی گردوں نے پھر راہِ گریز
بیٹھ جاوے گا یہ ماتم خانہ بام و در سمیت
مستی میں شرمِ گنہ سے میں جو رویا ڈاڑھ مار
گر پڑا بیخود ہو واعظ جمعہ کو منبر سمیت
بعث اپنا خاک سے ہو گا جو اس شورش کے ساتھ
عرش کو سر پہ اٹھا لیویں گے ہم محشر سمیت
کب تلک یوں لوہو پیتی ہاتھ اٹھا کر جان سے
وہ کمر کولی میں بھر لی ہم نے کل خنجر سمیت
گنجِ قاروں کا سا یہاں کس کے کنے تھا سو تو میر
خاک میں ملتا ہے اب تک اپنے مال و زر سمیت

کہتے تھے کہ یہ کہتے وہ کہتے جو یار آتا سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

یارب ہمیشہ جلتی ہی رہتی ہیں چھاتیاں — یہ کیسی عاشقوں کے دلوں میں رکھی ہو آگ

افسردگی سوختہ جاناں ہی قہر میر
دامن کو ٹک ہلا کہ دلوں کی بجھی ہی آگ

ہی آگ کا سا نالۂ کاہش فزا کا رنگ — کچھ اور صبحدم سے ہوا ہی ہوا کا رنگ
دیکھے ادھر تو مجھ سے نہ یوں آنکھ وہ چھپائے — ظاہر ہی میرے منہ سے مرے مدعا کا رنگ
کس بیگنہ کے خون میں ترا پڑ گیا ہی پاؤں — ہوتا نہیں ہی سرخ تو ایسا حنا کا رنگ
بے گہ شکستہ رنگیٔ خورشید کیا عجب — ہوتا ہی زرد بیشتر اہل فنا کا رنگ
گل پیرہن نہ چاک کریں کیونکہ رشک سے — کس مرتبے میں شوخ ہی اُسکی قبا کا رنگ
رہتا تھا ابتدائے محبت میں منہ سفید — اب زرد سب ہوا ہوں یہی انتہا کا رنگ
داروئے لعل گوں نہ پیو میرزا ہو تم — گرمی پہ ہی دلیل بہت اس دوا کا رنگ
خوبی ہی اس کی حیز تحریر سے بروں — کیا اُس کا طور حسن لکھوں کیا ادا کا رنگ
پوچھیں ہیں وجہ گریۂ خونیں جو مجھ سے لوگ — کیا دیکھتے نہیں ہیں سب اس بے وفا کا رنگ

مقدور تک نہ گزرے مرے خوں سے یار میر
غیروں سے کیا گلہ ہی یہ ہی آشنا کا رنگ

رہِ مرگ سے کیوں ڈراتے ہیں لوگ — بہت اُس طرف کو تو جاتے ہیں لوگ
مظاہر سب اُس کے ہیں ظاہر ہی وہ — تکلف ہی یہاں جو چھپاتے ہیں لوگ
عجب کی جگہ ہی کہ اُس کی جگہ — ہمارے تئیں ہی بتاتے ہیں لوگ
رہے ہم تو کھوئے گئے سے سدا — کبھو، آپ میں ہم کو پاتے ہیں لوگ
اس ابرو کماں پر جو قرباں ہیں ہم — ہمیں کو نشانہ بناتے ہیں لوگ
نہ سویا کوئی شورِ شب سے مرے — قیامت اذیت اٹھاتے ہیں لوگ

اُن آنکھوں کے بیمار ہیں میر ہم
بجا دیکھنے ہم کو آتے ہیں لوگ

ردیف لام

مار بھی آسان ہی دشنام سہل — یار اگر ہی اہل تو ہی کام سہل

محبت میں جی سے گئے میر آخر
خبر گفتنی ہے یہ ہر بے خبر تک

ردیف کاف فارسی

غافل ہیں ایسے سوتے ہیں گویا جہاں کے لوگ
حالانکہ رفتنی ہیں سب اس کارواں کے لوگ

مجنون و کوہ کن نہ تلف عشق میں ہوئے
مرنے پہ جی ہی دیتے ہیں اس خانداں کے لوگ

کیونکر کہیں کہ شہرِ وفا میں جنوں نہیں
اس خصم جاں کے سارے دوانے ہیں یہاں کے لوگ

رونق تھی دل میں جب تئیں بستے تھے دلبراں
اب کیا رہا ہے اٹھ گئے سب اس مکاں کے لوگ

تو ہم میں اور آپ میں مت دے کسی کو دخل
ہوتے ہیں فتنہ ساز یہی درمیاں کے لوگ

مرتے ہیں اس کے واسطے یوں تو بہت ولے
کم آشنا ہیں طور سے اس کام جاں کے لوگ

پتے کو اس چمن کے نہیں دیکھتے ہیں گرم
جو محرمِ روش ہیں کچھ اس بدگماں کے لوگ

بت چیز کیا کہ جس کو خدا مانتے ہیں سب
خوش اعتقاد کتنے ہیں ہندوستاں کے لوگ

فردوس کو بھی آنکھ اٹھا دیکھتے نہیں
کس درجہ سیر چشم ہیں کوئے بتاں کے لوگ

کیا سہل جی سے ہاتھ اٹھا بیٹھتے ہیں ہائے
یہ عشق پیشگاں ہیں الٰہی کہاں کے لوگ

منہ تکتے ہی رہے ہیں سدا مجلسوں کے بیچ
گویا کہ میر محو ہیں میری زباں کے لوگ

کیا عشق خانہ سوز کے دل میں چھپی ہے آگ
اک سارے تن بدن میں مرے پھک رہی ہے آگ

گلشن بھرا ہے لالہ و گل سے اگرچہ سب
پر اس بغیر اپنے تو بھائیں لگی ہے آگ

پاؤں میں پڑ گئے ہیں پھپھولے مرے تمام
ہر گام راہِ عشق میں گویا دبی ہے آگ

جل جل گئے سب عمارتِ دل خاک ہو گئی
کیسے نگر کو آہ محبت سے دی ہے آگ

اب گرم و سرد دہر سے یکساں نہیں ہے حال
پانی ہے دل ہمارا کبھو تو کبھی ہے آگ

کیونکر نہ طبع آتشیں اس کی ہمیں جلائے
ہم مشت خس کا حکم رکھیں وہ پری ہے آگ

کب لگ سکے ہے عشق جہاں سوز کو ہوس
ماہی کی زیست آب سمندر کا جی ہے آگ

روزِ ازل سے آتے ہیں ہوتے جگر کباب
کیا آج کل سے عشق کی یارو جلی ہے آگ

نکالے سے نہ گرتے تھے آگے جگر کے لخت
جب تب ہماری گود میں اب تو بھری ہے آگ

بہت مدت گئی ہے اب ٹک آ مل
کہاں تک خاک میں میں تو گیا مل

ٹک اُس بیرنگ کے نیرنگ تو دیکھ
ہوا ہر رنگ میں جوں آب شامل

نہیں بھاتا ترا مجلس کا ملنا
ملے تو ہم سے تو سب سے جدا مل

غنیمت جان فرصت آج کے دن
سحر کیا جانئے کیا ہو شب ہی جا مل

اگرچہ ہم نہیں ملنے کے لائق
کسو تو طرح ہم سے بھی بھلا مل

لیا زاہد نے جامِ بادہ کف پر
بحمد اللہ کھلا عقدہ انامل

وہی پہنچے تو پہنچے آپ ہم تک
نہ یہاں طالعِ رسا نے جذب کامل

ہوا دل عشق کی سختی سے ویراں
ملایم چاہیئے تھا یہاں کا عامل

پس از مدت سفر سے آئے ہیں میر
گئیں وہ اگلی باتیں تو ہی جا مل

ردیف میم

کچھ نہ پوچھو بہک رہے ہیں ہم
عشق کی مے سے چھک رہے ہیں ہم

سوکھ غم سے ہوئے ہیں کانٹا سے
پردلوں میں کھٹک رہے ہیں ہم

وقفۂ مرگ اب ضروری ہے
عمر طے کرتے تھک رہے ہیں ہم

کیونکہ گرد علاقہ بیٹھ سکے
دامنِ دل جھٹک رہے ہیں ہم

کون پہنچے ہے بات کی تہ کو
ایک مدت سے بک رہے ہیں ہم

اُن نے دینے کہا تھا بوسۂ لب
اُس سخن پر اٹک رہے ہیں ہم

نقش پا سے رہی ہیں کھل آنکھیں
کس کی یوں راہ تک رہے ہیں ہم

دست دیگی کب اُس کی پابوسی
دیر سے سر پٹک رہے ہیں ہم

بیڈھب اس پاس ایک شب تھے گئے
سو کئی دن سرک رہے ہیں ہم

خام دستی نے ہائے داغ کیا
پوچھتے کیا ہو پک رہے ہیں ہم

میر شاید لیں اس کی زلف سے کام
برسوں سے تو لٹک رہے ہیں ہم

ہے تہِ دل بتوں کا کیا معلوم
نکلے پردے سے کیا خدا معلوم

لہ رنگ سے بھی جدا تو ہو وے ہاں اب جا ہر رنگ میں شامل ہو یہاں (میر)

جوں نرگس ہیں کی جگر کاوی بہت — کیا نکلتا ہی کسو کا نام سہل
جان دی یار دنے تب آنکھیں لگیں — کن نے پایا آہ یہاں آرام سہل
مدعی ہو چشمِ شوخِ یار کا — کیا نگاہوں میں ہوا بادام سہل

تم نے دیکھا ہوگا بچپن میر کا
ہم کو تو آیا نظر وہ غام سہل

پوشیدہ کیا رہے ہی قدرت نمائے دل — دیکھی نہ بے ستون میں زور آزمائے دل
ہی تیرہ یہ بیاباں گرد و غبار سے سب — وے راہ کب دکھائی بے رہنمائے دل
اندوہ غم سے اکثر رہتا ہوں میں مکدر — کیا خاک میں ملی ہی میری صفائے دل
پیش آوے کوئی صورت منہ موڑتے نہیں ہے — آئینہ ساں جنھیں ہی کچھ آشنائے دل
مر تو نہیں گیا میں پر جی ہی جانتا ہی — گزرے ہی شاق مجھ پر جیسی جدائے دل
اس دام گہ میں اُس کی سارے فریب ہی ہیں — آتی نہیں نظر کچھ مجھ کو رہائے دل

گر رنگ ہی چلا ہی، رو بھی تو ہوا ہے
کہہ میر اس چمن میں کس سے لگائیے دل

مدت تو وا ہوا ہی نہیں غنچہ وار دل — اب جو کھلا سو جیسے گل بے بہار دل
ہی غم میں یاد کس کو فراموش کار دل — اب آ بنی ہی جی پہ رہا درکنار دل
دشوار ہی ثبات بہت ہجر یار میں — یہاں چاہیے ہی دل سو کہاں میرے یار دل
وہ کونسی امید بر آئی ہی عشق میں — رہتا ہی کس امید پہ امیدوار دل
ظالم بہت ضرور ہی اُن بیکسوں کا پاس — ناچار اپنے رہتے ہیں جو مار مار دل
تم پر تو صاف میری کدورت کھلی ہی آج — مدت سے ہی ملال کے زیرِ غبار دل
مائل ادھر کے ہونے میں مجبور ہیں سبھی — کھنچتا ہی اُس کی اور کو بے اختیار دل
حد ہیگی دلبری کی بھی ای غیرتِ چمن — ہو آدمی صنوبر اگر لاوے بار دل
داخل یہ اضطراب تنک آبیوں میں ہی — رکھتی نہیں ہی برق ہی کچھ بے قرار دل
کیا گرسنہ ہیں چشمِ دل اب کے یہ دلبراں — تسکین اُن کی ہو نہ جو لیویں ہزار دل
جوں سیب ہیں ذقن کے چمن زار حسن میں — یوں باغِ حسن میں بھی ہیں رنگیں انار دل
ہم سے جو عشق کشتہ جئیں تو عجب ہے میر — چھاتی ہی داغ، ٹکڑے جگر کے فگار دل

کیا کھولے ہوئے محمل یہاں گرم حکایت ہی
چل راہ میں کچھ کہنا مانند جرس ظالم

مطلق نہیں گنجایش اب حوصلے میں اپنے
آزار کوئی کھینچے یوں کب تئیں بس ظالم

سر رشتۂ ہستی کو ہم دے چکے ہاتھوں سے
کچھ ٹوٹے ہی جاتے ہیں اب تارِ نفس ظالم

تا چند رہے گا تو یوں داغ غم اس مہ کا
چھاتی تو گئی تیری ای میر جھلس ظالم

محرم سے کسو روبرو ہوں کاشکے اب ہم
بے وجہ غضب رہنے کا پوچھیں جو سبب ہم

تدبیریں کریں اپنے تنِ زار و زبوں کی
افراط سے اندوہ کے ہوں آپ میں جب ہم

تو لاگو نہ ہو جی کا تو ناچار ہیں ورنہ
اس جنسِ گراں مایہ سے گزرے نہیں کب ہم

یک سلسلہ ہی قیس کا فرہاد کا اپنا
جوں حلقۂ زنجیر گرفتار ہیں سب ہم

کس دن نہ ملا غیر سے تو گرم علی الرغم
رہتے ہیں یوں ہی لوٹتے انگاروں پہ شب ہم

مجمع میں قیامت کے اک آشوب سا ہوگا
آ نکلے اگر عرصے میں یوں نالہ بلب ہم

کیا معرفت اس سے ہوئی یاروں کو نہ سمجھے
اب تک تو نہیں پاتے ہیں کچھ یار کے ڈھب ہم

گہ نوچ لیا منہ کو گہے کوٹ لی چھاتی
دل تنگی ہجراں سے ہیں مغلوب غضب ہم

آغازِ محبت میں تمامی ہوئی اپنی
ای وای ہوئے خاک بسر راہ طلب ہم

تربت[۱] سے ہماری نہ اٹھی گرد بھی ای میر
جی سے گئے لیکن نہ کیا ترک ادب ہم

مشتاق ان لبوں کے ہیں سب مرد و زن تمام
دفتر لکھے گئے نہ ہوا پر سخن تمام

اب چھیڑیے جہاں وہیں گویا ہی درد سب
پھوڑا سا ہو گیا ہی ترے غم میں تن تمام

آیا تھا گرم صید وہ جیدھر سے دشت میں
دیکھا ادھر ہی گرتے ہیں اب تک ہرن تمام

آوارہ گرد باد سے تھے ہم پہ شہر میں
کیا خاک میں ملا ہی یہ دیوانہ پن تمام

کیا لطف تن چھپا ہی مرے تنگ پوش کا
اگلا پڑے ہی جامے سے اس کا بدن تمام

اس کارِ دست بستہ پہ ریجھا نہ مدعی
کیونکر نہ کام اپنا کرے کوہکن تمام

اک گل زمیں نہ وقفے کے قابل نظر پڑی
دیکھا برنگِ آبِ رواں یہ چمن تمام

۱ میر تقی میر سے ۔ وہ بیٹھا غبارِ میر اس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

یہی جانا کہ کچھ نہ جانا ہائے
سو بھی اک عمر میں ہوا معلوم

علم سب کو ہے یہ کہ سب تو ہے
پھر ہے اللہ کیسا نا معلوم

گرچہ تو ہی ہے سب جگہ لیکن
ہم کو تیری نہیں ہے جا معلوم

عشق جانا تھا مار رکھے گا
ابتدا میں تھی انتہا معلوم

ان سیہ چشم دلبروں سے ہمیں
تھی وفا چشم سو وفا معلوم

طرز کینے کی کوئی چھپتی ہے
مدعی کا ہے مدعا معلوم

عشق ہے اے طبیب جی کا روگ
لطف کر ہے جو کچھ دوا معلوم

دل بجا ہو تو میر کچھ کھاوے
کڑھنے پچنے میں اشتہا معلوم

مجھے تو درد سے اک انس ہے وفا کی قسم
یہی سبب ہے جو کھائی ہے میں دوا کی قسم

کل اُن نے تیغ رکھی درمیاں کہ قطع ہے اب
قسم جو بیچ میں آئی سو اُس ادا کی قسم

حنا لگی ترے ہاتھوں سے ہیں گیا پیسا
جگر تمام ہے خوں مجھ کو تیرے پا کی قسم

فقیر ہونے نے سب اعتبار کھویا ہے
قسم جو کھاؤں تو کہتے ہیں کیا گدا کی قسم

قدم تلے ہی رہا اُس کے یہ سر پر شور
جو کھائیے تو مرے طالع رسا کی قسم

سروں پہ ہاتھ کبھو تیغ پر کبھو اُس کا
کچھ ایک قسم نہیں میر آشنا کی قسم

جدال دیر کے رہباں سُنے کہاں تک میر
اٹھو حرم کو چلو اب تمھیں خدا کی قسم

اب سوکھی ہی جاتی ہے سب کشت ہوس ظالم
اے ابر ترا آکر ٹک ایدھر بھی برس ظالم

صیاد بہار اب کی سب لوٹوں گا کیا میں ہی
ٹک باغ تلک لے چل میرا بھی قفس ظالم

کس طور کوئی تجھ سے مقصود کرے حاصل
نے رحم ترے جی میں نے دل میں ترس ظالم

کیوں[۵۱] سر چڑھے ہے ناحق ہم بخت سیاہوں کے
مت پیچ میں پگڑی کے بالوں کو کھرس ظالم

جوں ابر میں روتا تھا جوں برق تو ہنستا تھا
صحبت نہ رہی یوں ہی ایک آدھ برس ظالم

---

۵۱ میر صاحب کے کئی شعر اس قسم کے گزر چکے ہیں۔ منجملہ اُن کے ایک یہ شعر ہے ؎

اک جمع کے سر اوپر روز سیاہ لایا
پگڑی میں بال اپنے نکلا جو وہ کھرس کر

جب میسر ہو بوسہ اُس لب کا
چپکے ہی ہو رہو نہ بولو تم

پنجہ مرجاں کا پھر دھرا ہی رہے
ہاتھ خوں میں مرے ڈبو لو تم

دست دے ہو کے پلک سے میل
دل جہاں پاؤ اب پرو لو تم

آتے ہیں متصل چلے آنسو
آہ کب تک یہ موتی رو لو تم

رات گزری ہے سب تڑپتے میر
آنکھ لگ جائے ٹک تو سو لو تم

ہوئے جاتے تھے فرطِ الفت سے ہم
بچے ہیں خدا ہی کی قدرت سے ہم

ترش رو بہت ہے وہ زرگر پسر
پڑے ہیں کٹھائی میں مدت سے ہم

نہیں دیکھتے صبح اب آرسی
خفا رہتے ہیں اپنی صورت سے ہم

جو دیکھو وہ قامت تو معلوم ہو
کہ روکش ہوئے ہیں قیامت سے ہم

نہ ٹک لا سکا تاب جلوے کی دل
گلہ رکھتے ہیں صبر و طاقت سے ہم

نہ مانی کوئی اُن نے پھر روٹھ کر
مناتے رہے رات منت سے ہم

خدا سے بھی شب کو دعا مانگتے
نہ اُس کا لیا نام غیرت سے ہم

رکھا جس کو آنکھوں میں اک عمر اب
اُسے دیکھ رہتے ہیں حسرت سے ہم

بھریں آنکھیں لوہو سے رہنے لگیں
یہ رنگ اپنا دیکھا مروت سے ہم

نہ مل میر اب کے امیروں سے تو
ہوئے ہیں فقیر ان کی دولت سے ہم

کب تک رہیں گے پہلو لگائے زمیں سے ہم
یہ درد اب کہیں گے کسو شانہ بیں سے ہم

تلواریں کتنی کھائی ہیں سجدہ میں اس طرح
فریادی ہوں گے دل کے لہو کو جبیں سے ہم

فتراک تک یہ سر جو نہ پہنچا تو یا نصیب
مدت لگے رہے ترے دامانِ زیں سے ہم

ہوتا ہے شوق وصل کا انکار سے زیاد
کب تجھ سے دل اٹھاتے ہیں تیری نہیں سے ہم

چھاجے جو پشید ستی کرے نور ماہ پر
دیکھی عجب سفید تری آستیں سے ہم

یہ شوق صید ہونے کا دیکھو کہ آپ کو
دکھلایا صید گہ میں لیا رد ۔ یمیں سے ہم

تکلیف درد دل کی نکر تنگ ہوگئے لوگ
یہ بات روز کہتے رہے ہمنشیں سے ہم

اڑتی ہے خاک شہر کی گلیوں میں اب جہاں
سونا لیا ہے گود میں بھر کر وہیں سے ہم

نکلے ہیں[1] گل کے رنگ گلستاں میں خاک سے
یہ وے ہیں اس کے عشق کے خونیں کفن تمام

تہ صاحبوں کی آئی نکل سیکڑے گئے
گردی تھے اہلِ صومعہ کے پیرہن تمام

میں خاک میں ملا نہ کروں کس طرح سفر
مجھ سے غبار رکھتے ہیں اہلِ وطن تمام

کچھ ہند ہی میں میر نہیں لوگ جیب چاک
ہے میرے ریختوں کا دِوانہ دکن تمام

بختِ سیہ کی نقل کریں کس سے چال ہم
مہندی لگی قدم سے ہوئے پائمال ہم

کیونکر نہ اس چمن میں ہوں اتنے نڈھال ہم
یہاں پھول سونگھ سونگھ رہے ماہ و سال ہم

یا ہر گلی میں سیکڑوں جس جا ملیح سے تھے
یا زلف و خط کو دیکھتے ہیں خال خال ہم

گزرے ہے جی میں گہ وہ دہن گاہ وہ کمر
کیا جانیں لوگ رکھتے ہیں کیا کیا خیال ہم

جاتی نہیں اُٹھائی یہ اب سرگرانیاں
مقدور تک تو اپنے گئے ٹال ٹال ہم

لوہو کہاں ہے گریۂ خونیں سے تن کے بیچ
کرتے ہیں منہ کو اپنے طمانچوں سے لال ہم

وہ تو ہی ہے کہ مرتے ہیں سب تیرے طور پر
حور و پری کو جان کے کب ہیں ذوال ہم

گزرے ہے بسکہ اُس کی جدائی دلوں پہ شاق
منہ نوچ نوچ لے ہیں علی الاتصال ہم

منظور سجدہ ہے ہمیں اُس آفتاب کا
ظاہر میں یوں کریں ہیں نمازِ زوال ہم

ظاہر ہوا تمھیں بھی ہمارے دم اور ہوش
آئے نہ پھر تمھارے گئے ٹک بحال ہم

مطلق جہاں میں رہنے کو جی چاہتا نہیں
اب تم بغیر اتنے ہوئے ہیں وبال ہم

نقصان ہوگا اُس میں نہ ظاہر کہاں تلک
ہوویں گے جنس زمانے کے صاحب کمال ہم

تھا کب گماں ملے گا وہ دامن سوار میر
کل راہ جاتے مفت ہوئے پائمال ہم

کون کہتا ہے منہ کو کھولو تم
کاشکے پردے ہی میں بولو تم

حکم آبِ رواں رکھے ہے حسن
بہتے دریا میں ہاتھ دھو لو تم

کیا سرا ہیں ہم اپنی جنس کو لیک
دل عجب ہے متاع جو لو تم

جاتا آیا ہے اب جہاں سے ہیں
تھوڑی تو دور ساتھ ہو لو تم

[1] نظیر اکبرآبادی سے: بن تختۂ گُل آخرش اس خاک چمن سے ؛ نکلا مرے قاتل کے شہیدوں کا رسالا

کوئی بجلی کا ٹکڑا اب تلک بھی   پڑا ہوگا ہمارے آشیاں میں

پھرے ہی چھانتا ہی خاک ای میر
ہوس کیا ہی مزاجِ آسماں میں

نہیں بتخال لعلِ دلربا میں   گہر پہنچا بہم آبِ بقا میں
غریبانہ کوئی شب روز کر یہاں   ہمیشہ کون رہتا ہی سرا میں
اُٹھاتے ہاتھ کیوں نومید ہوکر   اگر پاتے اثر کچھ ہم دعا میں
کہے ہی ہر کوئی اللہ میرا   عجب نسبت ہی بندے میں خدا میں
کفن میں ہی نہ پہنا وہ بدن دیکھ   کھنچے لوہو میں بہتیرے کے جامیں[1]
ادھر جانے کو آندھی تو ہی لیکن   سبکپائی سی ہی بادِ صبا میں
بلا تہ دار بحرِ عشق نکلا   نہ ہم نے انتہا لی[2] ابتدا میں
ملے برسوں وہی بیگانہ ہی وہ   ہنر ہی یہ ہمارے آشنا میں

اگرچہ خشک ہیں جیسے پرِ کاہ
اڑے ہیں میر جی لیکن ہوا میں

مر مر گئے نظر کر اُس کے برہنہ تن میں   کپڑے اُتارے اُن نے جب پہنچے ہم کفن میں
گل پھول سے کب اُس بن لگتی ہیں اپنی آنکھیں   لائی بہار ہم کو زور آوری چمن میں
اب لعل تو خط اُس کے کم بخشتے ہیں فرصت   قوت کہاں رہی ہی یاقوتِ کہن میں
یوسف عزیز دلہا جا مصر میں ہوا تھا   پاکیزہ گوہروں کی عزت نہیں وطن میں
دیر و حرم سے تو تو ٹک گرم ناز نکلا   ہنگامہ ہو رہا ہی اب شیخ و برہمن میں

[1] جامہ کی جمع جامیں میر کے زمانے میں درست تھی اب جامے بولی جاتی ہی اور اس طرح اس کا صرف قافیہ میں درست نہیں۔ میر حسن کے یہاں بھی ایک شعر مثنوی میں ایسے ہی انداز سے قافیے کو استعمال کیا ہی ؎

لئے بیلچے ہاتھ میں مالنیں   لگیں باغ کو دیکھنے بھالنیں

[2] انتہا نہ لی۔ یعنی تھاہ نہ لی۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہی کہ انتہا لینے سے بگڑ کر تھاہ لینا بنا ہی میر کے یہاں اور جگہ بھی اس محاورے کا اسی طرح استعمال ہوا ہی۔ ۱۲ آسی

آوارہ گردی اپنی کھینچی میر طول پر
اب چاہیں گے دعا کسو عزلت نشیں سے ہم

ردیف نون

مدعی مجھ کو کھڑے صاف برا کہتے ہیں
چپکے تم سنتے ہو بیٹھے اسے کیا کہتے ہیں

دیکھے خوباں کے بجا دل نہیں رہتا ہرگز
لوگ جو کچھ انھیں کہتے ہیں بجا کہتے ہیں

عشق کے شہر کی بھی رسم کے ہیں کشتے ہم
درد جاں کاہ جو ہو اس کو دوا کہتے ہیں

جی اگر زلفوں کے سودے میں ترے دل تو نہ بول
پہلی قیمت کے تئیں مشک بہا کہتے ہیں

حسن تو ہی ہی کرو لطف زباں بھی پیدا
میر کو دیکھو کہ سب لوگ بھلا کہتے ہیں

کیا کیا جہاں اثر تھا سو اب وہاں عیاں نہیں
جن کے نشاں تھے فیلوں پر اُن کا نشاں نہیں

دفتر بنی کہانی بنی مثنوی ہوئی
کیا شرح سوزِ عشق کروں میں زباں نہیں

اپنا ہی ہاتھ سر پہ رہا اپنے ہاں سدا
مشفق کوئی نہیں ہے کوئی مہرباں نہیں

ہنگامۂ فساد کی باعث ہے وہ کمر
پھر آپ خوب دیکھیے تو درمیاں نہیں

جی ہی نکل گیا جو گیا یار پاس سے
جسم ضعیف و زار میں اب میرے جاں نہیں

ہے عشق ہی سے چار طرف بحث و گفتگو
شور اُس بلائے جاں کا جہاں میں کہاں نہیں

اس عہد کو نہ جانیے اگلا سا عہد میر
وہ دَور اب نہیں وہ زمین آسماں نہیں

نہ نکلا دوسرا ویسا جہاں میں
وہی اک جنس ہے اس کارواں میں

کیا منہ بند سب کا بات کہتے
ملا کچھ سحر ہے اُس کی زباں میں

اگر وہ بت نہ جانے تو نہ جانے
ہمیں سب جانتے ہیں ہندوستاں میں

نیا آناً فآناً اُس کو دیکھا
جدا تھی شان اُس کی ہر زماں میں

کھنچی رہتی ہے اُس ابروے خم سے
کوئی کیا شاخ نکلی ہے کماں میں

جبیں پر چین رہتی ہے ہمیشہ
بلا کینہ ہے اپنے مہرباں میں

نیا ہے کیا شگوفہ یہ کہ اکثر
رہا ہے پھول پڑتا گلستاں میں

داغ ہوں کیونکر نہ میں درویش یار و جیب بے تب
بوریا پوشوں ہی میں وہ شعلہ خو پاتا ہوں میں

ہجر میں اُس طفلِ بازی گوش کے رہتا ہوں جب
جا کے لڑکوں میں ٹکا اپنے دل کو بہلاتا ہوں میں

ہوں گرسنہ چشم میں دیدار خوباں کا بہت
دیکھنے پر آن کے تلواریں کھڑا کھاتا ہوں میں

آب سب ہوتا ہوں پاکر آپ کو جیسے حباب
یعنی اس ننگِ عدم ہستی سے شرماتا ہوں میں

ایک جاگہ کب ٹھہرنے دے ہے مجھ کو روزگار
کیوں تم اکتاتے ہو اتنا آجکل جاتا ہوں میں

ہے کمالِ عشق پر بے طاقتی دل کی دلیل
جلوۂ دیدار کی اب تاب کب لاتا ہوں میں

آسماں معلوم ہوتا ہے ورے[۱] کچھ آگیا
دور اس سے آہ کیسا کیسا گھبراتا ہوں میں

بس چلے تو راہ اُدھر کی میں نہ جاؤں لیک میر
دل مرا رہتا نہیں ہر چند سمجھاتا ہوں میں

مدت ہوئی کہ بیچ میں پیغام بھی نہیں
نامے کا اُس کے منہ سے اب نام بھی نہیں

ایام ہجر کریے بسر کس امید پر
ملنا انھوں کا صبح نہیں شام بھی نہیں

پروا اُسے ہو کاہے کو ناکام گر مروں
اُس کام جاں کو مجھ سے تو کچھ کام بھی نہیں

رو دیں اس اضطراب دلی کو کہاں تلک
دن رات ہم کو ایک دم آرام بھی نہیں

کیا جانوں دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر میر کے
کچھ طرز ایسے بھی نہیں ایہام بھی نہیں

دم بدم اس ڈھب سے رونا دیر کر آیا ہمیں
کیا لہو اپنا پیا تب یہ ہنر آیا ہمیں

گرچہ عالم جلوہ گاہِ یار یوں بھی تھا ولے
آنکھیں جوں موندیں عجب عالم نظر آیا ہمیں

ہم بھی سمجھے تھے اب اُس سادگی پر حرف ہے
خط نکلنے سے جو نامہ پیشتر آیا ہمیں

پاس آنا یک طرف مطلق نہیں اب اس کے پاس
کچھ گئے گزرے سے سمجھا وہ پسر آیا ہمیں

تجھ تک اس بیطاقتی میں کیا پہنچنا سہل تھا
غش ترے کوچے میں ہر ہر گام پر آیا ہمیں

صبح نکلا تھا پسر تلوار جوں خورشید لے
بسر دیکھکر خونخوار سج اس کی نظر آیا ہمیں

کر چلا بیخود غمِ زلفِ دراز دلبراں
دور کا اے میر درپیش اب سفر آیا ہمیں

اشک کے جوش سے ہوں شام و سحر پانی میں
جیسے ماہی ہے مجھے سیر و سفر پانی میں

شب نہاتا تھا جو وہ رشکِ قمر پانی میں
گتھی مہتاب سے اٹھتی تھی لہر پانی میں

[۱] ورے بمعنی قریب نزدیک - ادھر ۱۲

آجاتے تھے ہیں تو جیسے کہ آندھی آئی — کیا وحشتیں اُٹھائیں ہم نے دوانے پن میں

ہیں گھاؤ دل پر اپنے تیغ زباں سے سب کی
تب درد ہی ہمارے ای میر ہر سخن میں

کن نے لمبے بال دکھلائے ترے مانی کے تئیں — اُن نے جو اس طول سے کھینچا پریشانی کے تئیں

کشتۂ انداز کس کا تھا نہ جانا وہ جواں — لے رہے تھے کچھ ملک اک نعش قربانی کے تئیں

چشمِ کم سے اشکِ خونیں کو نہ دیکھو زینہار — ڈھونڈتے ہیں مردم اس یاقوتِ سیلانی کے تئیں

طائرانِ خوش معاش اس باغ کے ہم تھے کبھو — اب ترستے ہیں قفس میں اک پرافشانی کے تئیں

ہی جہانِ تنگ سے جانا بعینہ اس طرح — قتل کرنے لے چلیں ہیں جیسے زندانی کے تئیں

یہ کہاں بنت العنب سے اُٹھتی ہیں کیفیتیں — ہو نہ ٹھو سے کیا اُس کی نسبت ایسی مستانی کے تئیں

دل جو پانی ہو تو آئینہ ہی روئے یار کا — خانہ آبادی سمجھ اس خانہ ویرانی کے تئیں

فہم میں میرے نہ آیا پردہ در ہی طفلِ اشک — روؤں کیا ای ہمنشیں میں اپنی نادانی کے تئیں

کچھ نظر میں نے نہ کی جی کے زیاں پر اپنی ہائے — دوست میں رکھے گیا اس دشمنِ جانی کے تئیں

جب جلی چھاتی بہت تب اشک افشاں ہو نہ میر
کیا جو چھڑکا اس دہکتی آگ پر پانی کے تئیں

جانا ادھر سے میرے ہی ویسا اُدھر کے تئیں — بیماریوں میں جیسے بدلتے ہیں گھر کے تئیں

کب ناخنوں سے چہرہ بچے اس صفا سے ہوں — رجھواڑ تم نہیں ہو جو دیکھو ہنر کے تئیں

خستے کو اس نگہ کے طبیبوں سے کام کیا — ہمدم بہم مجھے دکھا کسو صاحب نظر کے تئیں

فردوس ہو نصیب پدر آدمی تھا خوب — دل کو دیا نہ اُن نے کسو خوش پسر کے تئیں

ٹک دل کی بے قراری میں جاتے ہیں جی چلے — ہر دم تپش سراہئے میرے جگر کے تئیں

تم دل سے جو گئے سو خرابی بہت رہی — پھر بھی بساؤ آ کر اس اُجڑے نگر کے تئیں

اللہ ری نازکی نہیں آتی خیال میں — کس کس طرح سے باندھتے ہیں اس کمر کے تئیں

حالت یہ ہی کہ بیخبری دم بدم ہی یہاں — دے اب تلک بھی تکتے نہیں ٹک خبر کے تئیں

مدت ہوئی کہ اپنی خبر کچھ ہمیں نہیں
کیا جانئے کہ میر گئے ہم کدھر کے تئیں

لکھوں اوّل بخود تو دیر میں آتا ہوں میں — پھر جو یاد آتا ہی وہ چپکا سا رہ جاتا ہوں میں

سنبھالے سدھ کہاں سر ہی فرو لاتا نہیں ہرگز — وگرنہ مان جاتا تھا کہاں تھوڑی سی منت میں

گئے دن متصل جانیکے اُسکی اور اُٹھ اُٹھ کر — تفاوت ہو گیا اب تو بہت پاؤں کی طاقت میں

تحمل ہو سکا جب تک بدن میں تاب و طاقت تھی — قیامت اب گزر جاتی ہے جی پر ایک ساعت میں

عجب کیا ہے جو یارانِ چمن کو ہم نہ پہچانیں — رہائی اتفاق اپنی پڑی ہے ایک مدت میں

سلاتا تیغ خوں میں گر نہ میرے تو قیامت تھی — اُٹھا تھا روز محشر کا جو فتنہ رات صحبت میں

کوئی عمامہ لے بھاگا کنھوں نے پیرہن پھاڑا — بہت گستاخیاں یاروں نے کیں واعظ کی خدمت میں

ملا تیوری چڑھائے تو لگا ابرو بھی خم کرنے — مؤثر کچھ ہوا سر مارنا محراب طاعت میں

قدم پر رکھ قدم اُس کے بہت مشکل ہے مر جانا
سر آمد ہو گیا ہے میرؔ فن درد الفت میں

کس کنے جاؤں الٰہی کیا دوا پیدا کروں — دل تو کچھ بھسکا ہی جاتا ہے کروں سو کیا کروں

لوہو روتا ہوں میں ہر اک حرف خط پر بہہ داں — اور اب رنگین جیسا تم کہو انشا کروں

چال اپنی چھوڑتا ہرگز نہیں وہ خوش خرام — شور ہے کب تک قیامت ایک میں برپا کروں

مصلحت ہے میری خاموشی ہی میں اے ہمنفس — لوہو ٹپکے بات سے جو ہونٹھ اپنے وا کروں

دل پریشانی مجھے دے ہے بکھیرے گل کے رنگ — آپ کو جوں غنچہ کیونکر آہ میں یکجا کروں

ایک چشمک ہی چلی جاتی ہے گل کی میری اُور — یعنی بازاریوں میں جاؤں کچھ سودا کروں

خوار تو آخر کیا ہے گلیوں میں تو نے مجھے — تو بھی اے عشق جو تجھ کو بھی میں رسوا کروں

خاک اُڑاتا اشک افشاں آن نکلوں میں تو پھر — دشت کو دریا کروں بستی کے تئیں صحرا کروں

کعبے جانے سے نہیں کچھ شیخ مجھ کو اتنا شوق — چال وہ بتلا کہ میں دل میں کسو کے جا کروں

اب کی ہمت صرف کر جو اس سے جی اچٹے مرا
پھر دعا اے میرؔ مت کریو اگر ایسا کروں

کیا کوفتیں اُٹھائیں ہجراں کے درد و غم میں — تڑپا ہزار نوبت دل ایک ایک دم میں

گو قیس منہ کو نوچے فرہاد سر کو چیرے — یہ کیا عجب ہے ایسے ہوتے ہیں لوگ ہم میں

اہل نظر کسو کو ہوتی ہے محرمیت — آنکھوں کے اندھے ہم تو مدت رہے حرم میں

کلفت میں گزری ساری مدت تو زندگی کی — آسودگی کا منہ اب دیکھیں گے ہم عدم میں

کرتے ہیں میرؔ مل کر واعظ سے حبس دم کا — کیا یہ بھی آ گئے ہیں اس پوچ گو کے دم میں

ساتھ اس حسن کے دیتا تھا دکھائی وہ بدن
جیسے جھمکے ہے پڑا گوہرِ تر پانی میں

رونے سے بھی نہ ہوا سبز درختِ خواہش
گرچہ مرجاں کی طرح تھا یہ شجر پانی میں

موج گریہ کی وہ شمشیر ہے جس کے ڈر سے
جوں کشف خصم چھپا زیرِ سپر پانی میں

بیٹھنے سے کسو دل صاف کے سر مت تو چڑھے
خوب سا کر لے تامل تو اُتر پانی میں

آتشِ عشق نے راون کو جلا کر مارا
گرچہ لنکا سا تھا اس دیو کا گھر پانی میں

جوششِ اشک میں شب دل بھی گیا سینے سے
کچھ نہ معلوم ہوا ہائے اثر پانی میں

بردباری ہی میں کچھ قدر ہے گو جی ہو فنا
عود پھر لکڑی ہے ڈوبے نہ اگر پانی میں

چشم تر ہی میں رہے کاش وہ رُوئے خوش رنگ
پھول رہتا ہے بہت تازہ و تر پانی میں

روؤں تو آتشِ دل شمع نمط بجھتی نہیں
مجھ کو لیجا کے ڈبو دیویں مگر پانی میں

گریۂ زار میں بیتابیِ دل طرفہ نہیں
سیکڑوں کرتے ہیں پیراک ہنر پانی میں

برگِ گل جوں گزر آب سے آتے ہیں چلے
رونے سے ووں ہی مرے لختِ جگر پانی میں

محو کر آپ کو یوں ہستی میں اُس کی جیسے
بوند پانی کی نہیں آتی نظر پانی میں

وہ گہر آنکھ سے جاوے تو تھمے آنسو میر
اتنا رویا ہوں کہ ہوں تا بہ کمر پانی میں

جوششِ اشک سے ہوں آٹھ پہر پانی میں
گرچہ ہوتے ہیں بہت خوف و خطر پانی میں

ضبط گریہ نے جلایا ہے درونہ سارا
دل اچنبھا ہے کہ ہے سوختہ تر پانی میں

آبِ شمشیرِ قیامت ہے برندہ اس کی
یہ گوارائی نہیں پاتے ہیں ہر پانی میں

طبع دریا جو ہو آشفتہ تو پھر طوفاں ہے
آہ بالوں کو پراگندہ نہ کر پانی میں

غرق آب اشک سے ہوں لیک اُڑا جاتا ہوں
جوں سمک گو کہ مرے ڈوبے ہیں پر پانی میں

مردم دیدۂ تر مردم آبی ہیں ـ مگر
رہتے ہیں روز و شب و شام و سحر پانی میں

ہیئت آنکھوں کی نہیں وہ رہی روتے روتے
اب تو گرداب سے آتے ہیں نظر پانی میں

گریۂ شب سے بہت آنکھ ڈرے ہے میری
پاؤں رکتے ہی نہیں بارِ دگر پانی میں

فرطِ گریہ سے ہوا میر تباہ اپنا جہاز
تختہ پارے گئے کیا جانوں کدھر پانی میں

رکھا کر اشک افشاں چشم فرصت عیر فرصت میں
کہ مل جاتا ہے ان جوؤں کا پانی بحرِ رحمت میں

میں تو خوباں کو جانتا ہی ہوں | پر مجھے یہ بھی خوب جانتے ہیں
جا ہیں اُس گلی میں گِر رہنا | ضعف و بے طاقتی بہانے ہیں
پوچھ اہلِ طرب سے شوق اپنا | وے ہی جانے جو خاک چھانے ہیں
اب تو افسردگی ہی ہے ہر آن | وے نہ ہم ہیں نہ وے زمانے ہیں
قیس و فرہاد کے وہ عشق کے شور | اب مرے عہد میں فسانے ہیں
دل پریشاں ہوں میں تو خوش وے لوگ | عشق میں جن کے جی ٹھکانے ہیں
مشک و سنبل کہاں وہ زلف کہاں | شاعروں کے یہ شاخسانے ہیں

عشق کرتے ہیں اُس پری رو سے
میر صاحب بھی کیا دوانے ہیں

آپ اُس جنس کے ہیں ہم بھی خریداروں میں | پگڑی جامے بکے جس کے لئے بازاروں میں
باغِ فردوس کا ہے رشک وہ کوچہ لیکن | آدمی ایک نہیں اُس کے ہوا داروں میں
ایک کے بھی وہ بُرے حال میں آیا نہ کبھو | لوگ اچھے تھے بہت یار کے بیماروں میں
دوستی کس سے ہوئی آنکھ کہاں جا کے لڑی | دشمنی آئے جسے دیکھتے ہی یاروں میں
ہائے رے ہاتھ جہاں چوٹ پڑی دو ہی کیا | الغرض ایک ہی وہ شوخ ستمگاروں میں
کشمکش جس کے لئے یہ ہے شمار دم یہ | اُن نے ہم کو نہ گنا اپنے گرفتاروں میں
کیسی کیسی ہے عناصر میں بھی صورت بازی | شعبدے لاکھوں طرح کے ہیں انھیں چاروں میں
مشفقو! ہاتھ مرے باندھو کہ ابکی ہر دم | جا الجھتے ہیں گریبان کے دو تاروں میں
حسبِ قسمت سبھوں نے کھائے ترے تیغ کے زخم | ناکس اک نکلے ہمیں خوں کے سزا واروں میں

اضطراب و قلق و ضعف ہیں گر میر یہی
زندگی ہو چکی تو اپنی ان آزاروں میں

اُمیدِ دل دہی تھی جن سے وے آزار کرتے ہیں[1] | بہت پرہیز کر ہم سے ہمیں بیمار کرتے ہیں
کوئی ہم سا بھی اپنی جان کا دشمن کہیں ہوگا | بھری مجلس میں بیٹھے عشق کا اقرار کرتے ہیں
نشاں دیں ہیں جہاں اس کا وہ ہرجائی نہیں ملتا | محلے کے ہمیں اب لوگ یوں ہی خوار کرتے ہیں

[1] آزار کرنا۔ یعنی ستانا۔ اب متروک ہے اور اس کی بجائے آزار دینا یا آزار پہنچانا بولتے ہیں۔ ــ آسی

عشق میں جی کو صبر و تاب کہاں
اس سے آنکھیں لگیں تو خواب کہاں

بیکلی دل ہی کی تماشا تھی
برق میں ایسے اضطراب کہاں

خط کے آئے پہ کچھ کہے تو کہے
ابھی مکتوب کا جواب کہاں

ہستی اپنی ہے بیچ میں پردا
ہم نہ ہو ویں تو پھر حجاب کہاں

گریۂ شب سے سرخ ہیں آنکھیں
مجھ بلانوش کو شراب کہاں

عشق ہے عاشقوں کے جلنے کو
یہ جہنم میں ہے عذاب کہاں

داغ رہنا دل و جگر کا دیکھ
جلتے ہیں اس طرح کباب کہاں

محو ہیں اس کتابی چہرے کے
عاشقوں کو سر کتاب کہاں

عشق کا گھر ہے میر سے آباد
ایسے پھر خانماں خراب کہاں

یارب مجھے معاف رکھو میں نشے میں ہوں
اب دو تو جام خالی ہی دو میں نشے میں ہوں

ایک ایک قرط دور میں یوں ہی مجھے بھی دو
جام شراب پُر نہ کرو میں نشے میں ہوں

مستی سے درہمی ہے مری گفتگو کے بیچ
جو چاہو تم بھی مجھ کو کہو میں نشے میں ہوں

یا ہاتھوں ہاتھ لو مجھے مانند جام مے
یا تھوڑی دور ساتھ چلو میں نشے میں ہوں

معذور ہوں جو پاؤں مرا بے طرح پڑے
تم سرگراں تو مجھ سے نہ ہو میں نشے میں ہوں

بھاگی نماز جمعہ تو جاتی نہیں ہے کچھ
چلتا ہوں میں بھی ٹک تو رہو میں نشے میں ہوں

نازک مزاج آپ قیامت ہیں میر جی
جوں شیشہ میرے منہ نہ لگو میں نشے میں ہوں

کاشکے دل دو تو ہوتے عشق میں
ایک رہتا ایک کھوتے عشق میں

پاس ظاہر ٹک نہ کرتے شب تو ہم
بھر رہے تھے خوب روتے عشق میں

خواب میں دیکھا اسی کو ایک رات
برسوں کاٹے ہم نے سوتے عشق میں

کاش پی جایا ہی کرتے اشک کو
داغ دل پر کے تو دھوتے عشق میں

دیکھیں ہیں کیا کیا ڈھلکتے اشک میر
بیٹھے موتی سے پروتے عشق میں

کرتے ہیں جو کہ جی میں ٹھانے ہیں
خوبرو کس کی بات مانے ہیں

شیوہ اپنا بے پروائی نومیدی سے ٹھہرا ہی
کچھ بھی وہ مغرور دبے تو منت ہم سو بار کریں

ہم تو فقیر ہیں خاک برابر آبیٹھے تو لطف کیا
ننگ جہاں لگتا ہو ان کو وہاں دیں الیے عار کریں

ہم[۵۱] پتا پتا گلشن کا تو حال ہمارا جانے ہے
اور کہے تو جس کے گل بے برگی اظہار کریں

کیا ان خوش ظاہر لوگوں سے ہم یہ توقع رکھتے تھے
غیر کو لیکر پاس یہ بیٹھیں ہم کو گلیوں میں خوار کریں

میر جی ہیں گے ایک جوالے کیا ہم ان سے دردیں
کچھ بھی جو سن پاویں یہ تو مجلس میں لبتار کریں

[۵۲] گر کوئی اعمی کہے کچھ پر کہاں وہ تو کہاں
لے گئے پیش فلک اس مہ کا الیسا رو کہاں

گل کو کیا نسبت ہی تجھ سے میں نہ مانوں زینہار
رنگ اگر بالفرض تیرا سا ہوا یہ بو کہاں

عشق لاتا ہی بروے کار مجنوں سا کبھو
بید بہتیرے کھڑے ہیں وے پریشاں مو کہاں

دیکھیاں کجیاں کمانوں کی بھی خم محراب کے
پر دلوں کو کھینچتے ہیں جیسے وے ابرو کہاں

سنبل آپھی آپ پیچ و تاب یوں کھایا کرے
یار کی سی زلف کے وے حلقہ حلقہ مو کہاں

آگے یہ آنکھیں گلے کی ہار ہی رہتی تھیں روز
اب جگر میں خوں نہیں دیکھے سے آنسو کہاں

میر سچ کہتا تھا جنت ہو نصیب اس کے تئیں
حور کا چہرہ کہاں اس کا رخ نیکو کہاں

بیگانہ وضع برسوں اس شہر میں رہا ہوں
بھاگوں ہوں دور سب سے میں کس کا آشنا ہوں

پوچھا کئے ہیں مجھ سے گلبرگ لب کو تیرے
بلبل کے ہاتھ جب میں گلزار میں لگا ہوں

اب کار شوق دیکھوں پہنچے مرا کہاں تک
قاصد کے پیچھے میں بھی بیطاقت اٹھ چلا ہوں

تجھ سے متاع خوش کا کیونکر نہ ہوں معرّف
یوسف کے ہاتھ پیارے کچھ میں نہیں بکا ہوں

گل پھول کوئی کب تک جھڑ جھڑ کے گرتے دیکھے
اس باغ میں بہت اب جوں غنچہ میں رکا ہوں

کیا کیا کیا تامل اس فکر میں گیا گھل
سمجھا نہ آپ کو میں کیا جانئے کہ کیا ہوں

ہوتا ہی گرم کیا تو ای آفتابِ خوبی
ایک آدھ دم میں میں تو شبنم نمط ہوا ہوں

---

[۵۱] میر تقی میر سے پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہی جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہی

[۵۲] نسخہ قدیم مطبوعہ کلکتہ میں بھی یہ شعر اسی طرح ہی اور ایک قلمی نسخے میں پہلا مصرع اس طرح ہی ۔ ع
گو کوئی اعمے کہے کچھ جو کہاں وہ تو کہاں

حجابِ ناکسی سے مر گئے روپوش کب تک ہوں
جنھوں سے عار تھی ہم کو سو ہم سے عار کرتے ہیں

چھپا لیتا ہے مجھ سے چاند سا منہ وہ خدا جانے
سخن ساز اُس کنے جا جا کے کیا اظہار کرتے ہیں

الف کی رمز اگر سمجھا اُٹھا دل بحث علمی سے
اسی اک حرف کو برسوں سے ہم تکرار کرتے ہیں

بہت ہی تیز آب جدول شمشیر خوباں کی
اُسے پھر پار کرتیں ہیں یہ جیں پیدا وار کرتے ہیں

اٹھا تو کہ یہاں فکر اقامت تجھ کو ہے ورنہ
سب اِس دلکش جگہ سے رخت اپنا بار کرتے ہیں

بلا آفت ہے کچھ دل پر کہ ایسا رنگ ہے اُن کا
کسو بے مہر کے تئیں میر شاید پیار کرتے ہیں

کرتا نہیں قصور ہمارے ہلاک میں
یارب یہ آسمان بھی مل جائے خاک میں

گرمی نہیں ہے ہم سے وہ ای رشکِ آفتاب
اب آ گیا ہے فرق بہت اس تپاک میں

اس ڈھنگ سے ہلا کہ بجا دل نہیں رہے
اس گوش کے گہر سے دم آئے ہیں ناک میں

اگلی جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

کہئے لطافت اُس تنِ نازک کی میر کیا
شاید یہ لطف ہو گا کسو جانِ پاک میں

محمل نشیں ہیں کتنے خدام یار میں یہاں
لیلیٰ کا ایک ناقہ سو کس قطار میں یہاں

سن شور گل قفس میں دل داغ سب ہوا ہے
کیا پھول گل کھلے ہیں ابکی بہار میں یہاں

کب دلکشی ہو میرے رونے میں ابر تجھ سے
دریا بھرے ہیں ایک اک دامن کے تار میں یہاں

تم تو گئے دکھا کر ٹک برق کے سے جھمکے
آیا بہت تفاوت صبر و قرار میں یہاں

ہم مر گئے ولیکن سوزِ دروں وہی ہے
ایک آگ لگ اٹھی ہے کنج مزار میں یہاں

ہجران کی گھڑی ہے سو سو برس تعب سے
روزِ شمار یارو ہے کس شمار میں یہاں

جن راتوں میر ہم کو رونے کا مشغلہ تھا
رہتا تھا بحر اعظم سو تو کنار میں یہاں

آج ہمارے گھر آیا تو کیا ہے یہاں جو نثار کریں
الا کھینچ بغل میں تجھ کو دیر تلک ہم پیار کریں

خاک ہوئے برباد ہوئے پامال ہوئے سب محو ہوئے
اور شدائد عشق کی رہ کے کیسے ہم ہموار کریں

زردی رُخ رونا ہر دم کا شاہد دو جب ایسے ہوں
چاہت کا انصاف کرو تم کیونکر ہم انکار کریں

باغ میں اب آ جاتے ہیں تو صرفہ اپنا چپ میں ہے
خوبی بیاں کر تیری ہم کیا گل کو گلے کا ہار کریں

یوں قیدیوں سے کب تئیں ہم تنگ تر رہیں
جی چاہتا ہے جا کے کسو اور مر رہیں

ای[1] کاش ہم کو سکر کی حالت رہے مدام
تا حال کی خرابی سے ہم بے خبر رہیں

رہتے ہیں یوں حواس پریشاں کہ جوں کہیں
دو تین آ کے لوٹے مسافر اتر رہیں

وعدہ تو جب ہو صبح کا تب ہم بھی جاں بلب
جیسے چراغ آخرِ شب تا سحر رہیں

آوارگی کی سب ہیں یہ خانہ خرابیاں
لوگ آویں دیکھنے کو بہت ہم جو گھر رہیں

ہم نے بھی نذر کی ہے کہ پھریے چمن کے گرد
یارب قفس کے چھوٹنے تک بال و پر رہیں

ان دلبروں کی آنکھ نہیں جائے اعتماد
جب تک رہیں یہ چاہیے پیشِ نظر رہیں

فردا[2] کی فکر آج نہیں مقتضائے عقل
کل کی بھی دیکھ لیویں گے کل ہم اگر رہیں

تیغ و تبر رکھا نہ کرو پاس میر کے
ایسا نہ ہو کہ آپ کو ضائع وے کر رہیں

دل کو لکھوں ہوں آہ وہ کیا مدعا لکھوں
دیوانے کو جو خط لکھوں بتلاؤ کیا لکھوں

کیا کیا لقب ہیں شوق کے عالم میں یار کے
کعبہ لکھوں کہ قبلہ اُسے یا خدا لکھوں

حیراں ہو میرے حال میں کہنے لگا طبیب
اس دردمندِ عشق کی میں کیا دوا لکھوں

وحشت زدوں کو نامہ لکھوں ہوش کس طرح
مجنوں کو اُس کے حاشیہ پر میں دعا لکھوں

کچھ روبرو ہوئے پہ جو سلجھے تو سلجھے میر
جی کے اُلجھنے کا اُسے کیا ماجرا لکھوں

جب ہے ہوا اس کی ابروئے خمدار درمیاں
رہتی ہے میرے خلق کے تلوار درمیاں

برپا ہوا ہجوم سے یک حشر تازہ وہاں
آیا جہاں کہیں قدمِ یار درمیاں

[1] حالتِ بیخودی و بیخبری کو غنیمت جاننے اور اُسی میں عمر گزرنے کے اور شعر بھی دیکھئے ؎
مرزا غالب دہلوی ؎ مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو ؛ اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے
ذاکا حالی پانی پتی ؎ لی ہوش میں آنے کی جو ساقی سے اجازت ؛ فرمایا خبردار کہ نازک ہے زمانہ
عمر خیام ؎ خواہم کہ بہ بے خودی بر آرم نفسی ؛ مے خوردن و مست بودنم زیں سبب است
[2] میر تقی میر کا ایک اور شعر اسی مضمون کا گزر چکا ہے ؎

فردا کا سوچ تجھ کو گیا آج ہی پڑا ہے ؛ کل کی سمجھیو کل ہی کل تو اگر رہے گا

پیری سے جھلتے جھلتے پہنچا ہوں خاک تک میں
وہ سرکشی کہاں ہے اب تو بہت دبا ہوں

مجھ کو بلا ہے وحشت اے میر دور اس سے
جاگہ سے جب اٹھا ہوں آشوب سا اٹھا ہوں

کوچے میں تیرے میر کا مطلق اثر نہیں
کیا جانیے کدھر کو گیا کچھ خبر نہیں

ہے عاشقی کے بیچ ستم دیکھنا ہی لطف
مر جانا آنکھیں موندے گئے یہ کچھ ہنر نہیں

کب شب ہوئی زمانے میں جو پھر ہوا نہ روز
کیا اے شبِ فراق تجھی کو سحر نہیں

ہر چند ہم کو مستوں سے صحبت رہے ہے لیک
دامن ہمارا ابر کی مانند تر نہیں

گلگشت اپنے طور پہ ہے سو تو خوب یاں
شائستۂ پریدن گلزار پر نہیں

کیا ہوجے حرف زن گزر دوستی سے آہ
خط لیگیا کہ راہ میں پھر نامہ بر نہیں

آنکھیں تمام خلق کی رہتی ہیں اس کی اور
مطلق کسو کو حال پہ میرے نظر نہیں

کہتے ہیں سب کہ خون ہی ہوتا ہے اشکِ چشم
راتوں کو گریہ ہی ہے بکا تو جگر نہیں

جا کر شراب خانے میں رہتا نہیں تو پھر
یہ کیا کہ میر جمعہ ہی کی رات گھر نہیں

گو جان کر تجھے سب تعبیر کر رہے ہیں
ہم لوگ تیرے اوپر سو جی سے مر رہے ہیں

کھنچتا چلا ہے اب تو تصدیق کو تصور
ہر لحظہ اس کے جلوے پیش نظر رہے ہیں

نکلے ہوس جواب بھی ہو دار ہی قفس سے
شائستۂ پریدن دو چار پر رہے ہیں

کل دیکھتے ہمارے لیتے تھے گھر برابر
اب یہ کہیں کہیں جو دیوار و در رہے ہیں

کیا آج ڈبڈبائی دیکھو ہو تم یہ آنکھیں
جوں چشمہ یوں ہی برسوں ہم چشم تر رہے ہیں

نے غم ہے ہم کو یاں کا نے فکر کچھ ہے واں کا
صدقے جنوں کے کیا ہم بے دردسر رہے ہیں

پاس ایک دن بھی اپنا ان نے نہیں کیا ہے
ہم دور اس سے بیدم دو دو پہر رہے ہیں

کیا یہ سرائے فانی ہے جاے باش اپنی
ہم یاں مسافرانہ آکر اتر رہے ہیں

ایسا نہ ہو کہ چھیڑے یکبار پھوٹ بہیے
ہم پکے پھوڑے کے اب مانند بھر رہے ہیں

اس میکدہ میں جس جا ہشیار چاہیے تھے
رحمت ہے ہم کو ہم بھی کیا بے خبر رہے ہیں

گو راہِ عشق میں ہو شمشیر کے دم اوپر
وسواس کیا ہے ہم تو جی سے گزر رہے ہیں

چل ہمنشیں بنے تو اک آدھ بیت سنیے
کہتے ہیں بعدِ مدت میر اپنے گھر رہے ہیں